فمنھم من قضی نحبہ و منھم من ینتظر

تاریخ ارکان کے درخشاں ستارے

(جلد اول)

تالیف:

محمد طاہر جمال ندوی

ناشر:

دار البحوث و المناصرۃ الاسلامیۃ

چاٹگام، بنگلادیش۔

کتاب	:	تاریخ ارکان کے درخشاں ستارے (جلد اول)۔
مؤلف	:	محمد طاہر جمال ندوی، فاضل دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ، انڈیا۔
سن تصنیف	:	۱۹۹۹ء
سن کتابت	:	نومبر/ ۲۰۲۳ء
بار اول	:	دسمبر/ ۲۰۲۳ء
بار دوم	:	١٠ / ٠٦ / ٢٠٢٦ء
تعداد	:	۱۰۰۰ (ایک ہزار)
قیمت	:	۵۰۰/ ٹاکا، بنگلہ دیشی۔ ۳۰/ ریال سعودی
کمپوز	:	محمود العالم (اندر قلعہ، چاٹگام، بنگلا دیش)
ناشر	:	دار البحوث والمناصرۃ الاسلامیۃ چاٹگام، بنگلا دیش
ملنے کے پتے	:	0088-01533091784
Email	:	tahernadwi@gmail.com

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب
لطمۂ موج کم از سیلیٔ استاد نہیں

انتساب

فمنهم من قضى نحبه و منهم من ينتظر

(الاحزاب: ۱۳)

اس لہو کے نام جو ملت اسلامیہ ارکان کے لئے بہا مگر خود ارکان میں اپنی ٹھہرا

بلوح تربت من یافتند از غیب تحریری
کہ این مقتول را جز بے گناہی نیست تقصیری



محمد طاہر جمال ندوی

۱۲/ دسمبر/ ۲۰۲۳ء

عرضِ ناشر

برادرِ محترم مولانا محمد طاہر جمال ندوی (فاضل جامعہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، ہند، وتلمیذ خاص مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ) کی شخصیت ہمارے دینی وروحانی، علمی وثقافتی، فکری وسیاسی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں، آپ ایک قابلِ القدر عالم دین، معروف ادیب و قلم کار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نامور مفکر مورخ بھی ہیں، جن کی چند تصانیف ماشاء اللہ چھپ کر منظرِ عام پر آچکی ہیں، اور بہت ساری تصانیف اب تک زیرِ طبع وزیرِ نظر بھی ہیں۔

مولانا محمد طاہر جمال ندوی بن الحاج مولانا حافظ جمال الدین احمد کی ولادت ۵ / ۵ / ۱۹۶۶ء میں بستی باغگونہ علی چنگ میں ہوئی، ابتدائی تعلیم اپنی آبائی بستی کے مکتب اور سرکاری پرائمری اسکول سے پا کر جامعہ اسلامیہ عالیہ بوسیدنگ میں داخلہ لیا، یہاں سے آپ نے ثانویہ تک کی تعلیم پا کر دارا لمعارف الاسلامیہ چاٹگام میں ایک سال حضرت مولانا محمد سلطان ذوقؔ ندوی اور حضرت مولانا فرقان اللہ خلیل صاحب سے پڑھا، اس کے بعد جامعہ اسلامیہ پٹیہ میں پڑھ کر دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخلہ لیا، یہاں سے کلیۃ الادب العربی سے ماجستر کر کے ۱۹۹۱ء میں سندِ فراغت حاصل کی۔

مولانا محترم فراغت تعلیم کے معا بعد بنگلا دیش آئے اور یہاں کے مختلف مدارس میں پڑھاتے رہے تھے، جن میں دارالانصار چاٹگام قابل ذکر اور نا قابل فراموش درسگاہ ہے، پھر چند سال پڑھانے بعد آپ نے حجاز مقدس کا سفر کیا، جہاں آپ نے چند سال گزارے، اس کے بعد دوبارہ بنگلا دیش آئے ہوئے ہیں، حالیا تصنیف وتالیف میں مصروف اور سرگرم عمل ہیں، الحمد للہ مولانا کی چند مطبوعہ اور غیر مطبوعہ گرانمایہ تصانیف ہیں، جن میں سے کچھ یہ ہیں:

☆ سرزمین ارکان کی تحریکِ آزادی تاریخی پس منظر میں۔
☆ سازش کا طوفان عقلیت ومادیت کے روپ میں۔
☆ روہنگیا مسلمانوں کے جانگسل المیے۔

☆ تذکرۂ علامہ سید الامینؒ۔
☆ تذکرۂ حضرت مولانا شاہ عبدالسلام ارکانیؒ۔
☆ روہنگیا مسلمان اور ان کی ہجرت کے اسباب۔
☆ ارکان کے عظیم شاعر علاول، حیات وکارنامے۔
☆ ارکان روہنگیا یونین، ماضی اور حال کے تناظر میں۔
☆ روہنگیا چیخ وپکار اور مطالبات (ترجمہ)۔
☆ وادیٔ پرخار کے گمنام مسافر۔
☆ سالارِ کارواں محمد جعفر حبیبؒ۔
☆ سرحیل کارواں۔
☆ علماء اور جمعیۃ علمائے اسلام ارکان۔
☆ روہنگیا رسم الخط کا ایک علمی اور فکری جائزہ۔
☆ روداد سخن۔
☆ نقوشِ خیال۔
☆ حیاتِ نور۔
☆ حیاتِ ڈاکٹر محمد یونس۔
☆ برما میں خانہ جنگی کا دور دورہ۔
☆ سرزمین ارکان کے درخشان ستارے (جلد ۱)۔
☆ سرزمین ارکان کے درخشان ستارے (جلد ۲)۔
☆ سرزمین ارکان کے درخشان ستارے (جلد ۳)۔
☆ سرزمین ارکان کے درخشان ستارے (جلد ۴)۔
☆ سرزمین ارکان کے درخشان ستارے (جلد ۵)۔
☆ سرزمین ارکان کے درخشان ستارے (جلد ۶)۔
☆ سرزمین ارکان کے درخشان ستارے (جلد ۷)۔
☆ سرزمین ارکان کے درخشان ستارے (جلد ۸)۔

☆سرزمین ارکان کے درخشان ستارے (جلد ۹)۔

☆سرزمین ارکان کے درخشان ستارے (جلد ۱۰)۔

☆سرزمین ارکان کے درخشان ستارے (جلد ۱۱)۔

☆سرزمین ارکان کے درخشان ستارے (جلد ۱۲)۔

مولانا کی ان تمام تصانیف میں سے سب سے مقبول ترین تصنیف ''سرزمین ارکان کی تحریکِ آزادی تاریخی پس منظر میں'' جو دسمبر ۱۹۹۹ء میں پہلی مرتبہ چھپ کر منظر عام پر آئی، اور دوسرا ایڈیشن زیر طبع ہے، جس کے متعلق مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے لکھا ہے کہ: ''فاضلِ عزیز مولوی محمد طاہر جمال ندوی شکر و سپاس کے مستحق ہیں کہ انہوں نے بڑی محنت ولیاقت کے ساتھ اس فرض کو انجام دیا، اپنے وطن کا حق ادا کیا، اور تاریخ کے خلا کو پر کیا، جو عرصہ سے پایا جاتا تھا''۔

مولانا کی زیر نظر تصنیف ''تاریخ ارکان کے درخشاں ستارے جلد اول'' بھی ہمارے نزدیک ایک شاہکار تصنیف ہے، جسے آپ نے بڑی محنت، لیاقت اور عرق ریزی سے کام لیتے ہوئے پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہے، اس میں کسی قسم کی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ آپ نے اپنی دیگر تصانیف کی طرح اس سوانحی تصنیف کو بھی ایک ملی فریضہ اور قومی خدمت کے بطور اور بقول آپ کے ایک سعادت سمجھ کر لکھا ہے، اور اس کی تکمیل کی راہ میں آپ نے جو تکلیفیں، صعوبتیں اور مشقتیں برداشت کی ہیں ان کے اجر ومعاوضے صرف اور صرف ذاتِ خداوندی کی طرف سے ممکن اور امید ہیں۔

تاہم اس قوم کے ایک فرد ہونے کی حیثیت سے ہم اپنی قوم کی طرف سے عصر حاضر کے ہمارے اس عظیم مصنف وقلم کار کو خراجِ تحسین وگل دستۂ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ اور اللہ تعالی سے دعا ہے کہ وہ اپنی خاص رحمت اور فضل وعنایات سے مصنف کی زندگی اور قلمی کاوشوں کو مزید شرفِ قبولیت سے نوازے۔ آمین یارب العالمین

محمد طارق جمال

سکریٹری برائے نشر واشاعت

دار البحوث والمناصرة الاسلامية

چاٹگام، بنگلا دیش۔

فہرست مضامین

پہلا حصہ

تاریخ ارکان کے درخشاں ستارے

مقدمہ

فہرست عناوین

دوسرا حصہ

فہرستِ عناوین
تیسرا حصہ

حرف آغاز

الحمدللہ رب العالمین، والصلوۃ والسلام علی اشرف الانبیاء وسید الاولین والآخرین، وعلی آلہ وصحبہ اجمعین، ومن تبعھم باحسان الی یوم الدین، ولا عدوان الا علی الظالمین، امابعد:

تاریخ کاروان حیات کا حافظہ ہے، اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جو قوم یا افراد اپنے حافظہ کھو بیٹھتے ہیں، وہ اپنے مستقبل تاریک بنا لیتے ہیں، ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کسی بھی قوم کا حال ماضی کا آئنہ اور کسی بھی قوم کا مستقبل حال کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اور تاریخ انسانی زندگی کا وہ ائینہ ہے، جس میں قوم اپنی حیات کا ہر اہم پہلو بڑی سچائی اور گہرائی کے ساتھ دیکھ پاتی ہے، چاہے اس کا تعلق انسانی سماج، طبقات، سیاست، معیشت معاشرت غرض انفرادی ہو یا اجتماعی، ذہنی ہو یا اخلاقی، تہذیبی ہو یا تمدنی کہ تاریخ ان کے ہر اہم پہلو کو بڑی گہرائی سے سامنے لاکر سورج کی طرح عیاں کر دیتی ہے۔

اور یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ جو قوم اپنے ماضی اور اپنے اسلاف کے کارنامے بھلا دیتی ہے، اس کا وجود بحیثیت ایک قوم صفحۂ ہستی سے مٹ جاتا ہے، کیوں کہ اس کے امتیازات، خصوصیات، کمالات، غیرت خودداری کے جذبات اور عظمت وشرافت کے جوسر چشمے تھے کہ جہالت نے انہیں ان سے محروم کر دیا تو اس کا رشتہ اپنے اسلاف سے ہمیشہ کے لئے ٹوٹ جاتا ہے، اب اس حالت میں ان کی رگوں میں وہ خون گرم کہاں سے آئے گا، جو اس کے جسم میں زندگی کی حقیقی توانائی اور اپنی عزت وآبرو، عصمت وناموس اور عظمت واقتدار پر کٹ مرنے کا حوصلہ اور جذبہ پیدا کر سکتا تھا؟ اس لئے ہر زندہ اور حوصلہ مند قوم اپنی قومی

تاریخ اور اپنے ماضی کی عظمت رفتہ اور اپنے اسلاف کے روشن کارناموں کو حرز جان بنائے رکھتی ہے۔

مسلمانان ارکان اپنے وطن عزیز میں حکمران رہ چکے تھے، ۱۷۸۴ء کو ان پر برمیوں کا زبردست حملہ ہوا تو ان کے روشن حالات نے انگڑائیاں لیں، ان پر ناموافق سیاسی حالات کا تسلط ہو گیا، ان کی سیاسی، معاشی، سماجی، معاشرتی، ثقافتی غرض سبھی شعبوں کو زوال وانحطاط نے دیمک کی طرح چھاٹ گیا تھا۔ ان کے علم وفن، مال ودولت، عزت وآبرو، نخوت وغیرت، ناموس ووقار سب پر آنچ آنے لگی، برطانوی دور حکومت میں بھی ان کی یہی حالت بدلی نہ تھی، پھر ۱۹۴۸ء میں برمیوں کا ارکان پر دوبارہ قبضہ ہو گیا تو انہوں نے ارکانی مسلمانوں پر وہ سارے مظالم ڈھائے، جن کی یاد و تذکار سے ہٹلر اور چنگیز بھی شرمائے بغیر نہیں رہ سکتے۔

پوری دنیا کی اسلامی اور اسلامیوں کی تاریخ کی طرح ارکان کی تاریخ میں بھی زوال وانحطاط کا کرشمہ دیکھا گیا ہے، مسلمانان ارکان جب یہاں حکمران تھے تو اس زمین نے ہر شعبہ ہائے زندگی میں بڑے بڑے اعیان پیدا کئے، اور تو اور ان میں ادباء، شعراء، انشاپرداز اور علماء وصلحا کی کوئی کمی نہیں تھی، اس میں شک کی گنجائش نہیں ہے کہ ہمارے اسلاف علم وادب، تہذیب وثقافت، اخوت ومساوات انسانی کے سرمایہ کار تھے، انہوں نے اپنے سرمایہ کو یہاں کے مسلمانوں کے علی الرغم دوسرے انسانوں، وحشی اور غیر متمدن قوموں پر پوری فیاضی کے ساتھ لٹایا تھا، ہمارے اسلاف نے یہاں کے ذرے ذرے سے محبت کی، اور یہاں کے چپے چپے کو اپنے جذبۂ عشق ووارفتگی کی سجدہ گاہ بنائی۔ یوں یہاں کی محبت بھری سرزمین نے ان کے دلوں کو جیت لیا تو انہوں نے اپنے سینے کو مزید کھول دیا تھا، ماضی کی اسکرین پر ان تمام مناظر کی تصاویر مرتسم ہیں، جو ہمارے سنہرے ماضی کی یاد دلاتی ہیں، اب انہیں بھول جانا ہماری قومی زندگی کا کوئی چھوٹا نہیں بلکہ سب سے بڑا حادثہ نہیں ہوگا تو اور کیا ہوگا؟

ہماری قومی تاریخ کے سنہرے صفحات شاہد ہیں کہ ارکان میں جو دعاۃ ومرشدین اسلام کے پیام جاودانی لے کر آئے تھے، انہوں نے عزم وہمت کو ہم رکاب کر کے یہاں کے انسانیت کش حالات کو سازگار بنایا، اور اپنی عزت وشرافت، اصول پرستی اور عدل گستری، مساوات اور انسانیت نوازی کے کارناموں سے یہاں کی غیر متمدن، وحشی اور بربر قوموں کو اسلام سے روشناس کر دیا تھا، انہوں نے

اپنی اخلاقی بلندی اور رواداری کے مخلصانہ جذبات کے ذریعے یہاں والوں کو اتنا متاثر کیا کہ نہ صرف ان قوموں نے بلکہ یہاں کی سرزمین نے بھی ان کے لئے اپنے آغوش محبت وا کردیا، اور انہیں عزت واحترام کے بلند مقامات پر بٹھایا، تاریخ کی ایک لمبی مسافت ہے، جسے ہم نے اس سرزمین میں عظمت وسربلندی کے لہراتے ہوئے پرچم تلے طے کی ہے، یوں یہاں کی گلریز وادیوں نے ہمارے اسلاف کے پاؤں چومے، سنگلاخ پہاڑیوں نے ان کے قدموں کو بوسہ دیا، کبھی کبھار ضرورت کی بنیاد پر ہمارے اسلاف نے اپنا قدم آگے بڑھایا، اور وہ خون کے متلاطم سمندروں کو پار کیا، اور اپنے اپنے مقصد ومنزل کو پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔

مگر اب طرفہ یہ ہے کہ ہم بڑے نا خلف، بزدل اور بادہ مست بن گئے ہیں، ہمارے ان دعاۃ و مرشدین، شہیدوں اور غازیوں نے عزیمت ودعوت کا روشن باب رقم کیا تو ہم نے ان کی آرزوؤں اور امنگوں سے غدر کرنا شروع کردیا ہے، وہ اور ان کے تمام کارنامے آنے والی نسل کے لئے روشنی کے مینار تھے، مگر اب ہمارے ہاتھوں ان کی شناخت اور تاریخی کارنامے مسخ ہونے لگے ہیں، اس طرح روشنی کے ان میناروں کی بنیادیں بھی ہمارے ہاتھوں متزلزل ہونے لگی ہیں۔

انسانی تاریخ کا یہ ایک بڑا المیہ ہے کہ اس نے بعض موقع پر اپنے اسلاف اور ان کے کارناموں کو یا تو بھلا دیا ہے یا بگاڑ دیا ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ جنوبی ایشیا میں اسلام کا دروازہ کھولنے والا ملت اسلامیہ کے عظیم سرخرو نوجوان حضرت محمد بن قاسم کے حالات بڑے دردناک ہیں، جو خود مسلمانوں کے ہاتھوں شہید ہوئے، اور ایک طویل مدت تک مطلق العنان حکمرانوں نے انہیں مسلم تاریخ میں جائز مقام تک دینا گوارا نہ کیا، مگر اسلامیان ارکان کے اسلاف کی طرح ان کے متعلق بھی وقت نے جب اپنے چہرے سے ناانصافی کی گردوغبار ہٹائی، تو اسلام کے اس عظیم المرتبت خادم کے روشن چہرے پر پڑی ہوئی گردوغبار صاف ہو کے چہرہ مزید تابناک ہوا، تو تاریخ نے انہیں اپنے سینے سے لگایا، غیرت مندوں نے انہیں اپنی حمیت وغیرت کی علامت بنایا ہے۔

ادھر اور ایک طویل مدت گزر جانے کے بعد یہاں کی تاریخ نے حضرت سید احمد بن عرفان الشہید اور حضرت اسماعیل شہید پیدا کئے، جنہوں نے وادی بالاکوٹ میں جہاد کا علم بلند کیا، باوجودیکہ ان مجاہدین

اسلام کی پشت میں کچھ غدار خوانین نے چھرا گھونپا، سکھوں اور انگریزوں کی امیدیں اور مرادیں بھر لائیں، مگر دریائے کنہار کے شوریدہ سر لہروں کے ساتھ اس تحریک کا مقدس لہو مل کر تاریخ کا رخ پھیر دیا، یوں یہ حضرات جنوبی ایشیا میں حقیقی اسلامی جہاد کے سب سے بڑی اور سب سے پہلی تحریک کے نقیب بن کر ابھرے، نہ صرف وہ حضرات بلکہ ان کے رفقاء، ہم نوا وشرکاء سبھی کو تاریخ نے بلند مقام عطا کیا ہے۔

بعض مورخین شاید وطن مقدس ارکان کے دور اخیر کے مجاہدین کو ناکام دیکھ رہے ہوں گے، جس طرح بعض حضرات مورخین حضرت سید احمد بن عرفان الشہید کی تحریک جہاد کو ایک ناکام تحریک کی نظر سے دیکھتے ہیں، مگر یاد رہے کہ بعض موقع پر شکست بڑا تلخ تجربہ ہوتا ہے، لیکن زندہ قوموں کی تاریخ میں بارہا ایسا بھی ہوا کہ ایک شکست ان کے لئے بڑی فتح کا پیش خیمہ بن گئی، اور وہ قومیں پہلے سے بڑھ کر معزز اور مضبوط بن کر ابھریں، تو راقم الحروف کی امید نہیں بلکہ یقین ہے کہ اور تو اور سرزمین ارکان کے دور آخر کی تاریخ بھی اس انداز سے ابھر آئے گی۔

بایں ہمہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تاریخ مجاہدین سید احمد بن عرفان الشہید کے برعکس سرزمین ارکان کے دور آخر کے مجاہدین کی نامرادی کی تلخی اس حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ اہل وطن اپنے جان نثاروں کو بھی بھول گئے ہیں، ان لوگوں کو بھول گئے جنہوں نے اپنی کڑیل اور بے داغ جوانیاں اور عمریں غاصبوں، خون خواروں اور طاغوتوں کے مقابلے میں دفاع دین ووطن کی خاطر قربان کردیں، اب تو حسرت ویاس کا یہ عالم ہے کہ ان شہیدوں اور غازیوں کے نام تک نہیں لئے جارہے ہیں، لیکن یاد رہے کہ آخر وہ لوگ ہمارے ہی تھے، جنہوں نے دریائے مایو اور کلاڈان سے وضو کیا، اور اپنے لہو کے سوغات دے کر ہماری تاریخ کو سرخرو کیا، وہ قائدین ملت، وہ جوانان قوم ہمارے جسد ملی ہی کا اٹوٹ حصہ تو تھے، جنہوں نے غلامی کی زنجیروں کو کاٹ پھینکنے کی کوششیں کیں، اور اپنی اپنی زندگیوں کو اس حوالے سے وقف کردیا، مگر آج ہمارے اندر شعور واحساس کی چنگاری ایسی بجھی کہ ہم ان شہیدوں اور غازیوں کے نام تک بھول گئے ہیں۔

جی ہاں! ان محسنوں کو یاد کرنا ہمارا فرض اولین ہے، جنہوں نے ظلمت و اندھیاری کے اس مہیب طوفان میں حق وصداقت کی قندیلیں روشن کیں، جنہوں نے حق کی آوازیں بلند کرنے کے صلے میں طعنوں، ملامتوں کے تیر سہے، اور اپنی زندگی، اپنے مستقبل کو ملت وقوم کی راہ پر نثار کیا، ملک وقوم کی

آزادی اور اگلی نسل کے مستقبل کی حفاظت کی بھر پور کوشش کی، اس مقصد کے لئے قید خانے کی اندھیاری کے نذر ہو گئے، شہید ہوئے، غازی بنے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ اب ان کی اکثریت ہمارے مابین نہیں رہے، مگر ان غزاۃ و شہداء کی پاک روحیں دیکھ رہی ہیں کہ ان کی قربانیوں سے کون کون مستفید اور کون کون فیضیاب ہو رہے ہیں، اگر ہم فراموش کرنے والے نہیں ہیں تو ہم ان شہیدوں اور غازیوں کو کبھی بھی نہیں بھول سکتے، ہر چند کہ وہ لوگ اپنے اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے، لیکن ان کا ملت و ملک پر نچھاور کیا ہوا لہو، جانے والوں کا قرض اور آنے والوں کی امانت ہے، اگر ہماری قوم ان کی جان نثاری، جرات و عزیمت کو نظر انداز کرتی ہے تو بجا طور پر یہ شک پیدا ہو سکتا ہے کہ یہ ہماری قوم زندہ بھی ہے یا نہیں؟

ہمارے اسلاف ہمت و حوصلہ، غیرت و شجاعت، عزم و استقلال، حب دینی اور حب الوطنی، حق و صداقت، انصاف و عدل گستری، رواداری و فیاضی غرض اخلاق عالیہ کے مجموعی طور پر مجسم تھے، اسی روشنی میں انہوں نے یہاں سے جہالت کو دور کیا، اور علم و عمل کی روشنی پھیلائی، آزادی کی یاد دلائی، حریت کا سبق پڑھایا، تہذیب و شائستگی کے چراغیں روشن کر کے فکر و تدبر اور علم و عمل کی روایات قائم کیں، وہ سب حقیقت میں اسلام کی تعلیمات سے سرشار تھے، انہوں نے ملک و ملت کی فتح مندی اور کامرانی کے لئے جان کے نذرانے پیش کئے تھے، اسلامی جہاد پر ان کا یقین تھا، مگر اب ہم کیا ہو گئے ہیں کہ ان کے کارناموں کو بھی بھول جانے لگے ہیں، ہمارے منہ ان سے پھیرنے لگے، انہوں نے حصول آزادی اور انسداد غلامی کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا رکھی تھی، مگر ہم نے غلامی کو اپنا شیوۂ زندگی بنا لیا ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ ارکان کے روہنگیا مسلمان بحیثیت قوم ایک زندہ دل اور معزز قوم ہے، جس طرح پچھلی سطور میں عرض کی گئی ہے کہ اس قوم کے اسلاف نے اپنے وطن میں ایمان و عقیدہ مسلک و مذہب کی تبلیغ واشاعت کے لئے قندیل نورانی اور چراغ روحانی جلایا تھا، یہاں انہوں نے وہی کچھ کیا، جو اسلام نے ان سے مطالبہ کیا تھا، انہوں نے یہاں کی اجڈ اور غیر مہذب قوموں کو اسلام کی روشن تہذیب و ثقافت سے روشناس کرایا، اور ایک دنیا کی دنیا کو ظلمت و اندھیاری کے مہیب طوفان سے نکال کر ہدایت و روشنی کی طرف لے آیا تھا، ان کی وجہ سے یہاں کی اجڈ قوموں کو وہ زندگی ملی، جس کے حصول کے بعد انسان

تمام مخلوقات خداوندی سے برتر ہو کر اعلی سے اعلی مقام اور بلند سے بلند تر مراتب پر فائز ہو جاتا ہے۔

ہمارے ان بزرگوں کی دعوت و عزیمت کے واقعات اور کارناموں کی دھندلی سی نشانیاں اور جھلکیاں جو تاریخ کے صفحات میں ملتی ہیں، ان سے یہ اندازہ کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے کہ انہوں نے اشاعت دین اور تبلیغ ملت اسلامیہ کے لئے زمانے کی چاہت وطلب کے مطابق مختلف حکمت عملیوں کو اپنایا تھا، ان میں سے ایسے بھی پائے جاتے ہیں، جو اس راہ دعوت و عزیمت میں اپنی اخلاقی بلندیوں، ذاتی خوبیوں اور کرداری رعنائیوں سے لوگوں کو متوالے بنائے اور اجڈ لوگوں کو اسلام کے حلقہ بگوش کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے، ان میں سے بعض عبقری شخصیات ایسی بھی پائے جاتی ہیں، جنہوں نے اپنے تطبیقی فیصلوں سے جہاد فی سبیل اللہ کے میدان کا انتخاب کیا، اور تیر و تفنگ، تلواروں اور نیزوں کے سائے تلے پل کر اسلام اور مسلمانوں کی آبرو بچائی تھی، اور جبھی موقع ملا تو یہاں اسلام کا نظام بھی قائم کیا، اور امن و آشتی، عدل مساوات کے ذریعے امن و طمانیت کی فضا قائم کر دی تھی۔

ہم اپنے ان بزرگوں میں عالی مشرب صوفیاء و درویش، عالی ہمت علماء و صلحاء، روشن خیال شعراء و ادباء، اور عالی مقام مولفین و مصنفین، دل دردمند دعاۃ و مصلحین، فکر ارجمند کے مالک دانشوران و سیاست دان، جان سوز رہنما و مرشدین، کوہ ہالہ سے ٹکر لینے والے قائدین و شہسواران، عرض سب کچھ پاتے ہیں، انہوں نے ہر دور میں بدلتی ہوئی صورت حال سے فائدہ اٹھایا اور وقت کی فضا اور ماحول کو خوب خوب سمجھا تھا، اور اپنے اپنے زمانے میں اپنی اپنی صلاحیت و استعداد کے مطابق دینی اور قومی ذمے داریاں خوب خوب نبھائی تھیں۔

پہلی صدی ہجری سے لے کر اب تک ہم اپنے بزرگوں کو اسلام اور انسانیت، ملک اور قوم کی خدمات انجام دینے والے پاتے ہیں۔ ۱۹۴۸ء سے لے کر آج تک چلنے والا جو سلسلۂ دعوت و جہاد نظر آ رہا ہے، یہ دراصل ہمارے ان ماضی کے بزرگوں کی خدمات کی ایک روشن کڑی ہے، جس طرح ماضی میں ہمارے بزرگوں نے زمانے کی پر کٹھن پگڈنڈیوں کی چکر کاٹتے ہوئے اس سلسلہ کو باقی رکھا تھا، ٹھیک آج بھی ان کے نہج پر یہ سلسلہ منزل کی طرف رواں دواں نظر آتا ہے۔

۱۹۴۲ء میں ہمارے بزرگوں نے ایک مرتبہ علم جہاد بلند کیا تھا، یہاں مسلمانوں کی جان و مال، عزت و ناموس کی حفاظت کے لئے جان کی بازی لگا دی تھی، اس حوالے سے بہتوں نے اپنی اپنی جان کے نذ

رانے پیش کئے تھے۔ٹھیک اسی طرح ۱۹۴۲ء میں حضرت جعفر حسین قوال شہید نے ہمارے بزرگوں کے اس جہادی سلسلہ کو مزید نکھارا اور آگے بڑھایا تھا، بعد میں ان کے متبعین اور خوشہ چینوں نے ان پر چھائی ہوئی خزاں کو بہار کی شبنم سے آبیاری کرنے کی کوشش کی ہے، کیا ہم ان تمام حضرات کی خدمات وکارناموں کو یکسر بھلا سکتے ہیں؟ کیا وہ عقیدت ومحبت کے کم سے کم گلدستے پانے کے لائق بھی نہیں ہیں؟ جی ہاں حق تو یہ ہے کہ ان پر عقیدت ومحبت کے جتنے بھی گلدستے نچھاور کئے جائیں تو بھی کم ہیں، ہم ان کے عقیدے و مسلک، فکر وجذبات، اولوالعزمی وعالی مشربی، قربانی وجان نثاری، اخوت ومحبت، پیار اور ہمدردی، عبادت و خدا ترسی، صبر وحق پسندی، فدائیت وللّٰہیت کو تہ دل سے سراہتے ہیں، اور ساتھ ساتھ ان کی اخلاقی بلندیوں اور کرداری روشنیوں کو موجودہ لوگوں اور آنے والی نسلوں کے لئے مشعل راہ اور معالم الطریق بھی سمجھتے ہیں۔

۱۹۴۲ء سے لے کر آج تک اس راہِ دعوت وعزیمت میں ہزاروں فدایان ملت وقوم نے اپنے بزرگوں کی طرح جان کے نذرانے پیش کئے، جن کی تفصیلات کے لئے ایک اکیڈیمی کے زیر سائے مرتب ہونے والا ایک موسوعہ کی ضرورت ہوگی۔تحریک آزادی ارکان کے زیر سائے کام کرنے والے تمام مجاہدین وقائدین باشعور، زندہ دل اور مستقبل سے باخبر تھے، حقیقت میں یہ لوگ گفتار کے غازی نہ تھے، بلکہ کردار وعمل ان کی زندگی کا شیوہ بن چکا تھا، قربانی اور ایثار ان کی زندگی کا مقصد اصلی تھا، انہوں نے اپنے اسلاف کے کارناموں سے درس عبرت حاصل کیا، دعوت وجہاد اسلامی کو شیوۂ حیات بنایا، انہوں نے طاغوت کی غلامی اختیار کرنے کے بجائے خون کا متلاطم سمندر پار کرنے کو مناسب سمجھا تھا، ان لوگوں نے کسی بھی قسم کی غلامی کو قبول نہیں کیا، اسلام کی بقا اور اپنی عزت وآبرو کی حفاظت کے لئے دل کو دہلا دینے والے طوفان سے مقابلے پر مقابلہ کیا تھا۔

مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہم میں سے بعض کور بین اور نادان افراد آج اپنے ان بزرگوں کے جمیع مثبت کارناموں کو منفی نظروں سے دیکھ رہے ہیں، حتی کہ چند افراد ایسے بھی نکلے ہیں کہ وہ نہ صرف جہاد و کفاح سے جی چراتے ہیں بلکہ انہیں برمیوں کی غلامی سے دلچسپی اور دل لگی اور طلب آزادی کی جدو جہد سے نفرت اور چھیڑ ہے، ان کے دل وضمیر کو اداسی اور نامرادی کی لت کھائی جارہی ہے، انہوں نے قوم کی جائز چاہت وطلب کو جھانسہ دے کر دشمنوں کے ساتھ ساز باز کرنے کو پسند کرلیا ہے۔

یہ بات جس بزرگ کی زبان یا قلم سے نکلی ہے بڑی سچی نکلی ہے کہ ایک قوم کی مذلت کو دو چار افراد کی کوشش دور نہیں کرسکتی، اسے دور کرنے کے لئے پوری قوم کو پوری تیاری، مستعدی اور دل سوزی کے ساتھ اجتماعی انداز میں کوشش کرنی ہوگی، ایک قوم کی سب سے بڑی خطا یہ ہوتی ہے کہ وہ ظلم واستبداد، جبر وتشدد کے خلاف لڑنے اور حق کی آواز بلند کرنے سے دست بردار ہوجائے، چند افراد کے خون کے آنسو ایک قوم کی مظلومیت کے مقابل نہیں ہوسکتے، بلکہ مقابلہ کے لئے پوری قوم کی اجتماعی جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے۔آج ارکان کے روہنگیا مسلمانوں کو اپنے بجھتے ہوئے چراغ کو بچانے کے لئے شعلوں سے ٹکر لینے والے جان سوز پروانوں کے خونِ جگر کی ضرورت ہے، جس کے بغیر خزاں کا مارا ہوا یہ گلستان شبنم بہار سے کبھی بھی آشنا نہیں ہوسکتا۔

ہمارے پچھلے بزرگوں کی خدمات وکارناموں کے حوالے سے راقم الحروف کا اتنا یقین ہے کہ ہماری قومی وملی زندگی میں جتنے دھارے بہہ گئے اور آج بھی ایک حیرت انگیز انداز میں بہہ رہے ہیں، سیاست وقیادت کے جتنے چشمے ابل پڑے، اور میدان کارزار میں جتنی پاک روحوں کے عزائم بیدار، ہوں، اور دار ورسن کی کشاکش سے غیر متزلزل رہے، یہ بس ان بزرگوں کی قربانی، جاں سوزی، اخلاص وللّٰہیت اور فدائیت کا فیضان ہے۔

یاد رہے کہ غیرت مندوں اور غازیوں کے روشن کارناموں اور ان کے اثرات ونتائج کا صحیح صحیح اندازہ مقبوضات کی وسعت، مال غنیمت کی فراوانی، جشن وجلوس کی ہما ہمی، عیش وعشرت کا طرب ونشاط، تختوں اور تاجوں کی چمک دمک، تیر وتفنگ، نیزوں اور تلواروں کی جھنکار سے نہیں کیا جاسکتا، اس کا صحیح صحیح اندازہ ٹوٹی ہوئی تلواروں، بکھرے ہوئے خیموں، دہکتی ہوئی روحوں، دمکتے ہوئے چہروں اور بہتے ہوئے خون کے دریاؤں سے کیا جاسکتا ہے۔

اور یہ بھی اچھی طرح یاد رہے کہ ظالم کے ظلم وجبر، استبداد وستم رانیاں جتنی بھی تپاں کیوں نہ ہوں، مگر ہر طلوع کے پردے میں راز ہائے زوال مضمر ہوتے ہیں، دنیا میں آج تک صبح کو بلند ہونے والا تپاں سورج اپنے غروب کے دھیما پن سے عہدہ برآ نہیں ہوسکا، یہی حال ارکان کے مسلمانوں پر مظالم ڈھانے والوں کا ہوگا، ان شاء اللہ۔

آج ہم ارکان کے روہنگیا مسلمان جن حالات کے شکار ہیں، اور ہماری قومی تحریک نے پچھلے چند سالوں سے جس قسم کی چھلانگ لگا رکھی ہے، اس میں امید کی کرنی بڑی دھیمی نظر آرہی ہے، جہاں تک سیاست وقیادت کی دنیا میں قدم رکھ کر اندازہ کیا، اس کے پیش نظر ہمارے لئے یہ سوال بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ پچھلے چند سالوں سے روہنگیا مسلمانوں کی سیاست وقیادت کا قدم آیا منزل کی طرف بڑھ رہا ہے یا یہ میدان تیہ کی چکر کاٹنے میں مصروف؟ آیا روہنگیا مسلمانوں کی کہنے میں بڑی بڑی جماعتیں سیاست وانقلاب کے میدان میں اپنا واضح نصب العین جو غیر متزلزل ہو، متعین کر سکیں یا آئے دن اس حوالے سے غلطی پر غلطی کا مظاہرہ کر رہی ہیں؟ ظاہر ہے کہ جو قوم سیاست کے میدان میں ایک قدم بھی غلط اٹھا دیتی ہے، تو اس کی تقدیر کا قدم صدیوں پیچھے چلا جاتا ہے، جس کا خمیازہ اس قوم کو نسلاً بعد نسل بھگتنا پڑتا ہے، اگر ہمارا اس طرح کا حال مزید باقی رہے گا تو آگے چل کر تباہیوں اور بربادیوں کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوگا، اس لئے عرض ہے کہ ہمیں اپنے اگلے قدم کو جوش کے بجائے ہوش سے ڈالنا ہوگا، اللہ تعالی ہمیں توفیق سے نوازے۔

بہر حال ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہئے، کیوں کہ مایوسی ایک ایسی بیماری ہے جو قوموں کے جسم سے عزم و عمل کی ساری توانائیوں کو سلب کر لیتی ہے، مایوسی کی وجہ سے انسان کے جذبات حالات کی برفیلی پگڈنڈیوں میں ٹھٹھر کر رہ جاتے ہیں، ان کے اندر سے زندگی کی ساری امنگیں رخصت ہو جاتی ہیں، اور وہ مسلسل احساس کمتری میں مبتلا ہو کر بتدریج قعر مذلت میں گر جاتا ہے، اور جو قوم اپنی ذلت ونکبت پر راضی ہو کر جدوجہد کا دامن چھوڑ دیتی ہے، وہ قدرت کے تعاون سے محروم ہو جاتی ہے۔

اس لئے حالات جتنے بھی مایوس کن کیوں نہ ہوں، مگر اللہ تعالی کی ذات پر بھروسہ کرنا ہمارا فرض ہے، توکل اور صبر کے دامن تھامے ہمیں اپنے اندر از سر نو قوت مدافعت اور عزم وعمل کی توانائیاں لانی ضروری ہیں، اگر ہم نے اپنی رہی سہی صلاحیت واستعداد کو مستحکم کیا، تو یقین ہے کہ راستے کا کہرا ہمارے سروں سے جلد چھٹ جائے گا، جس سے ہمارے مستقبل کی راہیں روشن ہو جائیں گی، ہماری ترقی کا راستہ بڑی تیزی سے صاف ہو جائے گا۔

اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ روہنگیا قوم ایک سعادت مند قوم ہے، جس کی تقدیر میں جہاد کا فریضہ لکھا گیا ہے، اور یاد رہے کہ سرزمین ارکان ایک ایسی سرزمین ہے کہ جو جنوب شرق ایشیا کے لئے باب الاسلام کا درجہ رکھتی

ہے، یہ زمین مستقبل میں ایک مضبوط اور غیر مسخر اسلامی گھاٹی میں تبدیل ہو سکتی ہے، اگر چاہے خدا کرے۔

بہر حال زیر نظر مجموعہ (تاریخ ارکان کے درخشاں ستارے جلد اول) ہماری آنے والی نسلوں کے لئے سعادت کی زندگی کا ایک پیغام ہے، جسے یادوں اور تذکاروں کا گلدستہ، آنسوؤں کا مالا، جان نثاروں کی روداد جان سپاری اور فدایان قوم وملت کی داستان الفت ومحبت کہا جا سکتا ہے۔ یہ مجموعہ ایک تاریخ تو نہیں، لیکن تاریخ کا احتجاج ضرور ہے، یہ مجموعہ فکری نظر بندوں کی کم نگاہی، مورخین یا تذکرہ نگاروں کا ماتم، سیاسی وانقلابی مجبوریوں کا نوحہ، پس ماندگان تحریک کا مرثیہ اور اسلامیان ارکان کے جذبوں کا امین بھی ہے، اس مجموعہ میں جتنے بھی تذکرے ہیں تقریبا ہر ایک مختصر تجزیے پر مشتمل ہیں، مگر ضرورت اس بات کی ہے کہ آج کی درسگاہوں سے درس خود فراموشی کرنے والے جوانوں کو یہ علم ہو کہ ہم کیا تھے اور اب کیا ہو گئے، اور یہ سوچ کہ ہماری حالت ایسی کیوں کر ہوگئی۔

اس مجموعہ میں شامل بیشتر ستاروں کے حالات وواقعات کو جمع کرنے میں بڑی بڑی مصیبتیں اٹھانی پڑیں، کوشش تو کی گئی، مگر غلطی کے امکانات بہت ہیں، پھر ممکن ہے کہ قارئین کرام کو اس میں کہیں کہیں جذبات کا عنصر بھی نظر آئے گا، تاہم اس حوالے سے ہم کسی بھی معذرت کو اس لئے ضروری نہیں سمجھتے کہ اس قسم کے موضوع پر قلم اٹھانا ہے تو جذبات سے بالکل برتر ہو کر اٹھانا امکانیات سے نہیں ہے، لیکن یہ بھی وضاحت کی ضرورت ہے کہ یہ جذبات صرف اسلوب نگارش اور بیان احوال کی حد تک ہے، حقائق وواقعات کی استنادی حیثیت پر اس کا کوئی اثر نہیں ہے۔ **ہذا۔ وصلی اللہ تعالی علی خیر خلقہ محمد وآلہ وصحبہ وسلم۔**

بیاد رفتگاں دو چار آنسو
اب اپنا یہ فریضہ رہ گیا ہے

خاکسار/

محمد طاہر جمال ندوی

۰۳/دسمبر/۲۰۲۳ء

تاریخ ارکان کے درخشاں ستارے

(پہلا حصہ)

مقدمہ

حروفِ گفتنی

خاکسار مصنف اللہ تعالی کا نہایت شکر گزار ہے کہ جس نے اپنے خاص فضل وکرم سے اپنے اس عاجز بندے کو ایک مظلوم امت ''روہنگیا'' کے حوالے سے کچھ علمی وقلمی خدمات کی توفیق بخشی ہے، جس نے اپنی خاص عنایات سے دیگر بیش قیمت قلمی خدمات کے ساتھ ''تاریخ ارکان کے درخشاں ستارے'' کے عنوان سے آج تک کوئی بارہ ضخیم مجلدات کی تیاری کی توفیق سے نوازی ہے، اس کی تیاری کے لئے اسے کتنی مشقتیں اٹھانی پڑی ہے اس کی تفصیلات سے صرفِ نظر یہاں کچھ ضروری باتیں عرض کرنی ہے کہ:

۱۔ تاریخ ارکان کے درخشاں ستارے پر یہ جو طویل مقدمہ حاضر خدمت ہے، اسے مصنف نے ۲۰۰۳ء میں لکھا تھا، ظاہر ہے کہ آج ۲۰۲۴ء کا سال ہے، یعنی اکیس سال کی طویل مدت گزر جانے کے بعد آج طباعت کی نوبت آئی ہے، الحمد للہ تعالی علی فضلہ وکرمہ۔

چنانچہ اس طویل مدت کے اواخر میں مصنف کو اگر یہ احساس ستا تا رہا ہے کہ اس ''مقدمہ'' کا جو اندازِ بیان، طرزِ تحریر اور اسلوبِ نگارش ہے، اس میں کافی اضافے وترمیم اور خاصے بدلاؤ کی ضرورت تھی، لیکن اس نے یہاں کسی بھی قسم کے بدلاؤ لانے کے بجائے اسے جون کا توں رکھنے کو مناسب سمجھا، تاکہ اور تو اور قارئینِ کرام وقت کے ساتھ مصنف کی قلمکاری کے اتار چڑھاؤ سے محظوظ ہونے پائیں۔

۲۔ ظاہر ہے کہ مصنف کا یہ مقدمہ بھی اس کی دیگر تحریروں کی طرح اردو کے ایک عجم کے قلمکار کی تحریر ہے، جس میں خیالات وافکار کے علاوہ لسانی فروگزاشتوں کی بڑی گنجائش ہے، ویسے قارئین کرام سے امید نہیں بلکہ یقین بھی ہے کہ دورانِ نظر جو بھی کوتاہیاں اور خامیاں نظر آئیں گی، اطلاع دے کر شکریہ کے مستحق ہوں گے۔ اللہ تعالی ہم سب کا حامی وناصر ہو۔

خاکسار/

محمد طاہر جمال ندوی

۱۰/ جنوری/ ۲۰۲۴ء

تاریخ نگاری کے طریقے

دنیا میں عمومی طور پر تاریخ نگاری کے دو طریقے پائے جاتے ہیں، ایک شاعرانہ اور دوسرا عالمانہ، اول الذکر سے مراد یہ ہے کہ واقعات وحوادث انسان کے تابع ہے، ان تصانیف میں جو اس شاعرانہ طریقے کے مطابق لکھی جاتی ہیں انسانی دنیا کی کسی سر برآوردہ شخص کا انتخاب کرلیا جاتا ہے، اور اس کی زندگی کے کسی حیرت انگیز کارناموں اور سرگرمیوں کی تصویر کشی کر کے اسے کسی قصے کا سورما جتا دیا جاتا ہے، پھر ثانی الذکر کا جہاں تک تعلق ہے کہ اس کی رو سے معاملات انسانی ایک مسلسل زنجیر کے مشابے ہیں، جس میں ہر کسی واقعہ کو کسی سابقہ واقعہ کا معلول اور کسی واقعہ سے آئندہ کی علت قرار دیا جاتا ہے، اور اس اعتبار سے واقعات انسان کے تابع نہیں بلکہ انسان تابع واقعات ہے۔

طریقہ اول الذکر ان تصانیف کا ذمہ دار ہے جو خواہ کیسی ہی دلچسپ ہو اور دل پسند کیوں نہ ہو، لیکن ان کا درجہ حقیقت میں افسانوں اور قصوں سے ذرا بلند ہوتا ہے، اور طریقہ ثانی الذکر بالکل روکھا پھیکا ہوتا ہے، بلکہ شاید موجب استکراہ بھی، اس لئے کہ وہ ہر اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ قانون کی حکومت اٹل اور انسان کی ہر کوشش ایک ناچیز کوشش ہے، اور جو مہتم بالشان مسئلہ اس کتاب کا موضوع ہوتا، اس کو خیال آرائی اور اعجوبہ آفرینی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے، اسی لئے اس شخص کو جسے اس مسئلہ پر قلم اٹھانے کا حوصلہ ہو، مقدر کے اس تسلسل پر اپنی نگاہیں جمائے رکھنی چاہئے، جو تاریخ عالم میں پایا جاتا ہے، اسے ہر حکمرانی کی پرچھائیاں جو اس میں ڈھلتی پھرتی نظر آتی ہیں، از راہِ تحقیر بالکل منہ پھیر لینا چاہئے، اور دنیا میں ایسی تاریخی کتابوں کی کوئی کمی نہیں ہے جو کسی حکمران کے سائے کی زیر اثر نہ ہو، البتہ دنیا میں بعض ایسی تاریخی کتابیں بھی دستیاب ہیں جو دنیا اور اہل دنیا کے زیر اثر نہیں لکھی گئی تھیں، ایسی تاریخی کتابوں سے فائدہ اٹھانا قلم کاروں کے لئے بہت ہی ضروری ہے۔

آج کل روہنگیا مسلمانوں کے حالات وواقعات پر مشتمل جتنی تاریخی کتابیں لکھی جارہی ہیں، میرے

خیال کے مطابق وہ کسی بھی انسان کے زیر اثر نہیں لکھی جارہی ہیں، خدا کرے کہ ہماری تاریخ میں یہ ایک اصول مسلمہ قرار پائے، آج کل کی تاریخی کتابوں سے ہماری اگلی نسل کو انشاءاللہ خاصا فائدہ ہوگا، جن میں افراتفری کا عالم چھایا ہوا نظر نہیں آتا، پھر جہاں تک ہماری تنظیموں اور جماعتوں کے حالات وواقعات کا تعلق ہے، ان حالات وواقعات کو بھی جوں کا توں لکھ دیا گیا اور جارہا ہے، تاکہ آنے والی نسلیں اپنے آباء واجداد کے کارناموں سے مستفید ہوکر منزل کی طرف رواں دواں ہوسکیں، جن سے وہ لینی والی چیزیں لے لے کر اور نظر انداز کرنے والی چیزوں کو نظر انداز کرکر کے اپنے قدم آگے بڑھا سکیں۔

سچا مذہب انسانی تعمیر وترقی کا پیش خیمہ ہے

انسانی فطرت میں دوضرورتیں بالکل لازمی ضرورتیں ہیں، ان میں ایک علم کی ضرورت، دوسری محبت کی ضرورت ہے، جہاں تک علم کا تعلق ہے وہ عقل سے ہے، جب کہ محبت کا تعلق جذبات سے ہے، انسانی عقل ہمیشہ یہی چاہتی ہے کہ انسان کی ساری چیزیں اس کا تابع ہوکر اس کے اشارے پر کودیں ناچیں ، جبکہ جذبات کی چاہت ہے کہ وہ ساری چیزوں کو دبا کر رکھیں، اور انسانی دنیا میں من مانی حکومت کریں ، ان دونوں کے بیچ میں مذہب ہے، یعنی مذہب کا ان دونوں سے تعلق ہے، وہ عقل وخرد سے جذبات کی روک تھام کا کام لیتا ہے، اور جذبات سے عقل کی ہوش سنبھالتا اور درست کرتا رہتا ہے۔

دنیا میں وہ مذہب کبھی سچا مذہب نہیں ہوسکتا، جو عقل وجذبات کے درمیان اعتدال نہیں رکھ سکتا ہو، عقل وجذبات کے اتحاد وہم آہنگی کے بغیر کسی مذہب کو مذہب نہیں کہا جا سکتا، بلکہ اسے فلسفہ یا اور کچھ کہا جا سکتا ہے، اور جو مذہب صرف استدلالی اور قیاسی ہوگا وہ مذہب تو نہیں البتہ فلسفہ ضرور ہے، جس میں صرف جذبات ہی جذبات کی حکومت ہے، اس قسم کے مذہب یعنی فلسفے کے پیروکار اکثر وبیشتر توہمات میں پھنس کر رہ جاتے ہیں، مذہبی جذبات کو جب حد سے بڑھا دیا جاتا ہے تو وہ پیچیدہ اسرار ہوتے ہیں، یا ایک ناواجب دہشت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں، انسان کے لئے یہ دونوں چیزیں حد سے زیادہ مضر ہیں، انسان کو چاہئے کہ عقل وجذبات کے درمیان تناسب واعتدال رکھے، ایک کو بڑھانا اور دوسرے کو دبانا یا گھٹانا انسان کے لئے بہت بڑا مضر کام ہے، دلی جذبات کی عقلی باریک بینی سے روک تمام کی جانی چاہئے ، اسی طرح عقل کی ناروا پرواز کو جذبات کے ذریعے اصلاح کی جانی چاہئے۔

انسان اور دیگر تمام حیوانات میں ایک قدرتی فرق ہے، دوسرے حیوانات کے برعکس انسان کے اندر دو ایسی خصوصیتیں موجود ہیں، جو اس کی تعمیر وترقی کے موجب ہیں، ان میں ایک ہے عقل اور دوسری مدنیت، اسی لئے انسان کا ارتقا دوسرے حیوانات سے مختلف ہے، عقل انسانی ترقی کے لئے ناگزیر چیز ہے جو انسان کو دو باتیں سکھلاتی ہے، ان میں ایک تو یہ کہ اس کا ذاتی فائدہ دنیا کے اس بازار میں سب

سے مقدم اور ضروری ہے، جہاں تک مدنیت کا تعلق ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان اپنی استعداد اور قابلیت کے بل بوتے پر اپنے بنی نوع سے مل جل کر اور جماعت کے اندر رہ کر کام کرنا چاہتا ہے، مگر یہ دونوں خصوصیتیں ایک دوسرے کے مخالف اور ضد ہیں، یعنی عقل کا کام تفرد، انفصال اور فنا ہے، جبکہ تمدن کی ترقی کے لئے ایثار و ہمدردی اور سوسائٹی کے فوائد کو اپنے فوائد پر تقدم سمجھنا ناگزیر ہوتا ہے، یہ ایثار وقربانی سائنس اور عقل نہیں سکھاتی ہے، اس کی ہدایت عقل وسائنس سے بالا ہے، اس لئے یہی ہدایت انسان کو مذہب سے حاصل ہوتی ہے، اسی لئے انسان کی تعمیر وترقی مذہب اور صرف مذہب پر منحصر ہے، نسل انسانی کے ارتقا کا مقصد عملی جد وجہد اور ایثار وقربانی کے ذریعے حاصل ہوتا ہے، جو صرف اور صرف مذہب کے اندر پایا جاتا ہے، عقل انسان کو اپنے فوائد کے لئے جد وجہد کرنا سکھاتی ہے جب کہ مذہب انسان کو ذاتی اور شخصی قربانی ، ایثار اور ہمدردی سکھاتا ہے، یہ ایثار وقربانی نہ صرف ان انسانوں کی خاطر ہوتی ہے، جو ابھی اس دنیا میں ہمارے مابین موجود ہیں، بلکہ ان لوگوں کے لئے بھی جو آئندہ آنے والے ہیں، ہم مانیں یا نہ مانیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا کہ انسانی تمدن یا ترقی چند اشخاص یا ایک آدھ نسل کا کام نہیں، بلکہ قرنوں اور نسلوں کی جد وجہد سے واقع ہوتی ہے۔

اہل علم وہنر کے لئے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ زمانہ قدیم میں یونان وروم کی عملی ترقی انسانی تاریخ میں بے نظیر ترقی ہے، مگر باوجود اس حیرت انگیز ترقی کے وہ دنیا سے اب نابود ہوگیا، کہ گویا اس کا کوئی پتہ ہی نہیں تھا، بعض علم وہنر کے رکھوالوں کے مطابق وہ دنیا سے اس لئے نابود ہوا کہ ان کی اس ترقی میں صرف اور صرف عقل غالب رہی تھی ، اور عقلی پیچ وخم میں اس نے اخلاق ومدنیت کو عقل کا تابع کر دیا تھا، حتی کہ وہ سارے عقلاء عقل وخرد کے گرداب میں پھنس کر خود کو اور آنے والی نسلوں کو تباہ کر دیئے تھے، اس نقطہ نظر سے روم اور یونان کی تاریخ پڑھی جائے تو حیرت وحسرت، عبرت ووحشت کی انتہا ہوجاتی ہے، ان کا یہی زوال خصوصا ان اقوام کے لئے جو دنیا میں پڑھنا اور ترقی کرنا چاہتی ہے، بڑا اسبق آموز ثابت ہوتا ہے۔

مذہب انسان کو بے غرض اور بے لوث ہونا سکھاتا ہے، اور ساتھ ہی ساتھ بے نفسی بھی ، مذہب انسان کو دوسروں کے لئے قربانی دینا اور دوسروں کی خوشی کے لئے مرمٹنا سکھاتا ہے ، عقل کی تنگ وتاریک طمانیت پہنچانے کی نیت سے خود کو قربان کر دینے کی تلقین کرتا ہے، اس کے برخلاف جو بھی مذہب ہو،

وہ مذہب نہیں، اسی لئے ایک سچے مذہب کے پیروکار کی خوشی ومسرت زیادہ پائدار اور مستقبل ہوتی ہے، اسے اپنے عمل وکردار میں زیادہ سے زیادہ اطمینان حاصل ہوتا ہے، وہ گزرے ہوئے پر شکرگزار اور ہر حال میں قانع اور آئندہ پر زیادہ پر امید اور توقع کرنے والا ہوتا ہے، اس کے برعکس انسان بوالہوس، دولت کے پجاری اور سراسر بے اطمینانی اور تذبذب کا شکار ہو جاتا ہے، اس کے سامنے مستقبل تاریک ہی تاریک نظر آتا ہے۔

لیکن یاد رہے کہ مذہب کے لئے سب سے بڑی تباہ کن بیماری افراتفری اور مبالغہ آرائی ہے، انسانی تاریخ میں مذہب کے نام پر بڑے سے بڑے فلسفے دیکھے گئے ہیں، اور خور مذہب کی تاریخ بھی بڑی پیچیدہ اور خم دار رہی ہے، اسلام کے برخلاف دنیا میں ایک سے زیادہ معروف مذاہب نے اخلاقیات کی کسی ایک خوبی کو لیا، اور اسے آسمان پر چڑھا دیا، اور دوسری خوبیوں کو سراسر نظرانداز کر دیا ہے، اس طرح دوسرے کسی مذاہب نے کسی دوسری خوبیوں پر اس قدر زور دیا کہ جیسی باقی تمام خوبیوں کی کچھ وقعت اور حقیقت ہی نہیں، یہودیوں نے ارکان ظاہری پر اس قدر پابندی کی کہ باطنی اور روحانی تمام صفائیوں کو نظرانداز کر دیا ہے، اس کے برعکس عیسائیت نے باطنی صفائیت پر ایسا زور دیا ہے کہ اس کے پیروکار دنیا و مافیہا سے بالکل بے تعلق ہو گئے، یعنی مختلف مذاہب نے حق وصداقت اور اخلاق کے مختلف پہلوؤں کو خاصی نظر سے دیکھا اور ان کی نظر میں باقی تمام پہلو دھرے کے دھرے رہ گئے ہیں، اور اس غلو کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سارے مذاہب انحطاط وتزلزل کے شکار ہو گئے، غرض مذہب کی کامل ومکمل صداقت اس ناگزیر کامیابی کا اصل راز یہ ہے کہ وہ ساری چیزوں میں اعتدال اور توازن قائم رکھے۔

ہماری پچھلی تحریک پر ایک نظر

ارکان کی تحریک جہاد پر مطالعہ سے جہاں تک پتہ چلا کہ ۱۹۴۷ء کو جو تحریک شروع ہو چکی تھی، اس میں صحیح معنی میں جان تھی، اس میں بلند و برتر مقصد تھا، اس کے حاملین میں اخلاص وللّٰہیت، فدائیت و قربانی، جان بازی وجان سپاری جیسی صفات تھیں، اس میں دینداری، خداترسی، محبت اور ایثار واخوت تھی، حضرت مجاہد اعظم محمد جعفر حسین قوال شہید اور آپ کے رفقائے کار کی جان سوزی وجان فروشی کی طول طویل داستانوں سے آج صاحب دل وصاحب نظر مورخ یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہاں ان کے انداز وادا، کردار واطوار میں دینداری اور اسلامی جذبات کارفرما تھے۔

یہ تو ایک مسلم چیز ہے کہ اسلام کے ہر پہلو اور ہر گوشہ دراصل ایک تحریک ہے، جس کا ہر پہلو افراد میں ربط باہمی اور مونس کلی پیدا کرتا رہتا ہے، جس سے کل جماعت کی سلامت طبع اور حسن اخلاق و اعمال میں اضافہ کرتا رہتا ہے، اور یہ بھی ایک بین حقیقت ہے کہ باہمی الفت ومحبت، تعاون ونصرت انسان کے اندر حسن سلوک جیسی صفت بھر جاتی ہے، پھر یہ بھی ایک امر مسلم ہے کہ اسلامی جذبات وصفات سے بھری ہوئی ہر تحریک ایک بلند و برتر نصب العین کی حامل ہوتی ہے، جسے چھوڑ کر ایک مسلمان کبھی بھی کامیاب وکامران نہیں ہوسکتا، بلکہ مسلمانوں کی ایک تحریک کے لئے اسلامی روح ایک ناگزیر چیز ہے، جس کے بغیر مسلمان حقیقی کامیابی سے کبھی بھی ہم کنار نہیں ہو سکتے، بلکہ اس کے برعکس ذلت وشکستگی، ناکامی ونامرادی میں مبتلا ہو جاتے ہیں، بالآخر نہ صرف تحریک بلکہ خود مسلمان بھی بربادی اور تباہی کے پار پہنچ جاتے ہیں۔

تحریک جہاد کے ان اولین کے بعد پیدا ہونے والے محرکوں میں وقت کے ساتھ ساتھ ان بلند وبالا صفات کی کمی محسوس کی جانے لگی، ان میں ایثار ومحبت، اخوت وہم دردی کی جگہ بے معنی کے تکبر ونخوت اور مابین ظلم وبغاوت نے لے چکی تھی، مجاہد اعظم محمد جعفر حسین شہید اور شہید اعظم جنرل عبدالشکور دابوی

کی شہادات کے بعد چند دن کے لئے سہی یہ تحریک قدرے دیوالیہ بن چکی تھی، ان شہیدین کے دور جہاد وتحریک میں جو وحدت واتحاد تحریک کی رگ وریشے میں چھایا ہوا تھا، وہ کچھ وقت کے لئے باہمی افتراق ومخاصمت میں بدل چکا تھا، ہوتے ہوتے دنیا نے وہ دن بھی دیکھ چکا کہ خود مجاہدین کے اندر ظلم و بربریت، عداوت وجاہ طلبی، عیاشی اور بے لگامی جیسی ناروا صفات بھر چکی تھیں۔

۱۹۵۸ء کے بعد یہ تحریک مزید کھوکھلی ہو چکی تھی، البتہ یہ ضرور ہے کہ مجاہدین نے دشمن سے مقابلہ کیا، لیکن ان کے جذبات وحمیت میں باہمی نفرت اور اپنوں سے عداوت کے جراثیم داخل ہو چکے تھے، اور اندر ہی اندر میں وہ سارے کام ہو چکے تھے جو ان کے دشمن کی طاقت سے باہر تھے۔

مجاہد اعظم کی شہادت کے بعد محمد عباس کے جہاد کونسل اور محمد قاسم بن عطاء الدین معروف بہ قاسم راجا کی مجاہد پارٹی کے درمیان مخاصمت وعداوت کا دورہ پڑ چکا تھا، راجا صاحب نے جہاد کونسل کے خلاف علانیہ جنگ چھیڑ رکھی تھی، جس کی وجہ سے دونوں دھڑوں کا اتنا نقصان ہوا، جتنا اتنے دنوں تک برمی اوباشوں کی وجہ سے بھی نہیں ہوا تھا، باوجود یکہ ان دونوں دھڑوں کے درمیان پائی جانے والی عداوت ومخاصمت کو سنجیدگی کے ساتھ ختم کرنے کی کوشش کی گئی، مگر ناکامی ہوگئی تھی، راجا صاحب نے مجاہد اعظم کی شہادت کے حوالے سے ان کے خون کی قصاص کی شرط ٹھان لی تھی، جو بظاہر محمد عباس صاحب کے لئے بڑا مشکل کام تھا، ان دونوں دھڑوں کے درمیان مخاصمت کی بظاہر یہی وجہ تھی، جس نے آگے چل کر دونوں کو قتل وخون کی دہلیز پر لا کھڑا کر دیا تھا، جہاں تک پتہ چلا کر مرحوم عباس صاحب ایک سنجیدہ، دور اندیش اور قوم کے خیر خواہ انسان تھے، اور ان کی کارکردگی میں سیاسی اور تحریکی نقطۂ نظر سے بڑی خوبی تھی، ان دونوں دھڑوں کی باہمی مخاصمت کو چھوڑ کر قاسم صاحب کا دور جہاد کو بھی بعض حیثیت سے مثالی دور کہا جا سکتا ہے، یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ راجا صاحب ذاتی طور پر قدرے جذباتی، منفعل اور آزاد مشرب کے انسان تھے، چڑھاوا ان کے لئے قدرے موثر علاج تھا، یہ سب کچھ ہونے کے باوجود وہ فوجی وعسکری نقطۂ نظر سے ایک مثالی انسان تھے، وہ آمر تھے مگر بڑے بہادر اور جری، اس حیثیت سے اگر چہ کہا جا سکتا ہے کہ یہاں جمہوریت اور عوامیت کی ساری خصوصیات رخصت ہو چکی تھیں، لیکن یہ بھی سچ ہے کہ راجا صاحب کے دور میں شمالی مغربی ارکان کے اکثر علاقے ایک مدت تک ان کے تصرف میں

تھے، ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اس علاقہ میں وہ یہ برداشت کرنے کے حامی نہ رہے کہ ان کے جیتے جی اور کوئی راجا ہونے کا دعوی کرے، جبکہ عباس والے ان کے اس رجحان کے سخت مخالف تھے، تو وجہ یہی بھی تھی کہ آگے چل کر انہوں نے عباسی دور کے جہاد کونسل سے سخت مخاصمت شروع کر دی تھی، حتی کہ عباس کے حامیوں کو اکثر علاقے سے بے دخل ہونے پر مجبور کر دیا تھا، ان دونوں تنظیموں کے درمیان ہونے والے حملوں اور جوابی حملوں کی وجہ سے نہ صرف جہاد کونسل بلکہ مجاہد پارٹی بھی اپنی معنویت کھو چکی تھی، اور مجاہدین کے دونوں دھڑے قسما نا کارے اور کھوکھلے ہو چکے تھے، اس مخاصمت کی وجہ سے قوم میں بے دلی، مایوسی اور اداسی چھا گئی تھی، اور دشمن نے اس صورت حال سے خوب خوب فائدہ اٹھایا تھا۔

یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی تحریک میں صحیح معنی میں روح لانے کی کوشش تو کی گئی، مگر رائگاں ہوگئی تھی، بعض دردمند افراد نے ان دونوں دھڑوں کے درمیان ہم آہنگی اور اتحاد پیدا کرنے اور تحریک میں اسلامی روح پھونکنے کی جان توڑ کوشش کی تھی، لیکن دشمن نے ان کو بامعنی ہونے نہیں دیا، ویسے خود ان دونوں دھڑوں کے اندر بھی وہ باصلاحیت، کام سے لگن رکھنے والی مثبت اور مستند شخصیات ابھر نہ سکیں، جس کی آواز میں پوری قوم لبیک کہہ سکتی ہو، پھر دوسری طرف قوم میں وہی مایوسی، وہی اداسی جس کے متعلق عرض کی گئی تھی، اور جس کے نتیجے میں قوم نے اس حال میں اپنے مستقبل کو اندھیرا پایا تو تحریک آزادی کی ساری جدوجہد نامراد اور بے ثمر ہو چکی تھی۔

لیکن اب بھی برما میں جمہوری نظام حکومت کا دور تھا، اونو حکومت نے روہنگیا مسلمانوں کے خلاف سازش پر سازش، پروپیگنڈوں پر پروپیگنڈے، فوج کشی پر فوج کشی کے ساتھ ساتھ روہنگیا عوام کو اپنے جھانسے میں پوری طرح پھنسا لیا تھا، اس نے عوام کی دلچسپی کو بھانپ کر وقتی طور پر خیر خواہی کا دم بھرا، ویسے مایو فرنٹیر اڈمنسٹریشن کی شکل میں ایک زمانہ ایسا بھی آیا کہ روہنگیا عوام اس کی ظاہری خیر خواہی پر مدہوش ہونے لگے تھے، تو ایک یہ وجہ بھی تھی کہ روہنگیا مجاہدین کی تحریک عوامی سطح پر غیر موثر ہوگئی تھی، ادھر مجاہدین کی نااہلیت اور بچپنا ہٹ، ان کی روح جہاد اور طبیعت سیاست سے ناآشنائی تو ادھر حکومت کی کامیاب سازش اور جھانسہ دہی نے تحریک کو کھوکھلی کر دی تھی، ان ساری چیزوں نے تحریک آزادی جو ایک بلند وبرتر مقصد اور عالی نصب العین کے تحت شروع ہوئی تھی کو ناکامی کے تنگ اور مہیب غار میں

دھکیل دیا تھا، باوجودیکہ بعد میں آنے والے لوگوں میں قدرے باصلاحیت دوایک انسان بھی نکلے تھے، مگران کو بھی جدوجہد کے ہر میدان میں ناکامی اور نامرادی کا چہرہ دیکھنا پڑا تھا، ایسے میں تحریک آزادی کے اس سلسلے کے اندر روشن، بامقصد اور بلند نصب العین کا از حد فقدان ہوگیا تھا، جو پچھلوں کے دور میں کچھ نہ کچھ تھا، اول اول تو روہنگیا مسلمانوں کی نجات کے حوالے سے صرف ایک ہی تحریک یا ایک ہی تنظیم تھی، لیکن اب اس کی حالت درجنوں تنظیموں میں تبدیل ہوگئی تھی۔

۱۹۶۲ء میں برما کے مشہور آمر اور سفاک جنرل نیون کا دور شروع ہوا تو ملک میں روہنگیا مسلمانوں کا جینا دوبھر ہوگیا یا کردیا گیا تھا، انسانیت کے اس باغی فوجی حکومت نے روہنگیا مسلمانوں کے خلاف وہ سارا حربہ استعمال کرنا شروع کردیا تھا، جس کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں، اب روہنگیا مسلمان جنرل نیون کی منفی سیاست کے ایک مہیب غار میں پھنس گئے تھے، نہ ان کی کوئی ایک ایسی تنظیم تھی جو ان کو منزل کی اگرچہ دھندلی سی کیوں نہ ہو روشنی دکھا سکتی ہو، نہ ان میں ایک ایسی شخصیت تھی جو ان کو اس مصیبت کے حالات میں رہبر منزل کا کام دے سکتی ہو، بالآخر روہنگیا مسلمان اپنے بچھی کچھی ساری استعداد اور صلاحیت کو کھو کر اپنے مستقبل سے یکسر مایوس ہوگئے تھے، ایسے میں محمد جعفر ثانی کا دور شروع ہوتا ہے، جن کا یہ دور جہاد ایک یادگار دور رہا ہے، باوجودیکہ انہوں نے محمد قاسم راجا اور ان کے بعد پیدا ہونے والی بعض شخصیات کی نقالی کی تھی (یاد رہے کہ بعض وجوہات کی بنیاد پر اس کی ضرورت بھی تھی) لیکن ان کی اس تحریک نے تحریک آزادی کو موت کے اندھیرے غار میں گر جانے سے بچالیا تھا، اگرچہ بعض نقطۂ نظر سے ان کی تحریک ایک غیر مثبت تحریک تھی، مگر اس تحریک کے دور اواخر میں ایسے چند انسانوں کی شمولیت ہوگئی جنہوں نے آگے چل کر تحریک آزادی میں جان ڈالنے کی صحیح کوشش کی تھی، جن میں حضرت مرحوم محمد جعفر حبیب صاحب علی چنگی اور مرحوم شیر حسین صاحب فوئما لوی قابل ذکر ہیں۔

ہماری تحریک آزادی کی تاریخ میں ۱۹۷۳ء کے بعد وہ روشن دور شروع ہوا، جس سے ایک بار پھر سے امید کی کرن دکھائی دی تھی، جس دور کی روح رواں محمد جعفر حبیب مرحوم تھے، مرحوم نے ہماری تحریک آزادی کے پچھلوں کی سیاسی اور انقلابی تاریخ اور ان کی زندگی، سرگرمی اور کردار سے خوب خوب فائدہ اٹھایا تھا، انہوں نے تحریک کے اس طویل سلسلے سے خود بھی درس عبرت لیا اور اپنے ہم نواؤں اور جان

نثاروں کو بھی درس دینے کی کوشش کی، صحیح معنی میں انہوں نے اب کی تحریکی جسم میں ملک وملت اور وطن مقدس کی خیر خواہی اور خیر سگالی کی روح پھونکی، قوم کے بعض حساس، ذی شعور اور ایک حد تک بامقصد افراد کو اپنے گرد جمع کرلیا تھا، انہوں نے ایسے چند افراد تیار کرلئے تھے، جنہوں نے اپنی قوم اور وطنِ عزیز پر فدا ہوکر ہماری اگلی نسل کے لئے بیاباں کی شب تاریک میں کسی حد تک قندیل نورانی کا کام دیا تھا۔

اس دعوی سے میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ سیاسی اور انقلابی نقطۂ نظر سے محمد جعفر حبیب کا دور اور ان کی جمیع کارکردگی اور سرگرمی تنقید سے بالاتر ہے، مگر سچ تو یہ ہے کہ وہ اور ان کے بعض رفقائے کار کی دلسوزی اور درد و دھڑکن نے قوم کی اس طویل اداسی اور مسلسل مایوسی کو ایک بار چیلنج کردیا تھا، خزاں کے مارے ہوئے ہماری سیاست و انقلاب کے اس تپتے ہوئے ریگستان میں پھر سے بہار کی امید پیدا ہوگئی تھی، قوم کے تن مردہ میں پھر سے زندگی کی لہر دوڑ گئی تھی، پوری قوم اچانک غفلت کی نیند سے بیدار ہوکر روشنی اور جو منزل کی طلب گار ہوئے منزل کی طرف رواں دواں ہوچکی تھی، یہ ایک ایسا بہار کا موسم تھا، جو قوم کی تاریخ ہمیشہ یاد کرتی رہے گی۔

لیکن افسوس ہے کہ ہماری داخلی اور خارجی سازشی سیاست کی کرم فرمائی دیکھئے، یا اسے ہماری بدقسمتی اور بعض افراد کی سوئے نیتی کہہ لیجئے کہ جس کی لپیٹ میں خود مجدد تحریک محمد حبیب آگئے، حالت ایسی ہوئی یا کردی گئی کہ جس نے قائد کے دل کو چیر کر پارہ پارہ کردیا، پھر وقت کے ساتھ ساتھ انہیں اپنے سایہ نے بھی چھوڑ دیا تھا، ان کے بعض حامیوں اور جان نثاروں کو بھی نفس وشیطان کی معاون عفریت نے جہنم میں دھکیل دیا تھا، یہ وہ جہنم تھی جس نے ہماری قومی تحریک کے پچھلوں کو جلا کر راکھ کر ڈالا تھا، پھر بھی قائد حبیب اور ان کے چند ایک ساتھیوں اور ہم نواؤں نے حالات اور وقت کے تیز و تند دھاروں سے مقابلہ کیا اور ضرور کیا، لیکن وہ آخر کار معرکہ کرب وبلا میں بازی ہار گئے تھے، ویسی ظاہری کامیابی صرف اور صرف دشمن اور اس کے شعوری یا غیر شعوری چیلوں کی ہوئی تھی۔

محمد جعفر حبیب نے قوم کے بعض حساس اور ذی شعور افراد کو ایک جماعت کی پرچم تلے جمع کرلیا تھا، لیکن ہماری بدقسمتی کا یہ عالم تھا کہ دشمن ظالموں نے اسے ٹکرے ٹکڑے کردیا اور اتحاد وہم آہنگی کی اس روشنی کو پھر سے مایوسی اور اداسی کی تنگ وتاریک دیوار میں بند کردیا تھا، اس کے بعد آج تک قوم کی اس

سنہری داستان کو نہ دھرایا جاسکا، جس کا سلسلہ محمد جعفر حسین قوال نے شروع کیا اور محمد جعفر حبیب نے جس میں تجدیدی خدمات انجام دی تھیں۔

اس حوالے سے بات یہ ہے کہ ہماری تحریک آزادی کے اس طویل سلسلہ میں یعنی کم سے کم محمد جعفر حسین قوال سے لے کر محمد جعفر حبیب مرحوم تک چند منظمات جو دیکھی گئیں، ان سب میں ایک بات یہ مشترک تھی کہ ان سب کے کردار و عمل کے علی الرغم نصب العین اور مقاصد میں کوئی تضاد نہیں تھا، یعنی افکار و آراء میں حیرت انگیز ہم آہنگی تھی، تاہم یہ تو سچ ہے کہ ان کے نصب العین پر سیاسی و اخلاقی نقطۂ نظر سے تنقیدی نظر ضرور ڈالی جاسکتی ہے، لیکن محمد جعفر حبیب کے بعد تحریک میں آنے والے قائدین میں وہ یک جہتی و ہم آہنگی باقی نہ رہ سکی، جو اس سے پہلے تھی، حتی کہ ہماری اس تحریک کے سلسلے میں ایسے نظریے کے حامل افراد بھی دیکھے گئے اور اب میں دیکھے جاسکتے ہیں کہ جن کے افکار و خیالات نہ صرف قومی و ملی اعتبار سے مضر ہیں بلکہ اسلامی افکار و نظریات کے اعتبار ے زہر ہلاہل سے بھی کم نہیں۔

اب روہنگیا مسلمانوں کو یاد رکھنا ہے کہ قوم، مذہب، تہذیب وثقافت مسلمانوں کے نزدیک دو یا متضاد چیز نہیں ہوتی ہے، تہذیب اور کلچر مذہب کے بغیر ہو تو اس میں جسم تو ہوسکتا ہے مگر روح نہیں ہوسکتی، تہذیب و کلچر کو مذہب کی روح سے ہم آہنگ کئے بغیر روہنگیا مسلمانوں کی بقا ممکن نہیں، اگر بقا کسی معنی میں ممکن ہے تو ایسی بقا کو بقا کہنے سے زیادہ موت سے تعبیر کرنا چاہئے، کیوں کہ مذہب میں ان دونوں کی وجود ہی علت اور ماخذ اصلی ہوسکتا ہے۔

اب ہمارے روہنگیا مسلمانوں کے قائدین اور مستقبل میں متوقع پیدا ہونے والی جماعتوں سے درخواست رہے گی کہ ہمارے مابین پائے جانے والے کبر و نخوت، غرور و پندار، عیب جوئی و جاہ طلبی، انانیت اور خود غرضی کی ساری روایات کو یک سر ختم کرنے کی کوشش کی جائے، اور ہماری جماعت کی اولین وصف یہی ہو کہ اس کے افراد اور شرکاء آپس میں الفت و محبت سے کام لیا کریں، اسلام میں پائی جانے والی ہمدردی و ایثار، فدائیت وللّٰہیت کی روایات کو پھر سے زندہ کر دیا جائے، یاد رہے کہ دلوں کو جوڑنے والی چیزوں میں سب سے بڑی چیز آپس کی خیر خواہی اور مخلصانہ برتاؤ ہے، اور ساتھ ہی ساتھ نفرت و عداوت، منافقانہ میل جول اور خود غرضانہ اتحاد و اتفاق سے پہلو تہی بھی لازمی چیز ہے، اور

مستقبل میں کوشش کی جائے کہ جماعت میں با مقصد اور باصلاحیت افراد کی شمولیت ممکن ہو، جن میں اخلاص وللّٰہیت، ایثار و قربانی کی روح ہمیشہ رواں رہے، اگر ایسے افراد جماعت میں شامل ہو جائیں تو یہ جماعت ایک با مقصد جماعت بن جائے گی، جس میں شگاف ڈالنے والے شیاطین راہ نہیں پاسکیں گے، اور وہ ایسی ایک جماعت ہوگی کہ جس کے وجود سے قوم میں بلند خیالی، اسلامی جوش وخروش، ولولہ و حرکت، آزادی سے محبت اور غلامی سے بغاوت ونفرت کے جذبات پیدا ہوں گے، ویسے ملک وقوم اپنی گردن پر پڑی ہوئی غلامی کی پرانی زنجیر کٹ سکے گی، یہ وہ غلامی ہے کہ جس سے ہماری قوم کو بہت دکھ پہنچایا گیا اور اب بھی جارہا ہے۔

افراد پر محنت لازمی امر ہے

انسانی زندگی کے سفر میں بارہا تجربہ ہوا ہے کہ کسی مسئلہ کا پیدا کہیں اور جگہ ہوتا ہے اور اس کے حل کا راز کہیں دوسری جگہ چھپا ہوا ہوتا ہے، اس تجربہ کی بنیاد پر ہم روہنگیا مسلمانوں کے مسائل اور ان کے حل کے اسباب پر عرصۂ دراز سے سوچتے رہے ہیں، ادھر خرابی نظر آتی ہے تو اس خرابی کے اسباب دوسری جگہ چھپے ہوئے نظر آتے ہیں، جس طرح لوگ کہتے ہیں کہ جب تک تنظیموں اور تنظیموں کے قائدین کے مابین اتحاد عمل میں نہ آیا تو کبھی بھی ہمارے مسائل حل نہیں ہو سکتے، میں اس بات کو جزوی طور پر صحیح مانتا ہوں، میری نظر اتحاد اور یک جہتی پر ہے اور ضرور ہے، لیکن سوچنا یہ ہے کہ آخر اتحاد و یک جہتی کیوں نہ ہو پاتی، یا کبھی اتحاد و یک جہتی عمل میں آتی تو وہ اچانک ٹوٹتی کیوں ہے؟ دراصل بات یہی ہے کہ اتحاد کرنے والے افراد کے دل درست نہیں ہوتے ہیں، ان کا دل و دماغ روح وشعور، جذبات و احساسات جب تک درست نہیں ہوں گے تب تک ان کے اجتماعی معاملات میں خلل ہوتا رہے گا۔

یوں تو ہر روہنگیا مسلمان دیکھتا ہے کہ قوم کے اندر اتحاد و اتفاق، ہم آہنگی و یک جہتی کا شدید فقدان ہے، قوم پر عرصۂ دراز سے ظلم وستم کی بارش برس رہی ہے، کہیں سے بھی اجتماعی اور صحیح معنی پر اجتماعی آواز سنائی نہیں دیتی، حتی کہ لوگ آپس کے اختلافات کی وجہ سے غیروں تک سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں، ایسی حالت کو دیکھ کر اہل دل تڑپ کر رہ جاتا ہے، اس کے اندر مسائل کے حل کے لئے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں، ویسے اس کے لئے اجتماع اور کنونشن کی اصطلاحات میں سوچنے لگتے ہیں، اور کبھی کبھار یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ قوم کے معمر افراد کو جمع کیا گیا، اور قراردادیں پاس کی گئیں، مگر یہ سب کچھ ہونے کے باوجود آخر مسائل دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں، آخر یہ کیوں؟

بات اصل میں یہ ہے کہ جن افراد کو ایک ہی جگہ پر جمع کیا گیا تھا، وہ افراد فکری اور روحانی طور پر بنے سنورے ہوئے نہیں تھے، یاد رہے کہ صرف بیماری کی علامتوں پر محنت کرنے سے مرض ختم نہیں ہوتا،

بلکہ امراض کے اسباب وعلل پر نظر ڈالنے اور ان کی صحیح تشخیص کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

تو میری عرض ہے کہ ہمیں اپنے اہداف ونشانے پر پہنچنے کے لئے سب سے پہلے فرد کی بیماریوں کی تشخیص ضروری ہے، جس کے بعد قومی سطح پر اتحاد و اتفاق کا نشانہ لیا جا سکتا ہے، مطلب یہی ہے کہ پھل پر محنت کرنے سے پہلے زمین اور بیج پر محنت ایک لازمی امر ہے، جس کے بعد صحیح پھل کی امید باندھی جاسکتی ہے۔

زندگی کے معاملات، اجتماعی ہوں یا انفرادی، انہیں درست کرنے کے لئے حالات اور وسائل پر جائزہ بہت ضروری ہے، جس کے بعد صحیح رخ کی طرف زندگی دوڑ سکتی ہے، وقتی جذبات سرگرم عمل انسان کو کبھی کامیاب نہیں کر سکتا، ہمیں اپنے مسائل ضرور حل کرنے ہیں، مگر درست طریقہ پر اور صحیح سمت سے، اصل مرض کی تشخیص کے بغیر یونہی تڑپنے چلانے سے مرض ختم نہیں ہوسکتا، اور نہ ہی ہماری قومی بیماری راتوں رات ختم ہوسکتی ہے، اس مرض کی تشخیص کرنے کے بعد ایک طویل اور صبر آزما علاج لازمی امر ہے۔

شاید دور حاضر میں جماعت تبلیغ کی فکر اس سمت چل رہی ہے، حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے متبعین شاید اس پر سوچ رہے تھے، ہمارے مسلم معاشرہ میں ہر کجا فساد اور بگاڑ ہے، اس اجتماعی بگاڑ کا سبب فرد کی سطح پر بگاڑ ہے، ان کا نقطۂ نظر یہی ہے کہ جب تک فرد کے حالات دینی اور روحانی اعتبار سے درست نہ ہو جائے، تب تک اجتماعی حالات درست ہونے کا امکان نہیں ہے، اسی لئے ان کے مطابق فرد پر محنت بڑی ضروری ہے۔

اس طرح اس احساس کا مظہر میں نے اپنے معاشرہ کو بھی پایا، ہمارے قومی معاشرہ تب تک درست نہیں ہوسکتا، جب تک ہمارے انفرادی حالات درست نہ ہو جائیں۔

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کے اندر استعداد کی اتنی کمی نہیں ہوتی جتنی مستقل ارادے کی ہوتی ہے، ہماری قومی زندگی میں مستقل مزاجی کا بڑا فقدان نظر آتا ہے، صلاحیت واستعداد کے ہوتے ہوئے بھی انسان اپنی زندگی میں تب تک فائدہ نہیں پاسکتا، جب تک ان کے اندر قوتِ استقلالی اور پیہم عمل کا مزاج پروان نہ چڑھا ہو، کسی بھی حقیقی کامرانی کے لئے طویل اور فیصلہ کن جدوجہد کی اہمیت سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا، اگر ٹھوس اور معنی خیز نتیجہ دیکھنا ہو تو انسان کو اپنی عملی زندگی میں پہلے ہی دیکھ لینا ضروری ہے کہ آیا وہ ایک طویل مدت تک انتظار کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے یا نہیں، ایک پائدار نتیجہ اور پائدار

کامیابی ایک طویل مدت کے انتظار پر منحصر ہے، لمبے انتظار کے بغیر تعمیر وترقی کا قلعہ کبھی بھی نہیں بن سکتا۔
میں سمجھتا ہوں کہ روہنگیا مسلمانوں اور وطن عزیز کے پائدار ''تعمیر نو'' آج کل کے حالات کے پیش نظر تھوڑے سے وقت میں ممکن نہیں ہے، آج کے بعد اچانک اور اتفاقی طور پر حالات پیدا ہو گئے ہوں تو وہ دوسری بات ہے، اس موقع پر میں بتانا چاہتا ہوں کہ قوم کی تعمیر نو سے پہلے قیادت کی تعمیر نو کی اہمیت سب سے لازمی اور اہم چیز ہے، جب تک انفرادی طور پر افراد کی تعمیر نو نہیں ہوگی، تب تک قوم کی تعمیر نو کا خیال بے معنی ہے، جس کے لئے لازمی اور حتمی طور پر طویل منصوبہ بندی درکار ہے، اور یاد رہے کہ ملک وقوم کی تعمیر افراد کی تعمیر پر منحصر ہے، ایک ایک فرد کو علمی وعملی، دینی وروحانی طور پر تعمیر کرنا ہوگا، اور یاد رہے کہ حقیقی انسانیت کے درجے پر پہنچنے کا نام تعمیر ملک وقوم ہے۔
ہمارے قومی رہنماؤں کا حال یہ ہے کہ وہ اپنی خام خیالی یا خوش فہمی کی بنیاد پر منزل پر پہنچنے کے لئے مختصر راستہ تلاش کرنے پر تلے ہوئے ہیں، آج ہم اپنی قوم کو جن حالات کی شکار پا رہے ہیں، ان کے پیش نظر منزل تک پہنچنے کے لئے میرے خیال میں طول طویل راستے کا انتخاب ضروری ہے، اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ منزل پر پہنچنے کے لئے صرف راستے کا انتخاب کافی نہیں ہوتا، بلکہ جس سواری پر سوار ہو کر وہ طویل راستے سر کرنا چاہتے ہیں، اس کی صلاحیت واستعداد کی طرف دیکھنا بھی ایک ناگزیر امر ہوتا ہے۔ یاد رہے کہ بسا اوقات انسان کے لئے قریب کا راستہ دور ہوتا ہے اور طویل کا راستہ قریب، راستے کا صحیح صحیح انتخاب بھی از بس ضروری اور لازمی امر ہے۔

طویل المدتی پروگرام کی اہمیت

ملت اسلامیہ ارکان کی نئی تعمیر وترقی کے لئے ایک طویل المدتی پروگرام یا طویل المیعاد منصوبہ بندی کی ضرورت بڑی حد تک محسوس کی جا رہی ہے، ایک واضح حقیقت ہے کہ فرد اور اجتماع کی سطح پر بے حد وحساب عوامل فراہم کرنے کے بعد ایک وقت ایسا ہوتا یا ہو سکتا ہے کہ جب ملتِ اسلامیہ ارکان اپنی پوری شوکت وشان کے ساتھ زندہ اور درخشندہ ہو، اور روہنگیا قوم ایک طاقتور قوم کی حیثیت سے سرزمین ارکان میں اپنی جائز جگہ یا جائز مقام حاصل کرے، میں نے اپنی زندگی میں بعض احباب اور دوستوں کے سامنے اس بات کو بار بار دہرایا تھا، مگر بسا اوقات وہ دوست جو زیادہ سے زیادہ سوچ رکھنے کے قابل سمجھا جا رہا تھا فوراً یہ کہہ کر شور مچا دیتا ہے کہ بھائی صاحب! وہ تو بڑا طویل منصوبہ ہے، جسے پورا کرنے میں سو سال سے زیادہ وقت کی ضرورت ہے، ہمیں بس ایسا پروگرام چاہئے جس پر عمل درآمد کے بعد ہماری منزل بالکل سامنے عیاں ہو جائے، مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ روہنگیا مسلمانوں نے ماضی میں ایسے کثیر المدتی پروگرام بہت بنائے تھے، مگر کامیابی کتنی ہوئی، وہ بھی سورج کی طرح عیاں ہے۔
لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ ملتِ اسلامیہ ارکان کو پھر سے اپنی زمین میں درخشاں کرنے کے لئے قومی سطح پر ایک طویل المدتی پروگرام کا اپنانا وقت کی ضرورت ہے، تاہم یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ اس طویل المدتی پروگرام کے ذیل میں کچھ قصیر المدتی پروگرام بھی اپنائے جائیں، مگر نشانہ جو مطلوب ہوگا یا ہے، اسے نظر میں عیاں رکھنا ضروری ہے، اور ہوگا، ورنہ صرف قصیر المدتی پروگرام کے ذریعے ہماری قوم کی جو حالت ہے، اس میں کامیابی کی توقع کبھی نہیں کی جا سکتی، سچ تو یہ ہے کہ صرف اور صرف قصیر المدتی پروگرام کے ذریعے کامیابی کی توقع بالکل نہیں کی جا سکتی، صرف قصیر المدتی پروگرام کے ذریعے اپنے نشانے پر پہنچنے کا عزم صرف اور صرف یہی ہو سکتا ہے کہ قوم اپنے سنہرے موقع کو مزید ضائع کر دے۔ ایسے پروگراموں کے ذریعے ملتِ اسلامیہ کا قلعہ اپنی مضبوطی کے ساتھ کبھی بھی قائم نہیں ہو سکتا، اور نہ

صرف ویسے پروگراموں کے ذریعےقوم کے اندر انقلاب برپا کیا جاسکتا ہے، یہ سچ ہے کہ طویل المدتی پروگرام کو کامیابی سے ہم کنار کرنے کے لئے طویل اور صبر آزما سفر کی نہایت ضرورت ہوگی، جس میں طویل منصوبہ بندی اور سخت جانفشانی کی ضرورت بھی ہوگی، اور جس کے لئے قوم کے بعض دانشمند افراد کی پوری ہم آہنگی اور مکمل یک جہتی کی ضرورت بھی ہوگی۔

ظاہر ہے کہ ایسے نشانے پر پہنچنے کے لئے اجتماعی اقدام کی ضرورت بھی ہے، اور اجتماعی اقدام کے لئے اجتماعی قیادت بھی ناگزیر ہے، یعنی اجتماعی قیادت کے بغیر ایک اجتماعی اقدام کا خیال کرنا جوئے شیر لانے کا مترادف ہے، جس میں سراسر ناکامی کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ بڑی کامیابی کے لئے انسان کو بڑا منصوبہ کرنا ہوتا ہے، کوئی بھی آدمی ایک بڑی کامیابی حاصل کرنے کا درپئے ہو تو اس کے لئے ضروری ہے کہ ایک بڑے منصوبہ کے تمام تقاضوں کو پورا کرے، اس کے بعد صحیح نشانے پر پہنچ سکتا ہے، پھر یاد رہے کہ ناامیدی انسان کے لئے زہر ہلاہل سے کم نہیں ہے، انسان منصوبے کے تمام تقاضوں کو پورا کرنے کے بعد اگر کہیں جا کر وقتی ناامیدی ہوگئی تو اس وقت بھی نشانے پر پہنچ نہیں سکتا، یہ ایک کلیہ ہے کہ مسائل کے مقابلے میں ان کے حل کی طاقت زیادہ ہوتی ہے، مطلب یہ ہے کہ مسائل انسانی زندگی کے معاملات میں محدود ہوتے ہیں، جبکہ ان کا حل اور طریقۂ حل لامحدود، منصوبہ بندی پھر اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے بعد عزم مسلم سے کام لیا جائے تو انسان ایسے ایسے مسائل حل کرسکتا ہے، جو بڑے کٹھن اور پہاڑوں کی طرح مستقل تھے۔

قومی زندگی کے اس طویل دوڑ میں کمتر تیاری اور سرسری منصوبہ بندی کے ناطے روہنگیا قوم کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوسکی اور نہیں ہوسکتی، یوں پوری قوم عرصہ دراز سے محرومی اور کمتری کی شکار ہے، اور اب بھی کمتر تیاری اور سرسری منصوبہ بندی اور اس پر عمل درآمد کی وجہ سے ہمیشہ کے لئے ناکام اور نامراد رہ جائے گی۔

انسان کو وقت وفضا اور ماحول سے ناجائز امید نہیں رکھنا چاہئے، اور نہ اپنی نالائقی کی وجہ سے ناکامی پر شکوہ کرنا چاہیے، یہ دنیا ہے آخر دنیا، اس میں وہ انسان یا وہ قوم کامیابی کی منزل پر پہنچ سکتی ہے جو ایک منصوبہ بند طریقہ پر عمل درآمد کرے۔ یاد رہے کہ ایک قوم کی تعمیر نو کے لئے سو سالہ محنت کچھ بھی نہیں ہے، بننے بنانے کے لئے ایک معقول وقت کی ضرورت ہے، یوں تو ہمیں خود بننے اور دوسروں کو بنانے

کا شدید احساس ہے، لیکن کم لوگوں کو اس کے طریقہ کار سے واقفیت ہوتی ہے۔

یہ قدرت کا نظام ہے کہ ہر مفید چیز کسی مشقت کے بعد ظہور میں آتی ہے، اس لئے کسی کام کی منصوبہ بندی کے وقت اپنے اولوالعزم افراد کی ضرورت ہوتی ہے، جو جہد پیہم میں مسلسل برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں، بسا اوقات آدمی کی ناکامی اس وقت ہوتی ہے کہ وہ جب کام کے ساتھ ساتھ فوری کامیابی کی امید باندھ لیتا ہے، بہت سے عقلاء کو اس حوالے سے دیکھا گیا ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی میں اس ناموافق پروگرام کو دہرایا تھا، جس کے نتیجے میں انہیں ناکامی اور نامرادی کا چہرہ دیکھنا پڑا، بالآخر وہ ایسے انجام سے دوچار ہوئے، جس طرح ان کے بخلاف احمق آدمی دوچار ہوتے ہیں۔

ہماری الٹی چھلانگ

زندگی کے بازار میں یہ ایک اصول ہے کہ کسی بھی کام کو آغاز ہی سے شروع کرنا پڑتا ہے، انسانی زندگی میں کبھی ایسا نہیں ہوا ہے کہ بڑھاپے سے کوئی آدمی بچہ بنا ہو، بلکہ اس کے برخلاف بچے سے انسان اپنی زندگی کے طویل مراحل سے گزر کر بڑھاپے کے مرحلہ میں داخل ہوا، اس چھوٹی سی تمہید کے بعد کہنا چاہتا ہوں کہ ہم نے اپنی سیاسی زندگی میں یہی دیکھا اور تجربہ کیا ہے کہ ہمارے قومی ،سیاسی وانقلابی دور کا آغاز ہی الٹی چھلانگ سے شروع کر دیا گیا تھا۔ دنیا میں کہیں بھی ایسا نہیں ہوا ہے کہ دیوار سے پہلے کسی مکان کی چھت تیار کی گئی ہو، چھت ہمیشہ دیوار بننے کے بعد بنتی ہے، ہم اسی اصول اور قواعد کی بنیاد پر حتمی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ ہماری سیاسی، ثقافتی اور قومی زندگی کے ڈھانچے تیار کرنے ہیں تو ہمیں ابتدا میں ایسے پتے کے افراد کی ضرورت ہوگی، جو اس ڈھانچے کی تعمیر کے لئے پورے مستعد اور تیار ہوں، جس کے لئے سب سے ضروری ہے کہ قوم کے اندر تعلیم اور تربیت کے پروگراموں کو فروغ دیا جائے، میری قوم گئی صدی کے نصف اول سے لے کر انقلاب کا نام سنتی آرہی ہے، مگر ظاہر ہے کہ یہ انقلاب بحیثیت انقلاب کے ابتدائی کامیابی سے بھی ہم کنار نہیں ہوسکی، اس ناکامی اور نامرادی کا سب سے بڑا سبب میری نظر میں یہی ہے کہ قوم میں ایسے مستعد اور اپنی منزل سے باخبر تعلیم یافتہ افراد کی شدید قلت تھی اور اب میں ہے، جو اپنی تعمیر و ترقی کے لئے لگن رکھنے والے ہوں، تو بات یہی ہے کہ ماضی میں ہم نے افراد کی تعمیر سے پہلے اپنی قوم کو کامیابی اور کامرانی سے ہم کنار کرنا چاہا، جس میں ہماری ناکامی کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔

آج کل میری قوم جس ذلت و نامرادی سے دوچار ہے، وہ تو ظاہر ہے، ایک طرف قوم کے سر پر زبردست اداسی اور مہیب مایوسی کی بدلی چھائی ہوئی ہے، پھر دوسری طرف اعلی قیادت حتمی طور پر اپنے مستقبل کا ایک اصولی لائحہ عمل پیش کرنے سے قاصر، اب ایسے افراد بھی میدان میں نہیں رہے جو اپنی قوم پر سوچے سمجھے اور اس کی ذلت و بربادی کی صحیح صحیح تشخیص کرتے ہوئے علاج و معالجہ کی کوشش میں لگ جائیں، آخر یہ کیوں ہے؟ کیا پوری قوم میں حقیقتاً رجال کار کی کمی ہے؟ نہیں بلکہ یہاں رجال

کار گویا کہ عنقا ہے، تو وجہ یہی ہے کہ ہماری قیادت اپنی نسل میں نتیجہ خیز تعلیم و تربیت کو فروغ دینے میں قاصر رہی تھی، جس کی وجہ سے آج قوم اس ذلت و نامرادی کی شکار ہے۔

ادھر طرفہ یہی ہوا ہے کہ میری اپنی قوم میں مستعد اور باصلاحیت افراد کی کمی کے اس عالم میں ہم نے ایسا قومی اقدام بھی کر ڈالا جس کی وجہ سے ہم مزید ناکام اور نامراد ہوگئے، غرض یہ ہے کہ ہم نے جس طرح عرض کی گئی ہے کہ دیوار بننے سے پہلے چھت کی تعمیر کی کوشش کی تھی، یعنی افراد کی تربیت و تعمیر سے پہلے قوم کو ترقی دینے اور اسے ایک زندہ قوم ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی تھی، جس میں ہمیں بربادی اور نامرادی کے علاوہ اور کچھ حاصل نہ ہوا، اب ہمیں چاہئے کہ اپنی قوم کی تعمیر کے لئے افراد کی تربیت و تعلیم ،نشوونما پر لگ جائیں، ورنہ بصورت دیگر ہماری نامرادی کا دن ختم ہونے والا نہیں ہے۔

اور جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ زندگی کے بازار میں ایک ہی چھلانگ سے انسان کامیاب ہوسکتا ہے، تو ظاہر ہے کہ یہ ایک خوش خیالی ہے، بطور خاص قوم کی تعمیر نو اور ترقی کے میدان میں ایک ہی چھلانگ کا کوئی خاص فائدہ مرتب نہیں ہوتا، فائدہ مرتب کرنا ہے تو اس قوم کے افراد کو صبر و استقلال کا خاص مظاہرہ کرنا ہوتا ہے، جس کے بعد قوم ایک منزل پر پہنچ سکتی ہے۔

لیکن اس وقت یہ بھی یادرہے کہ کسی کام کو اپنے وقت پر نہ کرنا یعنی دیر لگا دینا ایک شدید غلطی ہے، اس طرح کسی کام کو جلد کرنا بھی کبھی کبھار موجب خطا ہوتا ہے۔ ہر کام کی تکمیل کے لئے ایک مقررہ وقت درکار ہے، جس طرح دیر کرنا سستی کی علامت ہے، ٹھیک اس طرح کسی کام کو جلد از جلد کامیابی اور انجام تک پہنچانے کا عمل بے صبری کی علامت ہے۔

جواہر پارے کی قدردانی ہونی چاہئے

جس طرح ہم اپنے بزرگوں سے بڑوں کی عزت وتوقیر کا درس لیتے ہیں، ٹھیک اسی طرح اس بات کے سننے کے متمنی ہیں کہ اپنے چھوٹوں اورعزیزوں کی بھی قدر کرنی چاہئے، انسانی زندگی میں یہ امر واقعی ہے کہ بڑوں کی قدردانی عزیزوں کو آگے بڑھنے کے لئے بڑی مفید چیز ہوتی ہے، یوں ان کی خداداد صلاحیت اور ملکہ کو نمایاں کرنے کے لئے بڑوں کی قدردانی بڑی اہمیت رکھتی ہے، جس معاشرے میں بڑے لوگ جوہر ہونے کی بنیاد پر چھوٹے افراد کی قدر کریں گے، اس معاشرے میں افراد ترقی کے مدارج طے کریں گے، اس کے برخلاف جس معاشرے میں بڑے لوگ صرف اپنے حاضر باشوں اور خوشامدیوں کی قدر کرنا جانیں، وہاں افراد کی صلاحیت اور ملکۂ خداداد مرجھا کر رہ جائے گا، اور موخر الذکر جیسے معاشرہ میں انسان ترقی کے اعلی مدارج پر پہنچ نہیں سکتا۔

ہم اپنے مطالعہ اور تجربہ کی بنیاد پر یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ ہم اپنی قومی سیاست اور رہی سہی شرافت وثقافت کی اس عالم میں بعض ایسے بڑے بڑوں کو دیکھا کہ جنہوں نے اپنے چھوٹوں کی قدردانی نہیں کی، ہماری قومی سیاست کی تاریخ میں ہم نے دیکھا کہ بعض اعلی قیادت نے اپنے عزیزوں جو قوم کے سنہرے مستقبل کے ضامن تھے اور ہو سکتے تھے کی بڑی حد تک ناقدری کی تھی، جس کی وجہ سے ایک طرف ان سیاسی رہنماؤں کی اہمیت وقدر کم ہوگئی تو دوسری طرف اس مسلسل ناقدردانی کی وجہ سے وہ سارے جواہر پارے مایوسی اور کس مپرسی کے شکار ہو کر ضائع ہو گئے تھے، دور آخر میں ہمارے انقلاب کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے ہر کوئی اندازہ کر سکتا ہے کہ ہمارے کتنے ذہین اور کام سے لگن رکھنے والے باصلاحیت افراد دنیا کے مختلف گوشوں میں بکھر کر کس مپرسی کے حالات سے دوچار ہیں، جاپان سے لے کر ولایت متحدہ امریکہ تک اس طرح ممالک عرب کے علاوہ دیگر اسلامی دنیا میں کتنے ہمارے جوہر پارے ذروں کی طرح بکھرے ہوئے ہیں، ان بکھرے ہوؤں کے بیان سننے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں خود اپنے قائدوں اور رہنماؤں نے کام سے کوسوں دور ادھر ادھر بکھرنے پر مجبور

کر دیا ہے، ان کے بیان سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کام سے لگن رکھنے والے تھے، ملتِ اسلامیہ ارکان پر مر مٹنے کے متمنی تھے، یہ ایک بڑا افسوس اور نہایت حسرت کا مقام ہے۔

ظاہر ہے کہ خوشامدیوں کی جھوٹی اور بناوٹی تعریف انسان کو تباہ کر دیتی ہے، تو بات یہی ہے کہ ہمارے بڑے لوگوں میں سے بعض حضرات کو خوشامد پسندی کی بیماری نے کھا لیا تھا، تو اس لئے بڑوں کے لئے ضروری ہے کہ اپنے متبعین میں سے ہر ایک انسان کو خوشامدیوں سے بچائے، ورنہ وہ انسان جو عملی میدان میں کام کا ہو سکتا ہے، وہ کہیں کا نہیں رہے گا، اس لئے کام کے آدمی کو بھی بذات خود خوشامدیوں سے ضرور بچنا چاہئے، ہمارے معاشرے میں صاحب اقتدار جو طرح طرح کے فائدہ پہنچا سکتا ہے، اس کے گرد خوشامدیوں کی ایک جماعت ہو جاتی ہے، اور فائدہ حاصل کرنے کے لئے اس صاحب اقتدار کی تعریف وتوصیف شروع کر دیتی ہے، ویسے اس صاحب اقتدار کی صلاحیت ضائع ہونے کا ایک راستہ تیار ہو جاتا ہے، اس کی اچھی صلاحیت ضائع ہو کر بعد میں خود سمجھنے لگتا ہے کہ ایسا کام اسے نہیں کرنا چاہئے تھا، لطف یہ ہے کہ جب اس کے اقتدار کا دور ختم ہو جاتا ہے تو ان خوشامدیوں کا کہیں پتہ بھی نہیں ملتا ہے، اور موصوف کو بھی تاریکیوں میں ٹامک ٹولیاں مارتا نظر آتا ہے، اس لئے انسان کو سمجھنا چاہئے کہ کسی جنازے میں کرائے کے نوحہ گر بمقابلہ ان کے جو واقعی غم زدہ ہیں زیادہ شور کرتے ہیں، اسی طرح جھوٹی تعریف کرنے والے سچی تعریف کرنے والوں سے بڑھ چڑھ کر زیادہ داد دیتے ہیں، اس لئے چالاک آدمی ان لومڑیوں سے ہمیشہ بچتا رہتا ہے۔

ہمیں ایک با مقصد قافلہ کی ضرورت ہے

یہ ایک لا زوال حقیقت ہے کہ اللہ تعالی نے انسان کو غیر معمولی صلاحیت کے ساتھ پیدا کیا ہے، اور انسان کسی مہیب تاریکی میں بھی اپنی روشنی کا پہلو اور مینار دیکھ سکتا ہے، اور یہی انسان ہی ہے کہ جو قدرت کی بخشی ہوئی صلاحیت سے اپنے نا موافق حالات کو موافق بنا سکتا ہے، اور انسان ہی ہے کہ جو زندگی کے اس دوڑ میں اگر کسی موقع پر ہار جاتا ہے تو جلد ایک نیا دوڑ تیار کرتے ہوئے ایک نیا میدان تلاش کر لیتا ہے، یوں وہ میدان میں طویل کوشش اور پیہم جد وجہد کے ناطے اپنی سنہری اور مطلوبہ منزل کو پہنچ سکتا ہے، زندگی کے اس طویل قومی سفر میں کامیابی کے لئے سب سے بڑی شرط یہی ہوتی ہے کہ زندگی کے کسی ہارے ہوئے میدان میں کبھی بھی مایوس نہ ہو جائے، مایوسی انسانی زندگی کے لئے سب سے بڑی دشمن ہے، اگر کوئی بھی انسان زندگی کے اس مہیب کھیل میں ایک مرتبہ ہار جائے تو اس کے لئے سب سے اہمیت کی چیز یہی ہوتی ہے کہ وہ اپنی اندر کی توانائی اور چھپی ہوئی قوتوں کا از سرِ نو جائزہ لے، پھر اسے ترتیب دے کر میدان جہد وعمل میں اتر جائے۔

میرے نزدیک سب سے بڑا انسان وہی ہے، جو زندگی کے اس وسیع وعریض میدان میں با مقصد زندگی گزارے، اور دوسروں کو گزارنے کے لئے تیار کرے، جو آدمی اپنی زندگی کو ایک مقصد بنا رکھا ہو تو اس کی ساری توجہ اپنے مقصد اور اپنی منزل کی طرف لگی ہونی چاہئے، یوں ایک با مقصد انسان اپنی زندگی کے تمام غیر ضروری مسائل کو بھول کر بس اپنے حقیقی مقصد کی فکر میں لگ جائے گا۔

وہ آدمی با مقصد زندگی گزارنے والا ہے، جو اپنے ایک ایک لمحہ کو منزل کی طرف بڑھنے میں صرف کرتا ہو، اس کے مقصد کے سامنے کٹھن مشکلات آتی ہوں، تو ان سے آنکھیں بند کر کے منزل کی طرف رواں دواں رہتا ہو، بعض حالات ان کے سامنے ایسے بھی آئیں گے، جو گزارش کریں گے کہ آپ تھوڑی دیر کے لئے آرام فرلیں، لیکن وہ تمام گزارشات کو یک سر نظر انداز کرتے

ہوئے منزل کی طرف بڑھتا ہی رہتا ہو، با مقصد انسان زندگی کے چھوٹے چھوٹے مسائل سے الجھ کر اپنی زندگی کے مطلوبہ مقصد کو کبھی بھی نہیں کھوتا ہے۔

زندگی کو با مقصد بنانے کے لئے ایک لازمی چیز یہی ہے کہ انسان اپنے سامنے ایک واضح نشانہ رکھے، اور وہ بھی سوچا اور سلجھا ہوا ہو، ایک ایسا نشانہ جس کی صداقت پر اس کا ذہن مطمئن ہو، ساتھ ہی ساتھ اس منزل اور ہدف کے حصول میں اس کا ضمیر و دل پوری طرح ساتھ دے رہا ہو، اور اس نشانے پر پہنچنے کے لئے جس توانی کا درکار ہے وہ اس کی رگ و پے میں موجود ہو، اگر یہی ساری لازمی چیزیں حاصل ہوتی ہیں تو وہ انسان اللہ تعالٰی کی مدد سے اپنے مقررہ نشانے پر ضرور پہنچ سکتا ہے۔

دور حاضر میں میری قوم اور قومی رہنماؤں کی ایک بڑی کمزوری یہی نظر آرہی ہے کہ وہ اپنے واضح مقصدیت کے ساتھ معنی کے کردار سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے ہیں، یہ حضرات ایک واضح مقصدیت اور مطمئن شدہ تارگیٹ کو صرف نظر کے بس شتر بے مہار کی طرح ایسی ایسی سرگرمیاں کر رہے ہیں کہ جن پر بحیثیت مجموعی ایک قوم کے ٹھوس منصوبے کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی، جبکہ اس حالت میں یہ حضرات ایک میدان میں دیوار کی کچی اینٹ ثابت ہو رہے ہیں، جہاں تک مجھے اپنی قومی رہنماؤں اور قائدوں کے کردار کا علم ہے، اس کی بنیاد پر یہ یقین و پختگی کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ قوم کی رہنمائی تو دور کی بات وہ بذات خود زندگی کے کسی بھی میدان میں ایک دیوار کی پختہ اینٹ بھی ثابت ہونے سے شدید قاصر ہیں۔

میرے ناقص خیال کے مطابق اس کمزوری کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ وہ ایک با مقصد زندگی کا شعور کھو بیٹھے ہیں، نہ صرف دنیاوی بلکہ آخری زندگی کی تعمیر وترقی کے لئے ان کے سامنے قومی سطح پر ایک واضح نشانہ نہیں ہے، میں سمجھتا ہوں کہ عوام تو آخر عوام ہی ہیں، قومی قائدین اپنے اندر کردار وعمل کے ذریعے روشن مقصد کا شعور پیدا کر لیں تو وہ ایک زندہ قوم پیدا کر سکیں گے، جس طرح ارکان کی یہ مضمحل قوم ماضی میں ایک زندہ قوم کی حیثیت سے دنیا میں معروف تھی۔

یوں ان قیادت کے اندر صحیح مقصد کا شعور پیدا کر لینا اولین اہمیت کی چیز ہے، یہ واضح ہے کہ مقصد انسان کی اندرونی اور سوتی ہوئی قوتوں کو جگا دیتا ہے، جس کے بغیر انسان زندگی کے اس پر کھیں سفر میں ایک نشانے

کے حصول کے لئے کمر بستہ نہیں ہوسکتا، اگر کمر بستہ ہوا تو اس حالت میں وہ ناکام اور نامراد واپس آئے گا۔
مجھے اپنی قوم کے قائدین اور رہنماؤں سے عرض ہے کہ وہ قومی زندگی کے اس پر کٹھن میدان میں صرف ایک بار کے لئے ہی سہی رواجی وروایتی ذہنیت سے ذرا ہٹ کر سوچیں، ہمارے سیاسی، سماجی، فکری اور عملی میدان میں سالوں سے جو انداز روایت چلا آرہا ہے، اس پر ٹھنڈے دماغ سے نظر ثانی کرنے کی کوشش کریں۔

یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ انسان جب اپنے آپ کو کسی کام کے لئے ہمہ تن کوشش کرتا یا دوسرے الفاظ میں کسی کام یا مقصد کے حصول میں اپنی زندگی کو وقف کر دیتا ہے تو وہ اس میدان میں کام کے راز ہائے سربستہ کو ضرور پالیتا ہے، اس حالت میں اللہ تعالی اس کی مدد بھی فرماتا ہے، اور وہ اس راہ کی مشکلات ومعضلات کو ضرور حل کرسکتا ہے، یعنی جیسا کہ عرض کی گئی ہے کہ اس کے لئے شرط اولین یہی ہے کہ وہ اپنے آپ کو ہمہ تن اپنے مقصد کے حصول کے لئے وقف کرتا ہو، اس کے بعد اللہ پر بھروسہ کرلے، انسان جب اپنے کام کے ساتھ گہری وابستگی پیدا کرلیتا ہے تو اس کام میں اور اس انسان کے ساتھ اللہ تعالی کی مدد شامل حال ہوجاتی ہے، کسی کام میں گہری وابستگی کے بغیر نہ دنیا کے کسی مقصد کا حصول ممکن ہے نہ آخرت کا۔

دور حاضر کے مسلمانوں کا ایک عام تصور یہ ہے کہ اللہ تعالی نے اس دنیا کو صرف ان کے لئے پیدا کیا ہے، ان کے خیال میں اللہ تعالی ایک تیار شدہ دنیا ان کا حوالہ کردے گا، اس حال میں ان کا کام صرف یہی ہوگا کہ بس اسے اپنی مرضی کے موافق چلا دیں، مگر یہ سراسر نادانی، کم عقلی اور کور بینی اور فطرۃ اللہ سے عام جہالت کے سوا اور کچھ نہیں، دراصل بات یہی ہے کہ یہ دنیا مسابقت اور کردار وعمل کی دنیا ہے، یہاں ہر انسان کو اول سے آخر تک کام کرنا ہوتا ہے، ہم مسلمان ہیں اور ضرور ہیں، ہمیں اس جہاں میں دوسروں سے مقابلے کرتے ہوئے ایک خوشگوار عملی زندگی کا ثبوت دینا ہوگا، جو ناگزیر امر ہے، جس کے بعد یہ ممکن ہے کہ اسباب وظواہر کی اس دنیا میں ہم دوسرں سے سبقت لے جاسکیں گے، ویسے یہاں ایک مطلوبہ نشانہ ہمیں دستیاب ہوسکتا ہے، اگر ہم اپنے خیالات کو اس ڈھنگ سے ترتیب دینا سیکھیں گے تو ملت و وطن کی ترقی وتعمیر کے لئے ہمارے سامنے راہیں کھلتی چلی جائیں گی، البتہ اس موقع پر یہ بھی یاد رکھنا ہوگا

کہ ہم ابتدا سے انتہا تک ایک چھلانگ سے پہنچنا چاہیں گے تو ہماری توانائی اور قوتیں دھرے کے دھرے رہ جائیں گی، ایک ہی چھلانگ میں نہ ہم دینی اعتبار سے ترقی کرسکیں گے اور نہ دنیاوی اعتبار سے ترقی وتعمیر ممکن، ہمیں اپنا سفر طے کرنا ہے تو سفر کو ابتدا ہی سے شروع کرنا ہوگا، یوں درمیانی راستوں، پگڈنڈیوں اور دشت وڈھلوانوں سے گزر کر آخری منزل پر پہنچنا ہوگا، جس کے بغیر زندگی کا یہ سفر طے کرنا ممکن نہیں ہوسکتا، اس کے بغیر نہ دین کی ترقی ہوسکتی ہے اور نہ دنیا کی تعمیر ممکن ہے۔

اگر ہمیں ایک اچھی دنیا تعمیر کرنی ہے تو افراد کے نشوونما کے ساتھ ساتھ ان افراد کے بل بوتے پر ایک با مقصد قافلہ تیار کرنا ہوگا، ہمیں اپنی قوم کے روشن خیالات رکھنے والے ان افراد کو تربیت وتعلیم کے ساتھ انہیں ترتیب دینا ہوگا، جو اپنے ماضی اور حال کو اچھی طرح پہنچان سکتے ہوں، اور ماضی سے سبق لیتے ہوئے مستقل کو ترتیب دینے کے قابل ہوں، جو اپنے اندرونی شعور وجذبات کو پیدا کرتے ہوئے مستقبل کا لائحہ عمل مرتب کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں، راہوں میں اختلاف ہو بھی تو اس حال میں اپنے واضح مقصد کے پیش نظر اس کو مٹا کر متفق اور متحد ہونا جانتے ہوں، جن کے اندر ایسے حوصلے اور اولوالعزمی ہو کہ وہ ملک وقوم کی ترقی وتعمیر کی راہوں میں اپنے شخصی مفاد اور وقتی جذبات سے بلند ہوکر قربانیاں دینے کی صلاحیت رکھتے ہوں، اگر مذکورہ بالا عمل ہم سے ہوسکے تو ہم اپنی راہوں کے سنگ گراں کو ضرور ہٹا سکیں گے، راستے جتنے بھی کٹھن کیوں نہ ہوں، ہم اپنے قدم ضرور سنبھال سکیں گے، اور ہم اپنی قوم کے لئے ایک روشن تاریخ پیدا کرسکیں گے، اس کے بغیر اس پر کٹھن راہ میں اقدام کرنا موت کی خندق میں جان بوجھ کر چھلانگ کے ذریعے اوندھے منہ گرنے کا تہیہ کرنا ہے۔

میں زیر نظر گزارشات میں اس بات کو بار بار دہرا رہا ہوں کہ ہمارے سامنے ایک واضح مقصد اور سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت ایک نشانہ ہونا ضروری ہے، اس حوالے سے مجھے اس بات کا پورا پورا علم ہے کہ انسان کے سامنے ایک واضح مقصد اور منصوبہ بند نشانہ موجود ہو تو اسے اپنے اوقات اور اپنی زندگی کی قیمت دینی آتی ہے، اور جب انسان کسی مقصد سے خالی ہوجائے تو اس کی نظر میں اپنی زندگی کی کوئی بھی قیمت نہیں رہتی ہے، اس حال میں وہ اپنے اندازہ خود اپنی رائے سے کرنے کے بجائے دوسروں کی رائے سے کرنے لگتا ہے، یہاں تک اس کی پوری عمریں ہی بے معنی اور بے مقصد بسر ہو

جاتی ہے، بظاہراس کی زندگی طرح طرح کی مصروفیات سے بھری پڑی نظر آئے گی، لیکن بباطن اس کی زندگی ایک بے ثمر ایک خالی زندگی کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہے، اس کے پاس نہ دنیا کے لئے کوئی سروسامان تھے اور نہ آخرت کے لئے کوئی سرمایہ۔

انسان کے لئے دنیا میں کام کرنے کا ایک موقع ہوتا ہے، اسے اپنے موقع سے خوب خوب فائدہ اٹھانا ضروری ہے، اور اگر انسان اپنے موقع کو گھنوانا شروع کردے تو وہ دنیا میں اپنی دنیاوی زندگی کے لئے کچھ کرسکتا ہے اور نہ آخرت کے لئے۔

دنیا میں ایک چھوٹی سی چھوٹی گروہ اور قوم کے لئے ابھرنے کے امکانات اس وقت تک ختم نہیں ہوتے، جب تک اس کے سوچ سمجھ رکھنے والے افراد زندگی کے مقصدیت سے دست بردار نہ ہو جائیں، زمانے نے اگر کسی قوم کو گرا دیا تو اس کے لئے مایوسی بڑی خطرناک چیز ہوتی ہے، جس طرح میری قوم میں علی العموم نظر آرہی ہے، میں اپنی قوم کو مایوس ہونے سے روکنے کے لئے اپنی قوم کے سمجھ دار افراد کو گزارش کرتا ہوں کہ وہ آگے بڑھیں اور قوم کو مایوسی کے دلدل سے نکالنے کی کوشش کریں، ارکان کی یہ مسلم قوم ایک زندہ قوم تھی، اسے زمانے نے مارا ہے، قوم پر چھائی ہوئی مایوسی کو فی الفور ہٹانے کی کوشش ناگزیر ہے، ورنہ خدا نہ کرے یہ قوم مایوسی کی بیماری کی اس حالت میں زندگی ہی سے محروم ہوجائے، اس حالت میں اس قوم کے لئے نئے نئے امکانات اور نئے نئے مواقع کی تلاش ضروری ہے، ویسے وہ اپنے ابھرنے کا ازسرنو سامان پیدا کرسکتا ہے، اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ اس قوم کے روشن ضمیر افراد اپنی دانش مندی کا ثبوت پیش کردیں، اور اپنے ابھرنے کے لئے مسلسل کوشش اور پیہم جدو جہد کریں، لیکن یاد رہے کہ ہر ایک جہد وکوشش ایک منصوبہ بندی کی تحت ہونی چاہئے، انسان اس وقت کوئی بامعنی کامیابی حاصل کرسکتا ہے، جب وہ منصوبہ کے تحت اپنے روشن مستقبل کی طرف گامزن ہو، منصوبہ اور منظم عمل ہی انسان کے لیے اس راہ عمل میں کامیابی حاصل کرنے کا واحد اور یقینی راستہ ہے۔

میں اپنی قوم کے روشن ضمیروں سے عرض کروں گا کہ اللہ تعالی نے اس کائنات کو عجیب وغریب امکانات سے بھر دیا ہے، یہاں بظاہر مادہ فنا ہوتا نظر آتا ہے، لیکن بباطن خود یہی فنائیت اس کے لئے

توانائی اور بقا کا سروسامان ہوجاتی ہے، کبھی تاریکی نظر آتی ہے تو خود اس کے بطن سے ایک نئی روشنی برآمد ہونی شروع ہوجاتی ہے، اس لئے ہمیں مایوس ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، ہرناکامی کے اندر خانہ سے ایک نئی کامرانی کا امکان ابھرآتا ہے، زندگی کے سفر میں دو قومیں نکلیں تو یہی ہوسکتا ہے کہ ایک آگے نکل گئی اور ایک پیچھے رہ گئی ہو، مگر پیچھے رہ جانے والی کے لئے بات یہیں ختم نہیں ہوجاتی، اس کے بعد ایک عملی دور پورے آب وتاب سے شروع ہوجاتا ہے، آگے بڑھی ہوئی قوم میں عیش و عشرت کی طربناکی اور ملنے ملانے اور سہولت پسندی کے جذبات ابھرآتے ہیں، اور دوسری بچھڑی ہوئی قوم میں محنت وسعی اور مشقتِ پیہم کا جذبہ ازسرنو بیدار ہوجاتا ہے، جو بالآخر اس کی ترقی کا ضامن ہوجاتا ہے، غرض دنیا میں انسان کے لئے مایوسی اور پستِ ہمتی کا بھوت سب سے بڑا خطرناک ہے، میں کہنا یہی چاہتا ہوں کہ حالات بظاہر کتنے ہی ناموافق دکھائے دیتے ہوں، اس کے آس پاس انسان کے لئے ایک کامرانی کا امکان ضرور موجود ہوتا ہے، اگر انسان ایسے حالات میں بھی مستعد ہوسکتا ہے تو ہاری ہوئی بازی بھی ضرور جیت سکتا ہے۔

اس دنیا میں کامیابی ایسی چیز کا نام ہے، کہ انسان ہر مرحلے میں مسلسل ناکامیوں کے باوجود پھر ایک اور کامیابی کا راستہ نکال سکے، یہاں تجارت یہ ہے کہ گھاٹے کے باوجود نفع حاصل کیا جائے، یہاں آگے بڑھنا یہ ہے کہ پیچھے ہٹنے کے واقعات پیش آنے کے باوجود آگے کا سفر جاری کھا جائے، اس دنیا میں کھونے کے باوجود پانے کا نام پانا ہوتا ہے، یہ ایک ایسی دنیا ہے، جہاں اتحاد صرف ان انسانوں کے درمیان قائم ہوسکتا ہے، جو اختلاف کے باوجود متحد ومتفق کے فن سے آشنا ہوں۔

انسان کی کامیابی کا راز ہمیشہ اس میں چھپا ہوا ہوتا ہے کہ آدمی کے اندر اپنے مقصد کے حصول کا پختہ ارادہ ہو، بعد ازاں وہ اپنے دستیاب وسائل کو پوری مستعدی، احتیاط، ہشیاری اور پوری دانش مندی کے ساتھ مقصد کے حصول کے لئے بروئے کار لانا جانتا ہو، ہم دیکھتے ہیں کہ بیشتر انسان کی ناکامی کا راز یہ نہیں ہوا تھا کہ اس کے پاس وسائل کا شدید فقدان تھا، بلکہ یہ دیکھا گیا کہ وہ اپنے ممکن اور دستیاب وسائل کو صحیح وبرمحل استعمال کرنے پر شدید قاصر تھا، انسان کو کام کا شوق ہو تو اس کی عقل کے دروازے کھل جاتے ہیں، مقصد کو حاصل کرنے کی تڑپ اس کی قوت عمل کو بڑھا دیتی ہے، اور وہ اس

کی خاطر قربانی کے لئے تیار ہوجاتا ہے،جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خود وہ دنوں میں وہ کام کر لیتا ہے، جسے دوسرے شخص ہفتوں اور مہینوں میں نہ کرسکے۔

مقابلہ ومسابقہ کی اس دنیا میں کامیابی کے لئے لازمی طور پر ضروری ہے کہ آپ میدان میں اتریں تو پوری مستعدی کے ساتھ اتریں، اگر آپ کم تیاری کے ساتھ میدان میں اتریں گے تو آپ کے لئے ناکامی کے سوا کوئی چیز نہیں ہوسکتی، اور تیاری بھی باقاعدہ اور زمانے کے تقاضوں اور چاہتوں کے موافق ہونی لازمی ہے، اگر آپ کی ترتیب باقاعدہ اور منظم نہیں تو آپ زندگی کے اسٹیج پر شاعر اور خطیب بن کر رہ جائیں گے، اگر ترتیب وقت کے تقاضوں کے مطابق نہیں ہوئی تو آپ کو صرف تاریخ کے عجائب خانے کے علاوہ اور کہیں جگہ نہیں ملے گی، آپ خواہ اور کچھ ہوجائیں، مگر وقت کے زندہ اور بامراد نقشوں میں اپنے لئے جگہ بنا نہیں سکیں گے۔

میں اپنی قوم کے پرعزم اور بلند حوصلہ اور مستقبل کے نونہالوں سے عرض کروں گا کہ بڑاانسان بننے کے لئے بڑے لوگ کا بچہ یا بڑے گھر کے پروردہ ہونا کوئی ضروری نہیں ہے، بلکہ معمولی گھرانے کے آدمی بعض معمولی حیثیت سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کرکے ایک بڑے سے بڑ آدمی بن سکتا ہے، اور بڑی سی بڑی کامیابی حاصل کرسکتا ہے، تاہم کامیابی کے لئے شرط اولین یہی ہوتی ہے کہ جدوجہد کی شرائط کو پورا کیا جائے، بسااوقات یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ وہ لوگ زندگی کے بازارِ مسابقت میں زیادہ خوش قسمت رہے، جن کو مشکل مواقع میں زندگی کا ثبوت دینا آیا ہے، زندگی کے بہترین انسان بننے کا سبق مشکل حالات میں ملتا ہے، اعلی انسان راحتوں میں نہیں بنتا بلکہ مصیبتوں، آزمائشوں اور ابتلاؤں میں تیار ہوتا ہے۔

ایک بچہ غریب گھرانے میں پیدا ہونے کے باوجود اعلی تعلیم حاصل کرسکتا ہے، لیکن اس کو یہ سبق ضرور یاد رکھنا ہوتا ہے کہ محنت ہر چیز کا بدل ہے، وہ لوگوں کی نظر میں غیر اہم رہا بھی ہو تو اسے اپنے مقصد کے حصول کے لئے محنت ومشقت سے کام لینا پڑے گا، بعد ازاں ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ اس کی اہمیت دینے کے لئے پوری دنیا مجبور ہوجائے گی۔

ہری بھری فصلیں میدان اور گھر کے آنگن میں سے اگتی ہیں، دنیا میں یہ دیکھا نہیں گیا کہ لوگ سونے کی تھالی پر ہری بھری کھیت لگانے کی کوشش میں لگ گئے ہوں، یہ انسانی زندگی کا عالم گیر نظام ہے کہ

انہوں نے صحیح اور باثمر کھیت لگانے کے لئے میدان کا رخ کیا ہو، ٹھیک اسی طرح انسانی تاریخ میں بڑی بڑی شخصیات عمومی طور پر غریب گھرانے سے پیدا ہوئی تھیں، عبقری لوگ بسااوقات غریب گھرانے سے پیدا ہوتے ہیں، اس لئے ملک وملت کی خدمات انجام دینے کے متمنی غریبوں سے متوقع ہے، بشرطیکہ وہ اپنی غریبی پر مایوس نہ ہوجائے، بسااوقات غربت انسان کو فعال بنادیتی ہے، اس کے برعکس فارغ البالی انسان کو عیاش وغافل بنادیتی ہے۔

امکانات کے دروازے کھلے ہیں

زندگی کا سفر رواں دواں ہے، اس سفر میں رو ہنگیا ایک ایسی قوم ہوگئی ہے جو قافلۂ حیات سے بچھڑ چکی ہے۔اس سے کوسوں پیچھے رہنے والی برادر قوم آج کل اسے پیچھے چھوڑ کر کوسوں دور نکل گئی ہے، پھر بھی اپنی قوم سے عرض کروں گا کہ ہمیں ہمت ہارنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، تاہم اس موقع پر ہمیں یہ سمجھنا ہوگا کہ زندگی کی جدوجہد میں کبھی کوئی آگے بڑھتا ہے اور کوئی نسبتا پیچھے ہوکر رہ جاتا ہے، اور زندگی کی کشمکش یا بچنے بچانے کی تگ ودو میں کوئی غالب آجاتا ہے اور کوئی مغلوب ہوکر رہ جاتا ہے، مگر یہ ایک ایسی دنیا ہے جس میں امکانات کے دروازے کھلے بھی ہیں اور بہت وسیع بھی ہیں، اس کی وسعت کی نہ حد ہے اور نہ حساب، یہاں پر ایک بچھڑے ہوئے کے لئے ایک بار پھر آگے بڑھنے کے امکانات موجود ہیں، البتہ ضرورت اس بات کی ہے کہ زندگی کی اس کٹھن راہوں میں انسان عملی زندگی گزارنے کے لئے تیار ہوجائیں، وسائل جتنے بھی کم کیوں ہوں، ہم وسائل کے حصول کے لئے کوشش تیز کرسکتے ہیں، اور ہاری ہوئی اس بازی سے یہ بھی درس لے سکتے ہیں کہ آج کل کی دوڑ میں ہاری ہوئی بازی کی کیسی تلافی ممکن ہے، اگر آپ کے رقیب آپ سے ہر اعتبار سے طاقتور بھی ہو تو ہمت ہارنے کی کوئی ضرورت نہیں، آپ اپنی بازی پھر سے جیتنے کے لئے زیادہ سے زیادہ کوشش میں لگ جائیں۔

انسانی زندگی کے لئے ایک بڑی اور قیمتی چیز حوصلہ اور جذبہ ہے، انسان کے اندر بلند حوصلگی کے ساتھ عمل کا جذبہ پیدا ہوجائے تو اس کے اندر کی تمام سوئی ہوئی قوتیں اور توانائیاں یکبارگی سے بیدار ہو جاتی ہیں، اب وہ زیادہ بہترین انداز میں سوچنے اور معاملے کو پرکنے لگتے ہیں، زیادہ کارگر اور کارآمد منصوبہ تیار کرنے لگتے ہیں، اور اپنے منصوبے اور پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لئے زیادہ محنت اور تگ ودو شروع کردیتے ہیں، یاد رہے کہ جذبے کے بیدار نہ ہونے کی وجہ سے انسان سست اور کاہل ہوجاتے ہیں، جیسے کہ کوئی پتھر اپنی جگہ پر خاموش پڑا رہا ہوتا ہے، اور عام طور پر تجربے سے یہ ثابت

ہوگئی ہے کہ آسودگی اور فراوانی کے حالات نے انسان کو کاہل بنادیا ہے، اور صرف یہ نہیں بلکہ انسان کی اندرونی قوتوں کو سلادیا اور بیداری و بیدار مغزی کو سخت چیلنج کردیا ہے، اس کے برعکس جب انسان کی زندگی مشکلات سے دوچار ہوتی ہے تو اس کی اندرونی تمام چھپی ہوئی قوتیں بیدار ہوجاتی ہیں، اور ساتھ ہی ساتھ صلاحتیں اس طرح جاگ اٹھی ہیں جیسے گہری نیند سونے والوں پر اچانک ایک پتھر گرا ہو، اور وہ تلملا کر جاگ اٹھے، البتہ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر معاملہ کا ابتدائی حصہ انسان کو خود لینا پڑتا ہے، جب کبھی انسان کی زندگی میں بربادی آجائے تو یہ بربادی انسان کو دو امکانات کے درمیان کھڑی کر دیتی ہے، یا تو وہ مشکلات و بربادی سے سبق لے کر متحرک ہوتا اور اپنے آپ کو از سر نو تعمیر و ترقی کرنے کی فکر میں لگ جاتا ہے، یا خود مشکلات و بربادی سے مایوس ہوکر صرف سرد آہیں بھرنے لگتا ہے، بربادی کے بعد ابتدا میں وہ جس رجحان کو اپناتا ہے اس رخ پر اس کی زندگی چل پڑتی ہے، اسی کے مطابق اس کی اندرونی صلاحیتیں کام کرنے لگتی ہیں، اب میں یہ کہنا چاہوں گا کہ جب بھی انسان کی زندگی میں کوئی بھی پریشانی، بربادی یا حادثہ پیش آئے تو اس کو حادثہ کی طرف دیکھنے کے بجائے اپنے آپ کو دیکھنا زیادہ ضروری ہے، اس لئے کہ اس کے مستقبل کے کسی بھی نتیجہ کا انحصار اسی پر ہوتا ہے کہ انسان حالات کے مقابلہ میں کس قسم کے ردعمل کا اظہار کرتا ہے، اب تعمیر نو کا جذبہ پھر سے پیدا ہوا تو یہ مثبت ردعمل ہے، جو لازما اس کو کامیابی اور کامرانی کی منزل تک لے چلتا ہے، اگر احتجاج اور شکایات کی آہیں بھرنے میں لگ جائے تو اسے ایک منفی ردعمل سے تعبیر کیا جائے گا، جس کا آخری اور لازمی انجام مزید پریشانی اور بربادی کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ میری قوم کو نجات سے ہم کنار کرنے کے بعض طالب حضرات بس زندگی بھر ایک طرح کی فکر اور اس فکر کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں، اب میں ان سے یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ ایک میدان میں آپ موقع نہیں پا رہے ہیں تو دوسرا ایک اور میدان تلاش کرلیا کریں، اپنے حریف اور دشمن سے براہ راست مقابلہ ہو نہیں پا رہا ہے تو وقت کی چاہت کے مطابق بالواسطہ مقابلے کرنے کی تیاری کرلیا کریں، اگلی صف میں جگہ نہیں رہی ہے تو کم سے کم پچھلی صف میں جگہ بنانے کی کوشش کرلیا کریں، اگر فی الحال ٹکراؤ کے ذریعے مسائل کا حل نظر نہیں آرہا تو دشمن سے وقتی

مصالحت کی کوئی صورت نکال لیا کریں، اس میدان میں دوسروں کا تعاون حاصل ہونہیں پا رہا ہوتو ابتدا میں تنہا کام کا آغاز کریں، اس طرح اگر فی الحال پورے مکان کی تعمیر کی گنجائش نہیں ہے تو کم سے کم بنیاد رکھنے کی کوشش کیا کریں۔

دنیا میں وہ آدمی سب سے زیادہ کامیاب ہوتا ہے، جو ناموافق حالات اور حوادث کی شکایت اور گلہ کرنے کے بجائے مشکلات کوحل کرنا جانتا ہو، انسان بیشتر حالات میں ایسا ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو مشکلات کے درمیان پا کر بھی کام میں مگن رہے، اور دنیا میں اس انسان کو کامیاب سمجھا جاتا ہے جو مشکلات ومعضلات سے گزرتے ہوئے اپنی منزل ومراد تک پہنچ جائے، اس لئے ایک بربادی سے دوچار ہونے کے بعد بھی انسان کو مایوس نہیں ہونا چاہئے، اگر حالات کے شکار ہونے کے بعد انسان اپنی عقل ودماغ اور ہوش وحواس کو کھودیتا ہے تو وہ کبھی بھی کامیاب نہیں ہوسکتا، انسان کو چاہئے کہ ناکامی اور نامرادی سے سبق سیکھے، اس ناکامی اور نامرادی کو کامیابی کا ایک زینہ بنائے، انسان کے لئے کسی بھی سخت ترین حوادث میں ایک نہ ایک امکان کا دروازہ کھلا رہتا ہے، سارے اثاثے جل کرڈھیر ہوجانے بعد بھی انسان کو مایوس نہیں ہونا چاہئے، ایک بربادی سے دوچار ہونے کے باوجود وہ اپنی عقل ودانش کونئی راہ کی تلاش میں لگادے، وہ اپنے کواس حالت میں ضرور پائے گا کہ ایک امکان ختم ہونے کے باوجود بھی سوامکانات اس کے لئے منتظر ہیں، غرض حالات سے کبھی بھی مایوس نہیں ہونا چاہئے، عین ممکن ہے کہ ایک مایوسی سیکڑوں کامرانیوں کے پیش خیمے ہوں۔

یاد رہے کہ اللہ تعالی کے سوا تمام مخلوقات کا توڑ ایک دن ضرور ہوکر رہے گا، اگر کسی طاقتور چیز کو توڑنا ہے تو پہلے دیکھنا نہیں ہوگا کہ اس چیز کی کمزوری کس میں ہے، اور وہ کہاں سے شروع ہوتی ہے، جب معلوم ہوجائے تو آپ اس کمزور مقام پر سب سے پہلے ضرب لگا ہیں، اور یاد رکھیں کہ ایک چیز اگر کسی بھی اعتبار سے ناقابل شکست ہوگئی تو اس کے کمزور پہلو پر ضرب لگائیں گے تو اس کی شکست ضرور ہر کر رہے گی، ایک انسان کو کسی بھی کڑوے بول سے موافق نہیں بنا سکیں گے تو اسے میٹھے میٹھے بول سے ضرور موافق بنا سکیں گے، اپنے دشمن کو لڑائی اور حرب وجدال کے ذریعے دبا نہیں سکتے ہوں گے تو اسے اپنے اخلاق حمیدہ اور اپنے دلربا اوصاف سے دبانے میں کامیاب

ہوسکتے ہیں، ایک انسان کو اگر ایک اعتبار سے سخت نظر آئے تو اس کو ہر ایک اعتبار سے سخت سمجھ لینا یہ بھی ایک حماقت ہے، اسی طرح سارے مخلوقات خداوندی کا حال ہے، ایک اعتبار سے سخت ہیں تو دوسرے اعتبار سے نازک بھی، اگر ہم مذکورہ بالا فارمولے کو نظر انداز کرتے جائیں گے تو ہر ایک میدان میں ہوسکتا ہے کہ ہمیں ناکامی کے شکار ہونے پڑیں۔

میں بار بار عرض کرتے جائیں گے کہ بسا اوقات انسان کے لئے زندگی کے ناموافق حالات ترقی کے زینے ہوتے ہیں، ان سے درس عبرت لے کر انسان آگے بڑھ سکتا ہے، اور ترقی کے عروج پر پہنچ سکتا ہے، بشرطیکہ وہ ناموافق حالات سے نفرت وشکایت کا درس نہ لیا کرے، بلکہ مثبت ذہن کے تحت اپنے مستقبل کو بنانے کی تگ ودو میں لگ جائے۔

اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ کسی بھی میدان میں کامیابی کے لئے اس میدان میں انسان اپنے آپ کو وقف کردینا سیکھیں، زندگی کا ہر ایک معاملہ ایک شمع جیسا ہے، جس میں وہ انسان آگے بڑھے گا جو سب سے بڑا پروانہ ہو، اسی طرح زندگی ایک لین دین کا سودا بھی ہے، یہاں پانے کے لئے کچھ دینا بھی ناگزیر ہوتا ہے، یہاں کچھ دیئے بغیر پانا ممکنات میں سے نہیں ہے۔

کسی معاشرہ کی صحت انسان کے کردار پر منحصر ہے

کسی نفسیاتی خرابی کوٹیکنیکل اصلاح سے دور نہیں کیا جا سکتا، جس کے ذیل میں ایک قوم کے لئے بد عنوانی ایک سخت نفسیاتی بیماری ہے، اس لئے ایک قوم کو اگر مہذب بنانا ہے تو افرادِ قوم کی نفسیاتی اصلاح ناگزیر ہے، اس نفسیاتی اصلاح کے لئے تعلیم اور تربیت کے ساتھ ساتھ قوم کے روشن ضمیر قائدین کو ایسے اعمال دیکھانے ہوں گے، جن سے خود بخود افرادِ قوم کی نفسیاتی بیماری دور ہو جاتی ہو، مجموعی طور پر قوم کی بہترین حالت کا انحصار قوم کے عمائدین اور قائدین کے کردار پر منحصر ہے، یونتو افراد کے بننے بگڑنے سے قوم کا بننا اور بگڑنا مانا جاتا ہے، مگر میں اپنی قوم کے لئے یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ موجودہ دور میں میری قوم کے بننے اور بگڑنے کا سارا دارو مدار قوم کے ان افراد کے کردار و اعمال ہی پر منحصر ہے، جو قوم میں کوئی رہنمائی اور قیادت کرنا چاہتے ہیں، میرے ناقص خیال کے مطابق میری قوم کی حالت اس وقت درست ہو سکتی ہے، جب رہنمایانِ قوم اور اربابِ بست وکشاد صحیح اور درست کردار اپنا رہے ہوں گے، یوں منطقی طور پر نتیجہ ایسا نکلتا نظر آتا ہے کہ دراصل ہمارے اربابِ بست وکشاد کی اصلاح کے بغیر میری قوم کی اصلاح ممکن نہیں ہے۔

عوام تو عوام ہی ہے، بڑی بات یہی ہے کہ ہمارے قائدین ایک طرح کی نفسیاتی بیماری کے شکار نظر آرہے ہیں، انہیں قوم سے بالکل یوس نظر آرہا ہے، وہ شاید آج سے برسوں پہلے پرامید رہے ہوں گے، لیکن ہم آج کل دیکھتے ہیں کہ مایوسی اور نا امیدی کی بیماری نے ان کے دل دماغ اور ذہن وخیال کو دیمک کی طرح کھا رہا ہے، زندگی کے اس وسیع وعریض میدان میں جب دو آدمی اور دو گراہوں کا مقابلہ ہوتا ہے تو کامیاب ہونے اور نہ ہونے میں اس کے لئے اصل فیصلہ کن چیز یہ نہیں ہوتی کہ کس کے پاس مادی طاقت یا ظاہری ساز وسامان زیادہ ہے اور کس کے پاس کم، بلکہ اصل فیصلہ کن چیز قلبی اور دماغی چیز ہوتی ہے، یعنی جس کے پاس ذہنی کمالات اور قلبی اوصاف زیادہ

ہوتے ہیں، وہ اس میدان میں کامیاب وکامران ہوتا ہے، اور جس کے اندر نسبتاً اوصاف کم ہوتے ہوں، وہی ناکام اور نامراد ہو جاتا ہے۔

اور جہاں تک اپنے مقصد کی صحت کا تعلق ہے کہ اس کی صحت کا یقین یہی ہے کہ اس کا ذہن تضادِ فکری سے خالی ہو، وہ زندگی کے اس سفر میں اپنے نظم وضبط کو باقی اور مستحکم رکھتا ہو، ہیجان خیز اور مصیبت و ابتلاء کے لمحات میں بھی ٹھنڈے دماغ سے فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، جذبات پر قابو رکھتے ہوئے حقیقت پسندی سے کام لینے کا ماہر ہو۔ وہ اپنے کام میں کسی بھی مرحلہ پر سوچنے کے اقدام کے تحت کام کرتا ہو، یہ تمام کے تمام قلب ودباغ سے تعلق رکھنے والی چیزیں ہیں، اور اصل میں یہی وہ چیزیں ہیں، جو زندگی کے معرکہ میں فیصلہ کن ہوتی ہیں، اور یہ وہی چیزیں ہیں، جن کی نسبت سے انسان کامیاب بھی ہو سکتا ہے اور اس کی کمی کی وجہ سے ناکام بھی۔

جہاں تک ہم دیکھتے ہیں کہ مادی دنیا کا نظام اپنے مقررہ حد تک مستحکم اور مضبوط نظام ہے، اس کے برعکس انسانی دنیا کا نظام ایک منتشر نظام ہے، ایک طرف مادی دنیا میں ہر کہیں بناؤ ہے جبکہ انسانی دنیا میں ہر کہیں فساد اور بگاڑ ہے، اس کی وجہ صرف ایک نظر آتی ہے کہ مادہ اپنے اصول اور ضوابط اور آئین وقوانین کا شدید طور پابند ہے، جبکہ انسانی دنیا کے ضوابط واصول، قوانین وآئین کا نہ صرف پابند نہیں، بلکہ ایک طور پر شدید مخالف بھی ہیں۔

انسانی دنیا میں کوئی طاقتور نظامِ حیات اور ایک اچھا خاصہ اصولی معاشرہ اس وقت وجود میں آتا ہے، جب یہاں رہنے والے انسان حقیقی اور اصولی معنی میں انسان ثابت ہو سکیں، جہاں مضبوطی اور پختگی کی ضرورت ہوتی ہو وہاں وہ فولاد کی طرح اور پختہ ہو جائیں، اور جہاں نرمی کی ضرورت ہوتی ہے، وہاں وہ ریشم کی طرح نرم ہو جائیں، جہاں چپ رہنے کی ضرورت ہوتی ہے، وہاں پتھر جیسا خاموش اور پرسکون ہو جائیں، اور جہاں ٹھہرنے کی ضرورت ہوتی ہے، وہاں بلند وبالا پہاڑوں کی طرح جم کر کھڑے ہو جائیں، جہاں اقدام کی ضرورت ہے، وہاں وہ سیلاب کی طرح رواں دواں ہو جائیں، وہ راہ سفر میں ہر اس موقع ومحل میں بولیں، جہاں انہیں بولنے کی ضرورت ہو، اور ہر اس موقع ومحل میں وہاں ثابت قدم ہوں، جہاں انہیں ثابت قدم ہونے کی ضرورت ہو۔

ہمارے معاشرہ میں مذکورہ بالا صفات کے حامل افراد کی اتنی اہمیت محسوس ہو رہی ہے، جتنی آج کل کی متمدن دنیا میں لوہے اور پٹرول کی ضرورت ہے، آج کل کی دنیا میں لوہے اور پٹرول کے بغیر انسانی زندگی جس طرح چل نہیں سکتی، ٹھیک اسی طرح ایک خالص اور صالح معاشرہ ان بلند اخلاق وفضائل کے حامل افراد کے بغیر زندگی کے میدان میں ایک مقصد کے حصول کے لئے چل نہیں سکتا۔

مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے قومی معاشرے میں جن افراد پر کچھ نہ کچھ بھروسہ کیا جا رہا ہے، ان کے اخلاق وکردار کا یہ حال ہے کہ جہاں ان کو دعدہ نبھانا ہوتا ہو، وہاں وہ وعدہ خلافی پر تلے ہوئے ہوتے ہیں، جہاں ان کو شرافت ونجابت کا مظاہرہ کرنا ہوتا ہو، وہاں وہ کمینہ پن کا طریقہ اپنائے ہوئے ہوتے ہیں، جہاں ان کو فیاضی دکھانا چاہئے، وہاں وہ تنگ ظرفی اور کوتاہ دامنی کا ثبوت پیش کر تے ہیں، جہاں ان کو بڑا پن کا مظاہرہ کرنا چاہئے، وہاں وہ چھوٹا پن کا مظاہرہ کر تے ہیں، معاف کرنے کی جگہ انتقام، اطاعت شعاری کی جگہ شرارت اور سرکشی کر تے ہیں، جس مقام پر ان کو سراسر اعتراف کرنا چاہئے، وہاں وہ اپنی ہٹ دھرمی دکھانے لگتے ہیں، جہاں ان کو اپنے بھائی کی پردہ پوشی کرنا چاہئے وہاں وہ پردہ دری پر تل جاتے ہیں، جہاں ان کو ایثار وہمدردی، اخوت وبھائیچارگی سے کام لینے کی ضرورت ہے، وہاں وہ خودغرضی سے کام لینے لگتے ہیں، تو ظاہر ہے کہ جس معاشرہ کے بڑے بڑوں کا یہی حال ہوگا، اس معاشرہ میں شر وفساد، افراتفری کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے؟ اور جس معاشرہ میں افراتفری اور انتشار وفساد کا یہ عالم ہوگا، وہاں کوئی مستحکم اور مضبوط نظام کی بنیاد کا سوال ہی نہیں ہوسکتا۔

فطرت انسان کو تعلیم دیتی ہے

ایک قوم ایک بڑے ہاتھی کی مثال ہوتی ہے، چھوٹے جانوروں کے برعکس اگر کسی ہاتھی کو ندی پار کرنا ہوتا ہے تو وہ پانی کے تہ میں قدم سنبھال سنبھال کر رکھتا ہے، وہ تیز چلنے کے بجائے ہر قدم پر رک رک کے چلنا شروع کرتا ہے، اسے بہر حال اپنی اگلی منزل کی طرف جانا ہے اور مشکلات کی ندی پار کرنا ہے، ویسے وہ نہایت محتاط انداز میں اپنا اگلا قدم رکھتا ہے۔

ہاتھی کے برعکس کسی چھوٹے جانور کے لئے ندی کا تہ کوئی خطرہ نہیں ہوتا ہے، سطح ندی نرم ہو یا سخت، ان کا ہلکا سا جسم آسانی کے ساتھ اس سے گزر جاتا ہے، ہاتھی چونکہ وہ غیر معمولی جسامت کا مالک ہوتا ہے، اس کے لئے نیچے کی نرم مٹی بہت خطرناک ہوتی ہے، ہاتھی کو یہ خطرہ لاحق ہوتا ہے کہ کہیں چلتے وقت اس کا بھاری بھرکم پاؤں مٹی میں دھنس نہ جائے، اس لئے جب تک ہاتھی یہ نہ دیکھ لیتا کہ نیچی کی سطح مضبوط ہے، وہاں اپنا آگلا قدم نہیں بڑھاتا، اور قدم رکھتے وقت وہ یکبارگی اپنا سارا جسمانی بوجھ نہیں ڈالتا، وہ پہلے ہلکے قدم رکھ کر سطح زمین کو آزماتا ہے، اسے جب اندازہ ہوجاتا ہے کہ سطح زمین سخت اور مضبوط ہے تو اس پر اپنے پورے جسم کا بوجھ ڈال کر آگے قدم بڑھاتا ہے۔

ہاتھی کو قدرت سے ملنے والی یہی فطرت ہمیشہ انسان کو ایک زبردست اور دوررس درس دے سکتا ہے، کہ جب راستے میں انسان کو کسی بھی خطرے کا اندیشہ ہو تو وہ اگلا قدم اس طرح نہ رکھے جس طرح ایک چھوٹا جانور ندی پار کرتے وقت رکھتا ہے، بلکہ اس کو چاہئے کہ وہ ہاتھی کی چال چلنا شروع کردے، اب اسے اس طرح چلنا نہیں چاہئے جس طرح بے خطر راستے سے چلا جاتا ہے، بلکہ اسے چاہئے کہ ہر قدم سنبھل سنبھل کر رکھے۔

ظاہر ہے کے انسان اشرف المخلوقات ہے، تمام مخلوقات سے زیادہ اس کو عقل سے نوازا گیا ہے، انسانی راہوں میں کانٹے، پٹرول، بارود، دلدل گڑھا سب کچھ ہوتا ہے، اس لئے راہوں میں چلنے والوں کو

پوری عقل مندی کا مظاہرہ کر کے چلنا چاہئے، کہیں ایسا نہ ہو کہ راستے میں مذکورہ بالا یا ان جیسے خطرات سے الجھ کر نہ رہ جائے، بلکہ اگلے راستے میں دیکھ دیکھ کر قدم رکھنا چاہئے۔

جب ایک انسان کے سامنے کوئی با مقصد زندگی ہو، وہ راہوں کی ناخوشگوری سے بچنے کی ضرور کوشش کرے گا، اس لئے کہ وہ ضرور جانتا ہے کہ راہوں کی مشکلات سے الجھنا اپنے آپ کو مقصد سے دور کرنا ہوتا ہے، با مقصد زندگی گزارنے والے انسان کی توجہ ہمیشہ منزل کی طرف ہوتی ہے، نہ کہ دائیں بائیں کی طرف، وہ ہمیشہ مستقبل کے نتائج پر توجہ رکھتا ہے، نہ کہ وقتی کاروائیوں اور پیچیدگیوں کی طرف، وہ بہر حال حقیقت کی نظروں سے راستوں کو دیکھتا ہے، نہ کہ ذاتی اور نجی خواہشات کی بنیاد سے، میں اس بات کو ایک فطری قانون کہنا بجا سمجھوں گا کہ اگر آپ راستے میں اپنے دشمن کو بالکل ہلاک نہیں کر سکتے ہیں تو خدارا اسے زخمی بھی نہ کیجئے گا، اس لئے کہ جب دشمن زخمی حالت میں ہوتا ہے تو وہ آپ کے لئے پہلے سے زیادہ خطرناک ثابت ہوگا، دشمن پر پوری تیاری کے بغیر حملہ آور نہیں ہونا چاہئے، آپ اپنی کافی تیاری کے بغیر اس پر وار کریں گے تو آپ اپنی موت کو دعوت دیں گے، مکمل تیاری کے بغیر اقدامات کو ہم بے صبری کے علاوہ اور کچھ نہیں کہہ سکتے، اگر آپ کے اندر پوری صلاحیت و استعداد نہیں ہیں تو پہلے صلاحیت اور استعداد کی فکر کریں، اور اپنے آپ کو مکمل اقدام کرنے کے قابل بنائیں، دشمن پر سطحی وار سے اس کا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتے۔

اب ہمیں اپنی قوم کے اندر زندگی کی توانائی اور طاقت و حرارت پیدا کرنی ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ پہاڑ اپنی اپنی پوری عظمت کے باوجود یہ طاقت نہیں رکھتا ہے کہ کسی پتھر کے ٹکڑے کو ادھر سے ادھر کھسکا دے، لیکن درخت کے تنے اتنے قادر ہوتے ہیں کہ وہ پتھر کے سخت فرش کو دھکیل کر باہر آ جائے، یہ فطرت کے پر اسرار مظہر ہے، جس کو زندگی بھی کہا جاتا ہے، اگر ہم اپنی قوم کے اندر زندگی پیدا کر سکے تو بجا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں اور کوئی مٹا نہیں سکتا، زندگی ایک ایسی طاقت کا نام ہے جس کو کوئی چاہتے بھی تو دبا نہیں سکتا، اور اسے پھلنے اور بڑھنے سے محروم نہیں کر سکتا، اور زندگی ایک ایسی قوت و جبروت کا نام ہے، جو اپنا حق اصول کرتی ہی رہتی ہے، ہم جانتے ہیں کہ ہماری قومی زندگی کی جڑیں کھودی جا رہی ہیں، مگر اس وقت ہم بجا طور پر یہ دعوی کر سکتے ہیں کہ ہم اپنا وجود ضرور رکھتے ہیں، ہم

موقع کی تلاش وجستجو میں ہیں کہ کہیں پوری طاقت وتوانائی کے ساتھ ظاہر ہو جائیں گے، البتہ یہ ضرور صحیح ہے کہ دنیا میں داخلی استحکام کے بغیر خارجی ترقی ممکن نہیں ہوتی ہے، اسی لئے ہمیں اپنی قوم کی داخلی قوتوں کو مستحکم کرنا چاہئے، جب داخلی قوت متحرک و مستحکم ہو جائے گی تو یونہی خارجی قوت مرتب و مستحکم ہو جائے گی۔

جہاں تک ہماری قوم کی تعمیر و ترقی کا سوال ہے، کہ ہمیں چاہئے کہ بیل کی طرح نہ پھیلیں، بلکہ درخت کی طرح پھلنے پھولنے اور آہستہ آہستہ بڑھنے کی کوشش کیا کریں، قدرتی طور پر بیل کی یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ آنا فانا بڑھتی ہے، لیکن چند مہینے جاتے نہ جاتے سوکھ کر ختم ہو جاتی ہے، ابتدا میں وہ چاہے فرلانگ تک پھیلے ہوئے نظر آئے گی، مگر بالآخر وہ قدموں کے نیچے بھی دکھائی نہیں دیتی ہے، اس کے برعکس درختوں کا قدرتی حال یہی ہوتا ہے کہ اگرچہ وہ سالہا سال کے طویل انتظار کے بعد تیار ہوتا ہے مگر اس کی جڑیں مضبوط سے مضبوط تر ہوتی ہیں، جتنا وہ اوپر دکھائے دیتے ہیں، اتنے ہی وہ زمین کے اندر چھپے ہوئے ہوتے ہیں، وہ سطح زمین سے گزر کر اس کی گہرائیوں سے اپنے لئے غذا حاصل کر لیتے ہیں، یہ ضرور یاد رہے کہ زندگی اچانک بھڑکنے اور جلد بجھ جانے کا نام نہیں ہے، بلکہ ہمیشہ اور دائمی طور پر سلگتے رہنے کا نام ہے۔

اس طرح قوم کی تعمیر کے میدان میں توسیع پسندی سے زیادہ استحکام کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے، استحکام کے بغیر توسیع یہی ہوتی ہے کہ جیسے بنیاد اور فاؤنڈیشن کے بغیر بلڈنگ کی تعمیر، قوم کی ترقی وتعمیر اور استحکام کی راہوں میں قوم کے ہادیوں اور رہنماؤں کو صبر آزما راہوں سے مرحلہ وار گزارنا ہوتا ہے، دراز سے دراز تر اور مسلسل محنت ومشقت کی ضرورت ہوتی ہے، پر کٹھن امتحانوں اور آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے، تب کہیں جا کر اس کے قومی ڈھانچے مستحکم ومضبوط ہوتے ہیں، جو قائدین چاہتے ہوں کہ ان پر یہ مراحل نہ گزریں اور بغیر اس کے تعمیر وترقی کے مدارج طے کر لیں، وہ اپنے مقصد میں کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

انانیت اور ہمارا مظلوم معاشرہ

ہم نے اپنے معاشرہ میں ایسے بہت لوگ دیکھے ہیں کہ وہ ہر کجا اپنی فوقیت کا برملا اظہار کر دیتے ہیں،کوئی مال و دولت کی بنیاد پر اور کوئی حسب ونسب کی برتری پر،کوئی اثر ورسوخ کے حوالے سے اور کوئی قوت وسطوت یا دوست واحباب کی بنیاد پر،مگر ہم سمجھتے ہیں کہ ان کا یہ غرور وتکبر بہت ہی ناسزاوار عمل ہے،انسان کو سمجھنا چاہئے کہ وہ آدم زاد ہے،بسا اوقات ایسے تکبر اور گھمنڈ کی بیماری میں مبتلا ہونے والے افراد کو صرف اپنی برتری اور عظمت کا احساس نہیں ہوتا، بلکہ وہ دوسروں کی تحقیر کرنے کی علالت میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اور اس علالت کے در پردہ دراصل وہ اپنی انا کی تسلی چاہتے ہیں، انسان کی کوتاہیاں تو بے شمار ہیں، جب اس کی زندگی اس قسم کی بیماری سے بھر جاتی ہے تو وہ ہر کجا انسانیت کے حدیں پار کر لیتے ہیں، جو آگے چل کر انسانیت کے لئے ایک المیہ ثابت ہوسکتی ہے، اس موقع پر ضرورت انسانی اس نصیحت کی خواہشمند ہوتی ہے کہ انسان کو چاہئے کہ دوسروں کو اپنی نظر میں حقیر نہ سمجھیں، اور اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے دوسروں کو استعمال نہ کریں۔

مصیبت ایک طرف یہی ہے کہ میری قوم ظالموں کے ظلم وستم اور طاغوتوں کے جور واستبداد کی شکار ہے تو دوسری طرف معاشرے میں بعض ایسے افراد پائے جاتے ہیں کہ جن کے غرور ونخوت اپنے دشمن کے خلاف استعمال ہونے کے بجائے خود اپنے دوستوں کے خلاف استعمال ہوتی ہے، اس معاشرہ میں کچھ لوگ ایسے ہیں، جو مال و دولت اور کسی حد تک اثر ورسوخ کے مالک ہیں،مگر جب کسی موقع پر ان کی انانیت سامنے آجاتی ہے تو وہ خود اپنے گروہ کے دیگر انسانوں کو حقیر سمجھنا شروع کر دیتے ہیں،حتی کہ اس کا اظہار برملا محفلوں اور مجالس میں کر دیتے ہیں، اس موقع پر ان کو یہ احساس تک نہیں رہتا ہے کہ آیا وہ بذات خود یا اس کی قوم کن کن بلاؤں کی شکار ہے،آیا ایسے حالات میں انہیں اپنے فریضہ بھی ادا کرنا ہے کہ نہیں؟

ظاہر ہے کہ غلامی میں انسان کو اپنی ذاتی انانیت کا احساس زیادہ ہوتا ہے،شاید یہ اس لئے بھی ہو کہ وہ

جدھر جاتا یا جو کچھ دیکھتا ہے، اسے وہ محسوس نہیں ہوتا ہے، اس حالت میں اس کو ایک مصیبت نے دوسری مصیبت کی طرف دھکیل دیتا ہے، ایسے میں انسان انانیت کے شکار ہو کر دوسروں کو اپنی نظر میں فروتر سمجھنا سزاوار سمجھنے لگتا ہے، شاید روہنگیا مسلمانوں کے وہ حضرات جن کے ہاں کچھ مال و دولت یا اثر ورسوخ ہے،صرف اپنی برتری کو دنیا کے سامنے یا کم سے کم اپنی قوم کے سامنے لانے کو اپنا فریضہ سمجھ لیتے ہیں، ویسے ہم ایسے حضرات سے یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ ایسی مظلومیت کے حالات میں وہ صرف اور صرف اپنی انانیت کے لئے مرمٹنے کے بجائے اپنی قوم کے استحکام کے لئے مرمٹنے اور جان تلک کو قربان کر دینے کو تیار ہو جائیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے معاشرہ میں کچھ لوگ عام طور پر دوسروں کی کوتاہیوں اور خامیوں کے درپئے ہوتے ہیں، ایسے لوگوں کو چاہئے کہ وہ بذات خود اپنی کوتاہیوں اور خامیوں کو دریافت کرنے میں لگ جائیں، یاد رہے کہ اپنی کوتاہیوں اور خامیوں کی تلاش انسان کو متواضع بنا دیتی ہے، اور تواضع انسان کو اتحاد اور یک جہتی کا درس دیتا ہے، اس کے برعکس انسان جب دوسروں کی خامیوں کی دریافت میں لگ جاتا ہے تو اس کے اندر تواضع وانکساری کے بجائے غرور ونخوت اور تکبر و گھمنڈ پیدا ہو جاتے ہیں، ایسے میں دوسروں سے مل جل کر کام کرنا اس کے لئے مشکل سے مشکل تر ہو جاتا ہے، نفسیات کے ماہرین اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ ایک آدمی کے اندر ساری انسانی خصوصیات جمع نہیں ہو جاتیں، کسی میں ایک مثبت خصوصیت ہوتی ہے تو کسی اور میں دوسری، ہم دیکھتے ہیں کہ ایک آدمی بڑے بہادر اور جان باز ہے، تو اس نسبت سے اس کے اندر شدت بھی ہوتی ہے، اس طرح ایک آدمی شریف ہے تو اس شرافت کی نسبت سے اس کے اندر نرمی بھی ہوتی ہے، ایک آدمی حساس ہے تو اس کے احساسات کی نسبت سے اس کے اندر غصہ کا مادہ میں بھرا ہوتا ہے، اس طرح ایک آدمی ذہین ہے تو اس کی ذہانت کی نسبت سے اس کے اندر گرفت وتنقید کا مادہ پایا جاتا ہے، صرف یہی نہیں بلکہ نفسیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک آدمی میدان عمل میں بڑے شہوار ہے، مگر دوسری طرف میدان فکر وتدبر میں مستعد نہیں ہوتا، اس حال میں ایک مثبت اور روشن کردار کے چاہنے والی جماعت کے لئے ضروری ہوتی ہے کہ اپنی جماعت میں شامل ہوئے افراد کے روشن اور مثبت

پہلوؤں سے فائدہ اٹھائے، اور تاریک پہلوؤں کو یا تو کم کرنے کی کوشش کرے یا انہیں سرے سے نظر انداز کر دیا جائے، ویسے ایسے افراد کو کام میں لگایا جا سکتا ہے، اس تدبیر کے ناطے ہم اپنی جماعت میں شامل ہونے والوں کی صلاحیت و استعداد کو قوم و ملت کے مفادات میں استعمال کر سکتے ہیں، اور ان کی صلاحیت و استعداد کو کارآمد بنا سکتے ہیں، اور یاد رکھنا چاہئے کہ ایک قوم کی تعمیر نو صرف ایک تنہا انسان کا کام نہیں ہے، اس کے لئے انسانوں کی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا ہوگا، کئی آدمیوں کے مل کر کام کرنا اور وہ بھی کسی روشن مقصد کے لئے اس وقت ممکن ہوگا جبھی افراد قوم صبر و تحمل اور وسعت نظری اور عالی ظرفی کا مظاہرہ کریں، ان کے اندر ایک دوسرے کو برداشت کرنے کی صلاحیت پائی جاتی ہو، اور وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر الجھ کر نہ رہ جائیں، اور وہ کسی ناخوشگوار کردار کو یاد رکھنے کے بجائے ہر خوش گوار کردار کو یاد رکھنے کی کوشش میں لگ جائیں۔

قومی زندگی کے میدان میں ہم دیکھتے ہیں کہ کچھ لوگ اپنے دوسرے بھائی کو شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں، وہ دوسروں پر بھروسہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے ہیں، جس کی وجہ سے پوری قومی زندگی میں ایک طرح کی بے اعتمادی کی فضا چھائی ہوئی ہے، قوم کی تعمیر نو کے لئے انسانوں کا باہمی تعاون اور یک جہتی لازمی امر ہے، ہماری قومی زندگی میں شبہات کی ایسی مہیب فضا نے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کے امکانات کو مٹا کر رکھ دیا ہے، نفسیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک شبہ کئی شبہات کو جنم دیتا ہے، اس کے برخلاف اعتماد ہی اعتماد پیدا کرنے کا موجب ہوتا ہے، اگر کوئی آدمی اپنے دوسرے بھائی کو شبہ کی نظر سے دیکھتا تو فریق ثانی کے اندر بھی مختلف شبہات پیدا ہو جاتے ہیں، جن کی وجہ سے فاصلہ بڑھتا چلا جاتا ہے، اور تعاون و یک جہتی کا جذبہ ختم ہو جاتا ہے، اگر انسان اپنے بھائی کے ساتھ اعتماد کا معاملہ کرے تو فریق ثانی کے اندر بھی اعتماد و تعاون کا جذبہ پروان چڑھے گا، ویسے کام کو آگے بڑھنے بڑھانے میں مدد ملے گی۔

ہمیں اپنی نسل کے لئے سوچنا ہے

اپنی اگلی نسل کے حوالے سے ہم اپنے قومی مفکرین و مدبرین اور ارباب بست و کشاد اور رہنماؤں سے عرض کریں گے کہ آپ اپنی آنے والی نسلوں کے لئے ایک طاقتور، مضبوط، مستحکم و پائدار سیاسی و ثقافتی، انقلابی اور فکری معاشرہ تیار کرنے کے لئے ابھی سے کمر ہمت باندھیں، جس کے لئے لازم ہے کہ جوش و جذبات سے بلند ہو کے حقیقت پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اصولی بنیاد پر ایک قومی مفاد کا راستہ وا کر چھوڑیں، جس پر اگلی نسل چلنے کو تیار ہو سکے، اور وہ پچھلی منازل طے کرتے ہوئے اگلی منازل اپنی نئی اور توانا نسل کے لئے بنا چھوڑ جائیں، اگر ابھی ایک واضح اور مستقیم راہ کی ابتدائی بنیاد رکھی گئی تو امید نہیں بلکہ یقین بھی ہے کہ آنے والی نسلیں اگلی منزل کی طرف رواں دواں ہو جائیں گی، اگر آج کی ہماری قیادت نے اپنے حصے کا کام نہ کیا تو آگے آنے والوں کو آگے کے بجائے پیچھے سے اپنا سفر شروع کرنا پڑے گا، اس لئے کہ انسان کا سفر وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں وہ کھڑے ہوں، نہ کہ وہاں سے جہاں وہ پہنچنا چاہتا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری قومی سیاست کی اصولی بنیاد ابھی نہ صرف رکھی ہی نہیں گئی بلکہ رکھنے کی فکر بھی معدوم ہے، تو ظاہر ہے کہ جس بلڈنگ کے نیچے کی دیواریں ابھی تیار بھی نہیں ہوئی ہوں، اس مکان کی بالائی منازل کس ڈھانچے کے اوپر کھڑی کی جائیں گی؟ دراصل ہماری قوم کی موجودہ حالت اس بات کی پوری طرح شاہد و غماز ہے کہ ہم نے ابھی تک اپنی اگلی منزلوں کے لئے راہ بنانے کا عزم ہی نہیں کیا ہے، بلکہ ہم بس ایک جذباتی انداز میں اپنا سفر طے کرنے کا عزم کئے ہوئے ہیں۔

جو نسل ایک ایسی زندگی کی وارث ہو جس نے وراثت میں بس جذباتی عمل ہی پایا ہو تو ایسی نسل کے لئے آبادی و آبادکاری ممکن نہیں، بلکہ بربادی اس کا مقدر ہو سکتی ہے، ہماری قیادت ایک ایسی علالت کی شکار ہو چکی ہے کہ جس نے زندگی میں خوش فہمی کی غذا کھاتے کھاتے حقیقت پسندی کا مزاج ہی کھو بیٹھا ہے، وہ اس خوش فہمی کے نتیجے میں اپنی تمام تر صلاحیات اور مواقع ضائع کر چکی ہے، قوم کی اعلی

قیادت کا یہی حال رہا ہوتو ظاہر ہے کہ ہماری آنے والی نسلیں آگے کی منزل سے اپنے سفر بھی شروع نہیں کرسکیں گی، اور اگر آنے والی نسلیں ہشیار ہیں تو اس کو ضروری طور پر اپنا سفر وہاں سے شروع کرنا پڑے گا جہاں سے ان کے اجداد نے اپنا راستہ چھوڑا تھا، اگر وہ نسل بھی سوچنے اور کام کرنے سے شدید قاصر رہی تو وہ بھی اپنے آباواجداد کے مشاغل اپنائے گی، جس کی وجہ سے وہ بھی اپنی آنے والی نسل کے لئے بس بربادی کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں چھوڑ سکے گی، اس لئے ہماری آج کی قیادت کو اپنی اگلی نسل کے لئے بہت کچھ سوچنا چاہئے، ورنہ ملک وقوم اور ملت کے تمام مفادات دھرے کے دھرے رہ جائیں گے، خدا نہ کرے کہ ایسا ہی ہو۔

ہماری بے معنی کی کوشش

زمانہ ایک خاص رفتار پر چلتا رہتا اور خود بخود بدلتا بھی رہتا ہے، جہاں تک ہم دیکھتے ہیں کہ بدلے ہوئے اس زمانے میں انسانی زندگی کے تمام دروازے کے تالے بدل چکے ہیں، تو ظاہر ہے کہ جہاں تالے بدل چکے ہوں گے، وہیں کنجیاں ضرور بدل چکی ہوں گی، لیکن ہمارے مابین کچھ ایسے انسان بھی ہیں جن کا دعوی ہے کہ ان کے پاس انسانی زندگی کے ابواب پر لگائے گئے تمام تالوں کی کنجیاں موجود ہیں، مگر ان کو یہ معلوم نہیں ہے کہ جو کنجیاں ان کے پاس موجود ہیں، یہ وہ کنجیاں نہیں جن سے وہ تالے کھل پائیں گے، یعنی ان کے پاس پرانی کنجیوں کا ایک کچھا ضرور موجود ہے۔ مگر جس طرح عرض کی گئی ہے کہ سارے دروازے پر لگائے گئے تالے نئے اور بدلے ہوئے ہیں، بدقسمتی سے زندگی کے ان دروازوں پہ لوگ ہنگامے مچا رہے ہیں کہ کنجیاں ہیں مگر تالے کھلتے نہیں ہے، یعنی اب ان پرانی کنجیوں سے تالے نہیں کھلے جا رہے ہیں، تو ان کو کبھی تالے بنانے والوں پر برہم اور کبھی سارے ماحول پر خفا ہوتے دکھائے دے رہا ہے، حالانکہ جب تالے سرے سے بدل چکے ہیں تو ان کے لئے ضروری تھی کہ ان نئے تالوں کو کھولنے کے لئے نئی کنجیاں حاصل کر لیتے۔

آج کل دنیا اپنی مخصوص ڈگر پر چل رہی ہے، حقیقت اور واقعات نگاری کے اس دور میں جذباتی تقریریں اور تحریریں ہمارے لوگوں کی زبان وقلم میں پائی جاتی ہیں، اہلیت وصلاحیت کی بنیاد پر اپنے جائز حقوق حاصل کرنے کے اس دور میں ریزولیشن کے ذریعے مطالبے، تعمیری استحکام کے ذریعے بلندی پر چڑھنے والے اس دور میں جلسوں جلوسوں کے ذریعے قوم کی تقدیر بنانے اور مستقبل سنوارنے کی کوشش، سماجی بنیاد پر کام کرنے کی اہمیت کے اس دور میں سیاسی سودہ بازی کے بل بوتے پر پروگرام، یہ سب ویسی چیزیں ہیں، جن کی بنیاد پر انسان کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا، ایسی حالت کے شکار افراد کے انجام موجودہ دور میں صرف اور صرف ایسا ہوسکتا ہے کہ وہ نفسیاتی مریض ہو کر نڈھال ہوجائیں، ویسے ہمارے یہ لوگ آہستہ آہستہ مثبت ذہنیت کے مالک ہونے کے بجائے منفی

ذہنیت کے انسان ہوکر رہ گئے ہیں، غرض آج کی دنیا میں ایسے انسانوں کے لئے کوئی بھی جگہ نہیں رہی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ زندگی کے اس سفر میں ہمارا ہر قدم حقیقت اور واقعات کی بنیاد پر اٹھائے جانے کی ضرورت ہے، نہ کہ خوش فہمیوں اور موہوم امیدوں کی بنیاد پر، اور زندگی کے لمحات کبھی اجالے کے ہوتے ہیں اور کبھی اندھیرے کے، اگر زندگی کے ان لمحات کی کسی بھی طرح رعایت نہ کیجائے اور آنے والے لمحات کا لحاظ کئے بغیر بے خبری میں اگلا سفر شروع کر دیا جائے تو آنے والے کوئی بھی لمحہ ہماری رعایت نہیں کرے گا، کیوں کہ وہ اپنے فطری نظام کے تحت چلتا ہے، نہ کہ ہماری خوش فہمیوں کے تحت، جس کا نتیجہ یہی نکلے گا کہ کبھی ہم سمجھیں گے کہ ہم روشن مستقبل اور شاندار انجام کی طرف قدم بڑھا رہے ہیں، حالانکہ اگلا لمحہ جبھی آئے گا تو یہی معلوم ہوگا کہ ہم تو اندھیاری کی طرف مسلسل بڑھتے چلے جا رہے ہیں، اس حوالے سے ہمیشہ یاد رہے کہ:

چراغ گھر کا مسجد کا ہو یا مندر کا
ہوا کے پاس کوئی مصلحت نہیں ہوتی

برہمی موجب ہلاکت ہے

ہماری قومی و ملی زندگی میں ہم نے دیکھا کہ مختلف اسباب و وجوہات کی بنیاد پر ہمارے مابین اختلافات پیدا ہوتے ہیں، ان اسباب میں کچھ اصولی ہوتے ہیں اور کچھ فروعی، مگر بسا اوقات ایسے ہوتے ہیں کہ ہم بہت ہی فروعی مسائل میں الجھ کر ایک دوسرے کے خلاف برہم اور ناراض ہوجاتے ہیں، اب جب افراتفری کا عالم شروع ہوتا ہے تو ہم میں کوئی آگے بڑھ جاتا ہے اور کوئی پیچھے ہوکر رہ جاتا ہے، ان میں سے بعض کے اندر حسد وعناد کا جذبہ پیدا ہوجاتا ہے تو بعض کے اندر احساس محرومی پیدا ہوجاتا ہے، اب ہوتا یہ ہے کہ ایسے احساس محرومی نے باہمی مقابلہ پر اکسالاتا، حتی کہ مابین میں معاملہ انتقام کے مرحلہ میں داخل ہوجاتا ہے، آج کل اس قسم کے جذبات ہمارے سیاسی اور ثقافتی، ملی اور روحانی، تحریکی اور انقلابی ماحول میں عام ہوگئے ہیں۔

اب ہمیں اپنے قومی مفاد کے پیش نظر منفی جذبات کو ختم کرنا ہے، ورنہ ہم نادانی پر نادانی کرکے باہمی رسہ کشی کے ذریعے مزید نقصان اٹھائیں گے، ایسے میں ہم اتفاق واتحاد کے کسی فارمولہ پر جا نہیں سکتے، سردست میری عرض یہ ہے کہ اگر ہم کسی اتحاد واتفاق کے فارمولہ پر نہیں جاسکتے ہیں تو کم سے کم ہمارے لئے ضروری ہے کہ باہمی رسہ کشی سے دور رہیں، منفی تنقید سے گریز کریں، اور یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ ہر کسی کو اپنے قومی وملی مفاد پر کام کرنے کی آزادی ہوتی ہے، ہمیں کسی بھی فرد یا جماعت پر اس انداز سے سوچنا چاہئے کہ آیا اس کے اعمال اور کردار کسی بھی اعتبار سے قومی وملی مفاد میں ہیں کہ نہیں؟ اگر ہیں تو ٹھیک ہیں ورنہ سردست اس کو نصیحت و ہدایت کے ذریعے راہ راست پر لانے کی کوشش ناگریز ہے۔

ہمارے اس درپیش حالات میں ایک دوسرے کے خلاف خواہ مخواہ مشتعل ہوجانا سراسر نادانی اور کور بینی کے سوا اور کچھ نہیں، یاد رہے کہ ہمیں ہر مرحلے میں صبر وحکمت کا راستہ اختیار کر کے اپنے منفی جذبات کو دبائے رکھنا بہت ضروری ہے۔

ہمارے سیاسی وانقلابی ماحول میں ایک بات یہ ہوتی ہے کہ معمر سے معمر سیاست دان بھی الفاظ کے تیر سہنے اور برداشت کرنے کے بجائے جلد اور جلد مشتعل اور برہم ہوجاتے ہیں، ان کو یہ احساس بہت کم رہتا ہے کہ سیاست وقیادت کے میدان میں اترنے سے لوگ تنقید کا نشانہ ضرور بنتے ہیں، میری ان حضرات سے گزارش ہے کہ آپ اس میدان میں مخاطب کی تنقید سن کر جلد برہم نہ ہوجائیں، تنقید کے بعد اگر آپ اپنے آپ کو سنبھال سکتے ہیں تو آپ کو اس میدان میں رہنے کا حق ہے، ورنہ الوداعی کلمات کے بعد آپ کو سیاسی وانقلابی میدان سے غائب ہوجانا چاہئے، اس حوالے سے یہاں یہ بات اچھی طرح یاد رہے کہ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ناقدین کے خلاف برہمی اشتغال کا سبب بن جاتی ہے ، اس کے برخلاف یہ ہوتا ہے کہ ناقدین کی تنقید کے بعد آپ کے صبر واستقلال ان کو خاموش کر دیتا ہے، بلکہ وہ آپ کے حامی بن جاتے ہیں، ویسے بے صبر قائدین کو عرض کروں گا کہ ناقدین کی تنقید کے خلاف ایسے مثبت کلمات اپنی زبان سے نکالیں ، جو ناقدین کے دل میں اثر کر جائیں، جس کے بعد وہ خود تائب ہوکر آپ کے دربار میں حاضر ہوجائیں گے۔

میری قوم کے قائدین سے گزارش ہے کہ آپ حضرات ان درپیش حالات میں ٹھنڈے دل ودماغ سے کام لیں، آپ اور آپ کی قوم مصیبت کے جال میں پھنس چکی ہے، ان حالات میں آپ کی قوت برداشت پہاڑوں کی طرح غیر متزلزل ہونی چاہئے ، جال میں پھنسے ہوئے چڑیے زیادہ پر پڑاتے ہیں تو وہ مزید پھنس جاتے ہیں، ان حالات میں بے صبری اور اشتعال ہلاکت کا موجب ہے، آپ پر تنقید کی گئی تو آپ اس تنقید سے فائدہ اٹھانا سیکھیں، کبھی بھی ایسا نہ ہو کہ ان تنقید کرنے والے بھائیوں کو آپ انتقام کے جذبات سے مغلوب ہوکر نشانہ بنالیں، اس لئے کہ انتقامی جذبے نے انسان کو ترقی کرنے کا موقع نہیں دیتا، بلکہ جرائم پیشہ بنا دیتا ہے، آپ ایسا اقدام کبھی بھی نہ کریں کہ ناقدین آپ کے اقدام سے ہلاکت کی وادی پس پہنچ جائیں۔

ہماری قومی سیاست کے افق پر جو قائدین نظر آرہے ہیں، ان کے اندر بلند حوصلگی اور عالی ظرفی کا بڑا فقدان ہے، وہ چھوٹے سے چھوٹے خطرات کے وقت گبھرانے لگتے ہیں، کبھی خطرات سے برہم ہو جاتے ہیں، ایسی برہمی لازمی طور پر ہلاکت کا موجب ہوتی ہے، خطرات کے وقت اپنی مثبت کوشش

کے بجائے ان کے اعصاب جواب دینے لگتے ہیں، حتی کہ وہ اس قابل تک نہیں رہتے کہ صورت حال کے متعلق سوچ سمجھ کر صحیح اور برمحل فیصلہ کریں، ان کو خطرات کے دوران اپنے ذہن کو حاضر رکھنا ضروری تھا، لیکن وہ اس کے برخلاف خطرات سے بے چین ہوکر غلط فیصلہ کر لیتے ہیں، تو ایسے کم حوصلے کے مالک انسانوں سے ایک بڑے کام کی توقع نہیں رکھی جاسکتی۔

انسانی دنیا میں وہ لوگ کامیابی سے ہم کنار ہوتے ہیں، جن کے اندر بلند حوصلگی اور عالی ظرفی ہوتی ہے، جو کسی بھی خطرات سے مقابلہ کرتے ہوئے آگے بڑھ جانے کی صلاحیت رکھتے ہیں، بڑے کام کرنے والوں کو خطرات سے گبھرائے بغیر جرات سے قدم بڑھانے کی ضرورت ہوتی ہے، یاد رکھیں کہ یہ ایک ایسی دنیا ہے جس میں غلطی کرنے والے افراد ہی صحیح کام کرنے کے لائق ہوتے ہیں، جو انسان میدان عمل وتطبیق میں غلطی کے خوف سے مغلوب رہے گا، وہ زندگی کے دوڑ میں سراسر پیچھے رہ جائے گا، کام کرتے وقت صحیح کام کرنے کے درپے ہونا بجا ہے، البتہ کسی غلطی کے شکار ہوئے تو کبھی برہم نہ ہونا چاہئے، اور یہ بھی یاد رہے کہ انسان صرف اقدام کی صحت کے پیچھے بھاگنے سے کام کرنے کی صلاحیت سے محروم ہوجاتا ہے۔

ہم ایک تغیر پذیر دنیا میں ہیں

اسلام ایک مکمل اور طاقتور نظام حیات ہے، اس کی نظریاتی اور روحانی طاقت کا پوری دنیا کو اعتراف ہے، اس کے اندر ایسی طاقت موجود ہے، جس نے کبھی ایک بڑی دنیا کو فتح کرلیا تھا، آج ہم جس اسلامی دنیا سے واقف ہیں، اسے اسلام کی نظریاتی اور روحانی طاقت نے فتح کرلیا تھا، دور اول کے مسلمان عرب سے نکل کر دنیا کے گوشے گوشے میں پھیل گئے تھے، جس نے ایک زبردست مہم کے ذریعے جگہ جگہ میں اسلام کے مراکز اور مدارس قائم کئے تھے، اور ان مدرسوں کے ساختہ پرداختہ انسان دوسری جگہوں میں پھیل گئے تھے، انہوں نے ایک قلیل عرصے میں ایک دنیا کو روحانیت یعنی اسلام کی لازوال روشنی سے بھر دیا تھا، حتی کہ بعض علاقوں کے ماضی کی تہذیب و ثقافت، رسم ورواج نہ صرف بلکہ زبان وادب تک کو بدل کررکھ دیا تھا، وہ تھے ہمارے آباؤ واجداد کہ جن کے روشن کردار نے اسلام کی حقیقی طاقت کا پوری دنیا کو اعتراف کرنے پر مجبور کردیا، جنہیں ہمیں ہر حال میں یاد رکھنا چاہئے۔

ادھر قرآن پاک کی شکل میں ہمارے پاس ایک دائمی اور لازوال معجزہ موجود ہے، یہ وہ کلام پاک ہے، جس کے ذریعے خالق کائنات اپنے بندوں کے ساتھ ہم کلام ہوا، یہ وہ کلام پاک ہے، جو آج بھی دلوں کو گرماتا اور سوز دروں پیدا کرتا ہے، یہ وہ کلام پاک ہے، جو انسان کے سوئے ہوئے جذبات کو بیدار کرتا اور بیدار ہونے والوں کو سرگرم عمل بنادیتا ہے، اس کے بلند وبالا مضامین، انسانیت کو بیدار کرنے والی زبان وادب، اس کی حلاوت وشیرینی اتنی حیرت انگیز ہے، جو بھی اسے احترام اور محبت سے تلاوت کرے، اور اس پر سوچے اور تدبر کرے، اس کی صداقت اور حقانیت اس پر ایمان لانے پر مجبور کردیتی ہے، اس طرح رسول انسانیت کی زندگی جو دراصل قرآن کریم کی روشن اور لازوال تفسیر ہے، وہ بھی انسان کی انسانیت کو بیدار کرنے اور بیدار ہونے والوں میں سوز دروں پیدا کرنے میں بے پناہ صلاحیت رکھتی ہے۔

دور اول کے داعیوں، مبلغوں اور مرشدوں نے جن جن علاقوں میں مدارس اور مراکز قائم کئے تھے، انہوں نے اپنے مدارس ومراکز میں قرآن کریم اور سیرت رسول کی تعلیم دی تھی، جس کے ذریعے انہوں نے ایک دنیا کو فتح کرڈالا تھا، انہوں نے ان مراکز میں سیدھی سادی عربی زبان کی تعلیم دی تھی، جس کے ذریعے انسانوں کو براہ راست قرآن کریم اور سیرت رسول انسانیت سے وابستہ کردیا تھا، یہ وہ ادارے تھے جہاں ایمان ویقین کے ساتھ انسان کی فطرت کو جگایا تھا، اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب باصفا کی انقلاب انگیز زندگیوں سے متعارف کرایا تھا، ان کی زندگیوں نے انسان کے اندر وہ آگ بھڑکائی، جس نے ان کو خالق کائنات کے دین کے لئے جینے مرنے کی تلقین کی تھی، ویسے ایک اسلامی فوج تیار ہوگئی تھی، جن کی بابرکت کردار وعمل کے ناطے آج ہم اللہ تعالی کے لازوال دین سے واقف ہیں۔

ادھر آج ہم دنیا کے گوشے گوشے میں انگنت اسلامی مدارس ومراکز دیکھتے ہیں، مگر ان کو دیکھ کر ترس آتا ہے کہ آخر ان مدارس ومراکز سے مجموعی طور پر وہ انسان کیوں پیدا نہیں ہوتے، جس طرح دور اول میں پیدا ہوئے تھے؟ دیکھنے میں تو ان کے بلند وبالا ڈھانچے ہیں، پڑھنے پڑھانے کی سہولیات بھی تو دور اول کی نسبت سے کہیں زیادہ، آخر وہ بنیادی اسباب کیا ہیں، جنہوں نے دور اول جیسے انسان پیدا کرنے کی راہ میں رکاوٹ پیدا کردی ہے؟ ان کے تعلیمی نظام میں وہ کون سی خامیاں ہیں، جنہیں ہٹانے سے دور اول کے اصول پر انسان پیدا کئے جا سکتے ہیں؟ ان سوالات پر غور کرنے کی شدید ضرورت محسوس ہورہی ہے۔

ہمیں شدید احساس ہے کہ قرآن کریم اپنے پڑھنے والوں کے دلوں کو خوف خدا سے دہلا دیتا ہے، اور اس کے ساتھ ہی ساتھ نئی نئی امنگیں بھی پیدا کردیتا ہے، لیکن ان مدارس کا حال یہ ہے کہ یہاں قرآن کریم کا بس ایک ضمنی مقام ہے، یعنی اس کا مقام زیادہ نہیں رہا ہے، رسول انسانیت کی حیات طیبہ اور آپ کے اصحاب باصفا کی زندگیاں اور ان کے عملی حالات جو انسان کے لئے آتش فشاں کی حیثیت رکھتے ہیں، انہیں یہاں پڑھایا ہی نہیں جاتا، احادیث وآثار رسول کا حال یہ ہے ان پر عنوان بنا بنا کر جزئیات فقہ کے کچھ مسائل پر لامتناہی بحثیں تو چھیڑ دی جاتی ہیں، مگر یہاں انسان کے لئے عملی زندگی

گزارنے کے فن پر توجہ نہیں دی جاتی، علاوہ ازیں علوم آلیہ کے نام پر جو فنون پڑھائے جاتے ہیں، وہ اتنے فرسودہ اور بے کار ہیں کہ پڑھنے والوں کے دل میں جمود و تعطل پیدا کر کے بس انہیں لایعنی اور لفظی موشگافیوں کے عادی بنا دیتے ہیں، یہاں سب سے بڑی بات یہ ہوگئی ہے کہ ان اداروں نے اپنے کچھ زندہ اور مردہ اکابر بنا لئے ہیں، جہاں اللہ تعالی کی بڑھائی اور کبریائی کے ساتھ ساتھ ان بزرگوں کی بڑھائی اور کبریائی کا درس بھی دیا جاتا ہے، ان حالات میں کیسے ممکن ہے کہ ان اداروں سے وہ برگزیدہ انسان پیدا ہوں، جس طرح دور اول کے مدارس اور مراکز سے پیدا ہوتے تھے؟ یہاں سے اعلی مقاصد و کردار کے انسان کیسے نکلیں گے؟ یہاں سے اسلام کا وہ سیلاب وطوفان کیسے اٹھے گا، جو طاغوت کے سارے ایوانوں کو متزلزل کرنے کے لئے کافی ہو؟

سرزمین ارکان کے گوشے گوشے میں بنے بنائے گئے حالیہ مدارس اسلامیہ اور مراکز دینیہ بھی باوجود دیگر خوبیوں کے ان میں وہ کیفیات مفقود ہیں، جو دور اول کے مدارس اور مراکز میں تھیں، جیسے کہ یہاں ایسے فرسودہ فنون پڑھائے جاتے ہیں، جن کے ساختہ و پرداختہ افراد سے وہ امید نہیں کی جاسکتی، جس طرح دور اول کے افراد سے کی جاتی تھی، اس امت کی آخری اصلاح اس ڈھب پر ہونی چاہئے کہ جس طرح دور اول میں ہوئی تھی، اس امت کے ابتدائی حصے کے اندر جو انقلاب آیا تھا، اور ان کی جو حیرت انگیز زندگی تھی، وہ براہ راست قرآن کریم اور سیرت رسول اور اصحابِ باصفاء کی زندگی سے ہوئی تھی، آج بھی ان چیزوں کو بنیاد بنا کر انسان کی زندگی میں حیرت انگیز انقلاب لایا جاسکتا ہے، مدارس کے ڈھانچے جس طرح اور جس علاقے میں بھی کیوں نہ ہوں، نظریاتی، فکری اور روحانی اعتبار سے دور اول کے مدارس و مراکز کے طرز پر اپنانے کی شدید ضرورت ہے، آج بھی اسلام کی احیاء اور اس کے استحکام کے لئے ایسی تعلیم کی اشد ضرورت ہے جس کی بنیاد قرآن کریم، احادیث رسول اور سیرت رسول انسانیت پر ہو، نہ کہ بعد میں پیدا ہونے والے ان نام نہاد فنون کی بنیاد پر جنہوں نے اسلام کے حقیقی نظام تعلیم میں منفی کردار ادا کیا تھا، اور امتِ مسلمہ کی زندگی کو معطل و منجمد کر کے رکھ دیا ہے۔

ظاہر ہے کہ ہمارے مدارس کے نصاب تعلیم میں قرآن کریم اور احادیث رسول کو ثانوی درجہ حاصل رہا ہے، باوجود یکہ وہ علوم وفنون، جن کی طرف راقم کا اشارہ ہے، جنہیں علوم آلیہ کہہ کہہ کر یہاں پڑھایا

جاتا ہے، بس ان پر طالب علموں کی تعلیمی زندگی ختم کر دی جاتی ہے، جبکہ برخلاف اس کے قرآن و احادیث اور سیرت رسول پر سرسری تعلیم پر اکتفا کیا جاتا ہے، دراصل اسلامی علوم کی شکل میں بعض ایسے فنوں کو یہاں اولیت حاصل ہے جنہوں نے امتِ مسلمہ کی زندگی کو متزلزل کر کے رکھ دیا ہے، مثال کے طور پر یونانی فلسفہ، جسے یہاں علوم عقلیہ کا نام دیا گیا ہے، یہ وہی علوم ہیں جنہوں نے انسانوں کو عقلیت کے نام پر بے عقل بنا دیا ہے، اسی طرح فقہ، فلسفیانہ تصوف اور یونانی فلسفہ وعقلیات کی روشنی میں بنے بنائے علم کلام کی تعلیم کا حال ہے، جو دراصل سارے کے سارے بعد میں بنے بنائے گئے علوم وفنون ہیں، جن پر زیادہ زور دینے سے بڑا نقصان یہ ہوا ہے کہ قرآن، سنت، سیرتِ رسول اور آثارِ صحابہ کے سرا امت کے نونہال بلکہ پوری امت ہی سے چھوٹ گیا ہے، مذکورہ بالا فقہ سے میرا مطلب فقہ کا وہ حصہ ہے جس کی بنیاد یونانی عقلیات کی اساس پر رکھی گئی ہے، نہ کہ قرآن و سنت و آثار صحابہ کی روشنی پر، دراصل مذکورہ بالا ان علوم کے اضافوں نے دین کو ایک قسم کا فن بنا دیا ہے، قرآن کریم میں جو حقائق سادہ اور فطری انداز میں بیان کئے گئے، ان میں ان علوم کی وجہ سے لفظی موشگافیاں پیدا ہوگئیں، اور ساتھ ہی ساتھ بے شمار فنی اصطلاحات گڑھ لئے گئے ہیں، جن کی وجہ سے دین فطرت ایسے احکام ومسائل کا مجموعہ بن گیا ہے، جن تک رسائی عام انسانوں کی بس کی بات نہ رہی، بلکہ ان تک رسائی کے لئے ان کتابوں اور لفظی موشگافیوں سے بھرے ہوئے خزانوں کا مطالعہ ضروری ہوگیا ہے، جن کا قدرے تذکرہ اوپر کیا گیا ہے، یوں انسان براہ راست کتاب الہی سے مستفید ہونے سے قاصر ہوگیا ہے، حتی کہ ہمارے مدارس کا حال یہی ہے کہ ایک طالب علم یا مطلوب علم اسلام کی دعوت کو عقلی انداز پر سوچنے کی فکر میں قرآن کریم کی طرف رجوع نہیں کرتا بلکہ معقولاتِ یونانیہ کی طرف رجوع کرتا اور ان میں غرق ہو جاتا ہے، ان کے مطابق اسلامی فن کی باریکیاں صرف اور صرف معقولات کی کتابوں سے دستیاب ہوسکتی ہیں، خدا کی کتاب سے محرومی کا یہ حال ہے کہ ہمارے مدارس میں بلکہ ہماری پوری زندگی میں اس کی چھاپ ختم ہوگئی ہے، الامان والحفیظ۔

اہلِ نظر جانتے ہیں کہ قرآن کریم کا اسلوب بالکل فطری اور سادہ ہے، یہ دہی اسلوب ہے جو انسانی فطرت کے ساتھ گہری مطابقت رکھتا ہے، قرآن کریم کا اسلوب بیان انسان کو فطری طور پر حقائق اور

معانی کی طرف متوجہ کرتا ہے، جبکہ انسان کے بنائے گئے وہی علوم، جن کا تذکرہ اجمالی طور پر ان سطور میں کیا گیا ہے، انسان کو فروعات وجزئیات میں غرق کردیتے ہیں، قرآن وسنت کے انداز بیان انسان کے اندر تدبر اور تفکر کی کیفیات پیدا کردیتا ہے، جبکہ وہی علوم وفنون کی لفظی موشگافیوں اور بحث وجدل کی لاتناہی سلسلوں نے انسان کو شک وشبہ اور قیاس آرائیوں کے تیہ میں غرق کردیتا ہے، قرآن کریم اورسنت نبویہ کے انداز کلام انسان کے سوئے ہوئے جذبات کو جگاتے اور احساس پیدا کرتے ہوئے خدا کی شان قدرت کو ان کی آنکھوں میں پھرا دیتا یا ہے، جبکہ فنی علوم منطقی اور فلسفی موشگافیوں کے ذریعے سارے سلجھے ہوئے مسائل کو الجھا کر رکھ دیتے ہیں، آج مدارس میں ان علوم وفنون پر زیادہ سے زیادہ زور دینے کی وجہ سے ہمارے تمام مسائل الجھ کر رہ گئے ہیں، یہاں سے انسانوں کی ایک ایسی جماعت پیدا گئی ہے جس کی نظر بحث وجدل (اور وہ بھی سرے سے لایعنی) کی طرف ہے ،ان کی نظر مسائل کو سلجھانے کے بجائے الجھانے کی طرف مرکوز ہے، ہمارے ان حالات کی اصلاح کی ایک شکل یہ ہے کہ قرآن وسنت کو اپنی حقیقی معنوں میں انسانوں کے لئے دین اخذ کرنے کا ذریعہ بنایا جائے، اور یہ بتایا جائے کہ انسان کے تمام مسائل کا حل سادہ کلام اللہ اور سنت رسول اللہ اور آثار وتعامل صحابہ میں مل جاتا ہے، بس ان کی طرف زیادہ توجہ دینے کا انسانوں کو عادی بنایا جائے، انسانوں کے اندر صحیح دینی فکر پیدا کرنے کے لئے ان یونانی فنی کتابوں کے برعکس قرآن کریم ، احادیث نبویہ اور آثار صحابہ کو علم دین کا ماخذ بنایا جائے ، اگر اس وقت بھی دنیا میں دور اول جیسے انسان پیدا کرنے ہیں تو لازم ہے کہ علوم قرآن ،علوم احادیث ،سیرت رسول اور آثار صحابہ پر مشتمل ازسرنو سادہ انداز میں کتابیں مرتب کی جائیں، پھر فقہی، کلامی، معقولاتی اور فنی تصوفی انداز کلام کی کتابوں کو تاریخ کے یادگار خانوں میں دفن کردیا جائے۔

عباسی دور میں جو کلامی لٹریچر تیار ہوا تھا، وہ اسلام کے لئے دراصل ایک چیلنج بن کر ابھرا تھا، آج معقولات کے علاوہ وہی علوم جو عربیت کے لئے علوم آلیہ کا مقام پر ہیں، وہ بھی اسلام کے لئے چیلنج بن گئے ہیں، ہمارے مدارس میں معقولات اور معقولات کے زیر اثر جو علوم ہیں، وہ سارے کے سارے نامعقولات ہیں، ان کی بنیاد ہی ایسے عقلی اور فلسفیانہ مفروضات اور قیاسات پر مبنی ہیں، جو آج کے

سائنسی دور میں بالکل غلط ثابت ہو چکے ہیں، شاید کسی زمانہ میں انہیں معقول بھی سمجھا گیا ہوگا، مگر آج کے دور میں نامعقول ہونے میں کسی قسم کا شبہ نہیں رہا ہے، بدقسمتی سے ہمارے مدارس کے نصاب تعلیم میں وہ چیزیں بھر دی گئی ہیں جو نہ ہمارے دین کے لئے ضروری ہیں اور نہ دنیاوی زندگی کے لئے لازمی ، بلکہ ان پر عمل درآمد کی وجہ سے ہماری دینی تعلیم اصل جگہ میں نہ رہی، اور بنیادی زندگی بھی ہزاروں مشکلات کا سامنا کررہی ہے، مدارس میں ان علوم کو درس کا مستقل حصہ بنالینا اور اس پر اٹل ہو کر اصرار پر اصرار کرتے رہنا کہاں تک معقول ہوسکتا ہے؟ صحیح بات یہی ہے کہ آج مدارس کا نظام تعلیم ایسی غلطی کا شکار ہو گیا ہے، جس طرح ماضی میں عیسائیوں کا تعلیمی نظام شر وفساد کا منبع بن چکا تھا ، ہمارے دینی مدارس بڑے اخلاص للّٰہیت کے ساتھ ایسے انسان تیار کررہے ہیں، جو آج کی دنیا میں نہیں بلکہ شاید پانچ سو سال پہلے کی دنیا کے لئے کارآمد تھے، ماشاءاللہ ان کی مخلصانہ کوشش وکاوش کے نتیجے میں ایسے افراد تیار ہورہے ہیں، جو اس تغیر پذیر دنیا میں اسلامی افکار کو دنیا کے سامنے اظہار کرنے میں شدید قاصر ہیں، جن کا غیر معقول طریقۂ استدلال یہ ثابت کرتا ہے کہ اسلام ایک ایسا نظام حیات ہے، جو سائنس کے اس دور میں انسان کے مسائل حل کرنے میں ناکام ہے، اب ضرورت اس بات کی ہے کہ نئی ذہنی تقاضوں کی روشنی میں ہمارے نصاب تعلیم کے لئے ایسے لٹریچر تیار کئے جائیں، جو دور حاضر کے مسائل حل کرسکتے ہوں، اگر ہم آج تک اس فرسودہ نصاب کی تلاوت میں مصروف ومشغول رہیں گے، تو ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ خود مدارس کے تہ خانوں سے ہمارے خلاف آواز بلند ہوگی، جس کی وجہ سے رہے سہے دینی تعلیم پر شدید دھچکہ لگے گا، اور اسے روکنے میں ہم شدید ناکام رہیں گے۔

دنیا میں ہر آن تغیر ہے، ہر چیز بدلتی ہے اور بدلنے پر مجبور ہے، اس قانون سے عالم کو رونق اور ترقی ہوتی ہے، انسان بھی ظاہر ہے کہ اس کا تابع ہے، اس میں بھی پر لحظہ ہر آن تغییر رہتا ہے، یہاں تک کہ سات سال بعد وہ سر سے لے کر پاؤں تک بالکل نیا ہوجاتا ہے، اور ایک ذرہ بھی پہلے کا نہیں رہتا، اب کیا وجہ ہے کہ ہمارے فرسودہ تعلیمی لٹریچر بدل نہیں سکتا؟ کیا وجہ ہے کہ زمانے کے ذہنی تقاضوں کے مطابق اس کی ترتیب نہیں ہوسکتی؟۔

قدیم یونی فلسفہ اور معقولات ہی کو دنیا سے مٹادیا جائے تو قرآن وسنت کو سمجھنے اور سمجھانے میں کسی قسم کی

پریشانی نہیں ہوگی ، بلکہ اس کے برعکس قرآن وحدیث کو سمجھنے میں آسانی ہوگی ، کیوں کہ ظاہر ہے کہ قرآن وسنت کی ترتیب ہی یونانی منطق ومعقولات کی مصطلحات میں نہیں کی گئی ،جس زمانے میں یہ یونانی نامعقولات اسلامی دنیا میں داخل ہورہے تھے، یہ وہ زمانہ تھا کہ جس وقت اسلامی علوم کی تدوین ہورہی تھی ،اس زمانے کے لوگوں نے سمجھ لیا تھا کہ اسلامی علوم کی تدوین ان یونانی معقولات کی ڈھنگ پر ہونا چاہئے ،اس لئے اس دور میں جولٹریچر تیار ہوا تھا، وہ قدیم یونانی انداز میں تھا،اس انداز فکر نے اسلامی دنیا میں کیسے کیسے شر وفساد برپا کئے تھے یہ وہ حضرات جانتے ہیں کہ جن کی بصیرت تاریخ اسلامی میں زیادہ گہری ہے ، آج اسلامی عقائد ، فقہ و اصول فقہ، تصوف وتزکیہ اور احسان یونانی معقولات کے شر وفساد کے شکار ہیں ، ہم اسلامی فقہ وتصوف کا علم حاصل کرنے کے لئے قرآن و حدیث سے بالاتر ہو کر کیوں ان یونانی معقولات کی اصطلاحات کے محتاج ہیں، جو نہ ہمارے دین کے لئے ضروری ہیں اور نہ دنیا کے لئے ، یونانی معقولات کو خود یونان نے بھی چھوڑ چکا ہے،ایسے نا معقولات کو اسلام جیسے لازوال اور ابدی دین کے ساتھ جوڑ دینے کی وجہ سے دین میں تدبر وتفکر کا ایسا نہج بن گیا ہے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اصحاب باصفا کے انداز نہج سے بالکل مختلف ہے، ان اجنبی علوم کے داخلے سے ہمارے مذہبی انداز گفتگو میں ایسا ڈھنگ پیدا ہوگیا ہے، جو اسلام کے ابتدائی اور سادہ اسلوب سے کلیتا ہٹا ہوا ہے، طرفہ یہ ہے کہ آج ہمارے یہاں عالم اس کو سمجھا جاتا ہے، جو فنی اور منطقی اسلوب میں دین کے مسائل سمجھ سکتا اور بیان کرسکتا ہو،عیسائیوں ، یہودیوں اور یونانیوں کی شعوری یا غیر شعوری اتباع نے ہمارے علمائے کرام کے فکری نہج کو سرے سے بدل کر رکھ دیا ہے، یاد رہے کہ ماضی میں وہ لوگ جس طرح دینی اعتبار سے ہلاک ہو چکے تھے، ہم بھی اس ہلاکت کی وادی میں غرق ہونے کے در پے ہیں۔

قدیم یونانی منطق وفلسفہ کی بنیاد محض قیاس آرائیوں پر قائم تھی ،موجودہ دور میں سائنس کی ترقی کی وجہ سے انسانی افکار کا ڈھنگ ہی پلٹ گیا ہے، سائنس جو حقیقی حوالوں اور واقعاتی تجربے سے کسی بات کو ثابت کرتی ہے، اسی لئے ہمیں اب سائنسی علوم اور معلومات کے ذریعے قرآن کریم کے اور کائنات اور خالق کائنات پر استدلال کرنا ہے، قدیم یونانی منطق کا طرز فکر اور طریقۂ استدلال کم سے کم موجودہ

زمانے کے لئے اجنبی ہو چکا ہے، موجودہ زمانہ سائنسی طریقۂ استدلال کا متقاضی ہے، ہمارے مدارس کے متخرجین قدیم منطقی استدلال کے اسلحے سے کتنے لیس ہوں، مگر ان اسلحوں اور ان کے طرز استدلال کے ذریعے آج کی دنیا کے انسانوں کو دین سمجھانے کی صلاحیت نہیں رکھتے ، ایک طرف لوگ ان کے طریقہ استدلال سے نامانوس ، دوسری طرف دنیا کے بازار میں ان کی بے وزنی اور بے وقعتی ، تو وہ سارے کے سارے احساس کمتری کے شکار ہو گئے ہیں، اگر کوئی اسلام کی تشریحات کے لئے جرات بھی کرتا ہے تو بھی وہ کسی کو سمجھانے میں شدید قاصر رہتا ہے، اور کوئی بھی مثقف انسان اس کے اس پرانے طریقۂ استدلال سے مطمئن نہیں ہوتے ، حتیٰ کہ آج کے مثقف انسان ان جیسوں کے یہاں سے ایسے تاثر لیتے جاتے ہیں کہ اسلام صرف قدیم زمانے کے انسانوں کے لئے آیا تھا، آج کی دنیا میں اس کی ضرورت نہیں رہی ہے، نعوذ باللہ من ذالک۔

قدیم زمانے میں علم افلاک اور عالم افلاک الگ الگ چیزیں تھیں، یہ تو ظاہر ہے کہ عالم افلاک حقائق پر مبنی تھا، اس کے برعکس علم افلاک محض قیاس آرائیوں اور مفروضات پر مبنی ، آج کی دنیا میں سائنس کی نئی نئی دریافتوں کی وجہ سے دونوں چیزیں متحد ہوتی جارہی ہیں ہے۔

اسی لئے اب ہمیں چاہئے کہ جدید سائنسی مصطلحات کے حصول کے بعد قرآنی حقائق پر ان کے ذریعے استدلال کی کوشش کریں ، باوجود یکہ حقیقت اپنی آخری شکل میں انسان کے لئے ناقابل مشاہدہ ہے، لیکن پھر بھی ہم اس پوزیشن میں ضرور ہیں کہ استنباطی استدلال کے ذریعے یہ استنباط کریں کہ یہاں فلاں چیز پائی جانی چاہئے ، سچ تو یہی ہے کہ موجودہ زمانے کا علم حیرت انگیز طور پر قرآنی نظریۂ علم کے عین مطابق ہے، مگر اس علم کو کام میں لانا ہمارا کام ہے، اگر ہم اس میں کامیاب رہیں تو اسلام کے لئے بہت بڑا فائدہ مرتب ہوگا، ورنہ ہم آنے والے سیلاب میں بہ جائیں گے۔

اس گفتگو کے ذیل میں یہ بھی بیان کرتا چلوں کہ قرآن کریم کا طریقۂ استدل کائناتی ہے، وہ محسوسات کے ذریعے غیر محسوساتی حقائق جو انسانی عقل دریافت کرنے میں بظاہر قاصر ہے پر استدلال کرتا ہے ،اسی لئے ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ قدیم یونانی طریقۂ استدلال جو ہمیشہ متزلزل رہا، اس کے بجائے ایک ایسا سائنسی طریقہ استدلال قرآن سمجھانے کے لئے مفید ہے، جس کی بنیاد خیال آرائی اور محض قیاس

آرائی اور مفروضات پر مبنی نہیں ، بلکہ حقائق اور واقعات پر مشتمل ہے ، جس طرح قرآن کریم کے اعتقادات غیر متزلزل ہیں، ٹھیک اسی طرح جو اللہ تعالی نے کائنات کے قوانین بنائے ہیں اٹل ہیں، تو ایک متزلزل قوانین کے ذریعے قرآن سمجھانے کے بجائے ، اٹل قوانین جواب سائنس کے ذریعے دریافت ہورہے ہیں سے استدلال زیادہ مفید ہے، اس لئے اب ہمارے مدارس کے نصاب تعلیم میں قدیم یونانی منطق وفلسفہ کے بجائے جدید سائنسی معلومات پر مشتمل نصاب داخل کرنا لازمی امر ہے۔

آج کے اس سائنٹیفک دور میں انسانی مشاہداتی اور تجرباتی علم اور وحی الٰہی ایک نقطہ نگاہ پر پہنچ گئے ہیں، اسی لئے دور حاضر میں ہمارا سب سے بڑا کام یہ ہونا چاہئے کہ ان اہم ترین دریافتوں کو مدون کر کے انسانی زندگی کے لئے مفید سے مفید تر بنائیں۔

میں جہاں تک سمجھتا ہوں کہ دور اول کے مسلمان تہذیب انسانی کے مدوجزر اور اتار پڑھاؤ کے بہت نقطہ شناس تھے، آج کے زیادہ تر مسلمان دانشوروں کی طرح جامد نہیں تھے، ان کے ہاں ایسی صلاحیت اور بصیرت تھی، جن کے ناطے وہ دنیا میں ہونے والے ہر مشکلات کا حل دے سکتے تھے، ان کی ایمانی ، روحانی ، فکری اور علمی بصیرت کی وجہ سے اسلام ایک قلیل مدت میں دنیا کے گوشے گوشے میں پھیل چکا تھا ، وقت اور ماحول کے تقاضوں پر ان کی گہری واقفیت تھی ، وہ اسلام کو ہر تغیر پذیر دنیا میں انسانی مشکلات کا واحد حل دینے والے تھے، دین کی حیثیت سے پیش کرنے میں بڑے کامیاب تھے، آج بھی اگر ان کے نہج پر مکاتب فکر چلے اور علمائے امت ان کے طرز فکر سے باخبر ہو کر اپنے انداز علمی اور فکری شعور پیدا کریں تو اسلام کی روشنی ہر ماحول میں پھیل سکتی ہے، اس میں شک بالکل نہیں ہے کہ اسلام تمام انسانی مشکلات کا واحد حل ہے، مگر بات اس میں ہے کہ اسے انسانوں کے سامنے پیش کرنے والے کتنی صلاحیات وبصیرت کے مالک ہیں۔ ایک چیز انسان کے لئے کتنے مفید ہو مگر اس سے فائدہ اٹھانے والے یا سودمند بنانے والے جامد ہو تو اس کی افادیت کی دریافت انسانوں میں نہیں ہونے پائے گی ، اس لئے ہم عرض کرتے ہیں کہ اسلام انسانیت کے لئے نہ صرف مفید ہے بلکہ انسان اسلام کے بغیر بے روح اور بے جان ہے، مگر آج کے اس تغیر پذیر ماحول میں اسلام کو پیش کرنے والے جامد حضرات کی وجہ سے اسلام سے انسان واقف نہیں ہونے پارہے ہیں، ہمیں چاہئے

کہ اسلام کو اس تغیر پذیر دنیا میں ایسے انداز میں پیش کریں، جس سے انسان مستفید ہو سکے، غرض یہ کہ اسلام کو انسانی دنیا میں پیش کرنے والوں کے کردار ہی منجمد ہو چکا ہے، وہ دنیا کی چاہت وطلب کو پورا کرنے میں شدید قاصر ہیں، سچ تو یہ ہے کہ ہمارے کردار کے نتیجے میں اسلام آج کی دنیا میں اچھی طرح پیش نہیں ہو پا رہا ہے، ہمیں سب سے پہلے اپنے فکری نہج کو باصلاحیت بنانے کی طرف توجہ دینے کی ضروت ہے، آج کل کی سائنسی دنیا میں کہا جاتا ہے کہ پہلے نظریہ پھر مشاہدہ، اور مشاہدہ کے بعد تجربہ کی دنیا سے انسانوں کو گزر کر حقیقت تک پہنچنے کی ضرورت ہے ، یہ تو ایک واضح بات ہے کہ انسان کو بخشی گئی صلاحیت سے اصل حقیقت تک پہنچنا ممکنات میں سے نہیں ہے، لیکن حقیقت کے جو واضح دلائل اس کائنات میں موجود ہیں، ان تک انسان اپنے نظریہ، مشاہدہ اور تجربہ کی بنیاد پر اچھی طرح پہنچ پائے گا، اور سائنسی دلائل حقیقت تک پہنچنے کے لئے بڑے معاون ہو گئے ہیں، اس لئے ہمیں سائنس کے ذریعے جو آج کل دنیا میں مرغوب علم ہے، قرآنی حقائق پر دلائل پیش کرنے کی تگ ودو کرنی چاہئے۔

قائدین کے لئے مثبت ناقدین کی ضرورت ہے

قومی سیاست کی اس طویل زندگی میں ہم نے بارہا مشاہدہ کیا ہے کہ اعلی سے اعلی خصوصیات رکھنے والے حضرات بھی تنقید کو برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے ہیں، ان پر تنقید ہوئی تو وہ حواس باختہ ہوجاتے یا برہم ہوجاتے ہیں، خاص طور پر قائدین جب اپنے ساتھیوں کی تنقید برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھیں گے، تو ایسی جماعت یا دوسرے الفاظ میں ایسے قائدین اعلی صلاحیت کے ساتھیوں سے محروم ہوجائیں گے، دنیا میں ذہنی آزادی پر کسی بھی طریقے سے لگام دیا نہیں جاسکتا، اعلی سے اعلی ذہانت کے حاملین کی ذہنی آزادی کو مقید نہیں کیا جاسکتا، اگر قائدین اعلی ذہانت کے حامل، فراخ دل اور بلند حوصلے کے مالک ہوں تو وہ اپنے ساتھیوں کی فکری آزادی یا ان کے برمحل اور جائز اختلاف کو کبھی بھی برا نہیں مان سکتے، صرف یہ نہیں بلکہ ذہین اور مخلص قیادت تنقیدی ذہن رکھنے والے افراد کو اپنے ساتھ جوڑنے کی کوشش کرے گی، تاکہ ان کی مثبت تنقید سے فائدہ اٹھایا جاسکے، اور ملت وقوم کی خدمات میں اپنے ساتھیوں کی ذہنی صلاحیت کو کام میں لایا جاسکے، آج کل ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری سیاسی زندگی میں جو قائدین ملت وقوم کی سیاسی نمائندگی کررہے ہیں، وہ بڑی تنگ نظری اور کوتاہ نگاہی کا مظاہرہ کررہے ہیں، مثبت تنقید کرنے والے افراد کی نہ صرف قدر نہیں کی جارہی ہے، بلکہ ایسے افراد کو جماعت میں شامل نہ کرنے کے بہانے ڈھونڈتے ہیں، جس کی وجہ سے جماعت میں تیسرے درجے کے افراد جگہ پاتے ہیں، جس کے نتیجے میں جماعت خوشامدیوں کی ایک ٹولی بن کررہ جاتی ہے، ہماری سیاسی جماعتیں آج کل قوم کے اعلی صلاحیت کے حامل افراد سے یکسر محروم ہوکر رہ گئی ہیں۔

دراصل کسی بھی جماعت میں مثبت تنقید کرنے والے افراد کی بے حد ضرورت ہوتی ہے، تاہم تنقید برائے تنقید نہ ہونی چاہئے، اور تنقید برائے اصلاح ہونا ناگزیر ہے، اگر کوئی بھی جماعت صحیح معنی میں ملک وقوم کی خدمات انجام دینے والی ہیں، اور اس کے مثبت ومخلص قائد پر مثبت تنقید کی جائے تو اس

کے اندر کی وہ صلاحیت جاگ اٹھے گی، جو عام حالات میں سوئی ہوئی رہتی ہے، مثبت تنقید کی وجہ سے اس کے اندر توانائی آئے گی، اور وہ ازسرتو بیدار ہوجائے گا، ہم یہ ضرور مانتے ہیں کہ تنقید کی وجہ سے وقتی طور پر کچھ نہ کچھ پریشانیاں بھی آتی ہیں، مگر قائد کے لئے ضروری ہے کہ ان پریشانیوں کو ٹھنڈے دماغ سے قبول کرکے اپنی جماعت کو آگے بڑھائے، تنقید سے برہم یا حواس باختہ ہونے کے بجائے اپنے کو میدان میں سنبھال کر قدم آگے بڑھائے، تو ایسے قائد اپنی جماعت سمیت کامیابی سے ہم کنار ہوجائے گا، ظاہر ہے کہ کسی قوم کی کامیابی، بھلائی اور ترقی کا انحصار ہمیشہ اپنے قائدین کے کردار وعمل پر منحصر ہوتا ہے، جو اپنی قوم کو روشن مستقبل کی طرف رہنمائی کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں، دنیا میں انسان تنقید سے اس لئے ڈرتا ہے کہ کہیں کسی کی تنقید کی وجہ سے اس کی شہرت میں خلل نہ پڑ جائے، اس وقت صحیح قائد کو قربانی کا درس لینا ضروری ہے، جب کوئی قائد اپنی شہرت کی قربانی دینے کو تیار ہوجائے، تو ایسے قائد کے لئے پھر ضروری ہے کہ ایک نتیجہ خیز عمل کے غیر مشہور حصے میں اپنی صلاحیت اور زندگی کو دفن کرکے ملک وقوم کی زندگی کو روشن کرنے کا عزم کرے، تب قائد کے لئے اگلی منزل کی طرف اقدام کرنا آسان ہوجائے گا، انسان عین بربادی کی حالت میں بھی جب حواس باختہ ہوجانے کے بجائے ایک نئی تعمیر کے لئے منصوبہ سوچنے لگے تو وہ انسان کہیں اور کبھی بھی ضائع نہیں ہوپائے گا، بلکہ ہر بادی اس کے لئے ازسرنو آبادی کی خوش خبری لائے گی۔

اسراف اور ہمارا معاشرہ

روہنگیا مسلمان جن مصیبتوں کے شکار ہیں، وہ دنیا کی نظروں میں ڈھکی چھپی نہیں رہی ہیں، ان مصیبتوں میں ایک مصیبت یہ بھی ہے کہ ان کو اپنی مصیبت کا احساس بھی نہیں ہو رہا ہے، ان پر ہونے والے نت نئے مظالم وستم ظریفیاں ان کے لئے طبیعت ثانیہ بن گئی ہیں، ان کا حال اس قربانی کا بکرا جیسا ہو چکا ہے، جسے قربانی کے لئے میدان میں لایا جا چکا مگر وہ اب بھی گھاس کی تلاش میں بے تاب ہے، ان سے یہ احساس جاتا رہا ہے کہ حکومت برما ان کے خلاف کیا کیا ناروا عزائم رکھتی اور ان کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کیسے کیسے حربے استعمال کر رہی ہے، مجھے سب سے زیادہ حسرت ان روہنگیا اہل ثروت حضرات پر ہوتی ہے، جو وطن مقدس کے باہر ہیں، چاہے ان کا تعلق مملکت سعودی عرب سے ہو یا امارات و پاکستان سے، چاہے ان کا تعلق ملائشیا سے ہو یا بنگلا دیش ودیگر ممالک سے، غرض وہ خطرناک قسم کے اسراف میں مبتلا ہیں، ان کے ناجائز اور ناروا اسراف سے اب معلوم ہوتا ہے کہ وہ انسانیت کے تمام حدود وقیود کو پلانگ گئے ہیں، خاص طور پر ان کی شادی بیاہ کی محفلیں دیکھی جائیں تو کوئی انسان یہ بھی سوچ نہیں سکے گا کہ آیا اس آدمی کا تعلق کسی ایسی سرزمین ہے جس کی حالت زار دنیا بھر کو ترسا رہی ہے، ہم تو جانتے ہیں کہ شادی انسانی زندگی کا ایک سنجیدہ اور پرسکون واقعہ ہوتا ہے، میں جہاں تک سمجھتا ہوں کہ وہ دھوم مچانے سے زیادہ زندگی کی ذمے داری کا احساس کرنے کا دن ہے، جس کا تقاضا ہے سادہ ہو، اور فضول نمائشوں سے مکمل طور پر پاک ہو، جب کہ یہ بھی عام انسانوں کے لئے ہے، روہنگیا مسلمانوں کے لئے تو شادی ایک انہونی کی ہونی چیز ہونی چاہئے، ظاہر ہے کہ عام دنیا کے انسان آزاد، خود مختار، مصیبتوں سے پاک اور اپنی سرزمین اور اپنے وطن میں رہائش پذیر ہیں، جبکہ روہنگیا مسلمانوں کی حالت ایسی ہے کہ وہ غیروں کی سرزمین میں کسی طرح چھپے چھپائے زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں، مگر روہنگیا مسلمانوں کے اہل ثروت حضرات دنیا کے مختلف گوشے میں بسے بسائے گئے حالات میں اربوں روپئے صرف شادی وخانہ آبادی کی تقریب میں ناجائز طریقے پر خرچ

کر رہے ہیں، کسی قوم کی تعمیر وترقی کا سارا انحصار اس قوم کے افراد پر ہی ہوتا ہے، روہنگیا مسلمانوں کی حالت ایسی رہی تو اس کی تعمیر وترقی تو کجا بلکہ ان کے بچاؤ کا سوال آئے گا، ہمیں قوم کے اس پہلو پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے۔

آج کل تو معاملہ ایسا ہے کہ ہمارے اہل ثروت حضرات فضول خرچی اور اسراف پر ڈھٹے ہوئے نظر آتے ہیں، جب کہ ان کے پاس اگر قوم کی ترقی، بہبودی یا نجات کے مسائل لے کر کچھ چندے لینے جائیں تو وہ جلد اپنے بہانے ڈھونڈ لاتے ہیں کہ فلاں صاحب کا حال ویسا ہے، فلاں قائد پر ہم مطمئن نہیں ہیں، فلاں جماعت ایسے ویسے نظریات پر مبنی ہیں، غرض پیسے نکالنے کے خوف سے ایسے ایسے بہانے ڈھونڈنا شروع کر دیتے ہیں کہ جن سے اہل ضمیر پریشان ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، یہ ہمارے عام اہل ثروت کی بات ہے، جب کہ ان میں بعض ایسے ہو گئے ہیں کہ کہتے ہیں کہ ہم ارکان سے نکلنے کے بعد خوش حال ہو چکے ہیں، ہمیں اب وطن مقدس ارکان کی کیا ضرورت ہے، ارکان میں کیا رکھا ہے، ہمیں اب ارکان کی ضرورت نہیں ہے، اور ارکانی مسلمانوں بے ادب، بے ثقافت اور تہذیب اخلاق سے کوسوں دور ہو گئے ہیں، ان کی تعمیر وترقی کی کوشش اب ایک بے معنی کی کوشش ہے، انہیں جو برمی ظالموں نے تختۂ ظلم بنایا ہے، ٹھیک کیا ہے، اس لئے کہ ایسے انسانوں کی سزا ہی ویسی ہونی چاہئے جو برمی حکومت دے رہی ہے وغیرہ وغیرہ، غرض سینکڑوں باتیں ایک دم میں کہہ ڈالتے ہیں، ایسے بے ضمیری کے عالم میں ہماری قیادت کو ایک ایسا منصوبہ تیار کرنا چاہئے، کہ جس کے ذریعے ایک طرف اسراف کو ختم کر دیا جا سکے تو دوسری طرف ان بے ضمیر افراد کے دلوں کو انسانیت اور ملک وملت کے حق میں لگایا جا سکے۔

چند حضرات کا غرور پوری قوم کے لئے مصیبت بن گیا ہے

مغرور انسان دنیا میں بھی ناکام رہتا ہے اور آخرت میں بھی نامراد، اس کے لئے سوائے جہنم اور کچھ نہیں ،ادھر ظالم کا دل ہمیشہ غرور و پندار سے مخمور رہتا ہے، اور ایک مغرور انسان حق کے اعتراف کرنے میں ہمیشہ ہچکچاتا رہتا ہے، حق جب اس کے سامنے آجائے تو اسے چھپانے یا اسے انکار کردینے کا بہانہ ڈھونڈھنا شروع کردیتا ہے، اس لئے کہ حق کے اعتراف سے اس کے مطابق اس کی بڑائی کا سارا راز کھل کر رہ جائے گا، مغرور انسان بسا اوقات سمجھتا ہے کہ حق کے اعتراف سے اس کی ذات فنا ہوجائے گی ، یوں اپنے غرور و پندار کو بچانے کے لئے سرے سے حق کا انکار کرنا اس کا شیوہ بن جاتا ہے، جس آدمی کے دل میں غرور و پندار چڑھا ہوا ہو وہ اس دنیا میں کبھی بھی کامیاب نہیں ہوسکتا، آج کی دنیا ایک ایسی دنیا بن چکی ہے کہ جس میں انسان کو حقیقت کے مطابق سنورنا ہو رہا ہے۔

آج کل روہنگیا مسلمانوں میں چند ایسے قائدین ہمارے سامنے ہیں، جو غرور و پندار کے شکار ہو کر حقیقت کے اعتراف سے پہلوتہی کرتے نہیں تھکتے ہیں، قومی سیاست و قیادت کے اس طویل دور میں ان لوگوں کے ناجائز پندار کی وجہ سے پوری قوم ایک طرح کی مصیبت میں مبتلا ہے، ہماری قومی سیاست کے کسی بھی پریشان کن مرحلہ میں ان حضرات کا غرور پوری قوم کے لئے مصیبت بن جانا یقینا تشویشناک ہے، کبھی کبھار ایسا بھی مشاہدہ کیا گیا ہے کہ ایک آدمی کے صرف تھوڑے سے حق کے اعتراف پر پوری قوم کا مستقبل روشن اور تابناک بن سکتا تھا، مگر یہ ہے کہ اس نے بس اپنے غرور پر اٹل رہ کر پوری قوم کو پھر سے اندھیاری اور وحشتناک تاریکی میں ڈبو دیا تھا، ہم نے قومی سیاست کے اس افق پر بار بار اتحاد و یک جہتی کی کوششیں کی ہیں، جب کہ نااتفاقی یا دوسرے الفاظ میں افتراق کا بیشتر سبب ہی چند قائدین کے غرور یا مغرورانہ حرکات سے پیدا ہوا تھا، انہوں نے بس اپنے اپنے ناروا دفاع عزت کی شکل میں پوری قوم کی قومی اتحاد کو تار تار کر دیا تھا، نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ آج قومی سطح پر اتحاد کا نام لیا جانا ایک طور پر مذاق کا سبب یا ایک طرح کا جرم قرار دیا جا رہا ہے، اس لئے کہ ان

حضرات کے ماضی کے کردار کے پیش نظر اتحاد کے نام پر کی جانے والی کوئی بھی کوشش ایک امر مشکوک بن گئی ہے، جس میں میرے نزدیک عوام کا کوئی قصور نہیں، بلکہ پوری قوم ان چند افراد کی حرکات وسکنات سے برہم یا خفا ہوگئی ہے، اور ان چند حضرات کے ناروا غرور نے پوری قوم کو مشکوک بنا دیا ہے، آج کل قائدین پر قوم کا بھروسہ بالکل نہیں رہا ہے، قوم سمجھتی ہے کہ ایسے نارو غرور و پندار کے شکار افراد کبھی بھی اس کی ڈوبتی اور ڈگر کھاتی کشتی کو ساحل سے آشنا نہیں کر سکتے ، ان پر بھروسہ ہی ایک قسم کا لایعنی بھروسہ ہوگا۔

ادھر یہ بھی ایک یاد رکھنے کی چیز ہے کہ انسان جتنا زیادہ بزدل اور ڈرپوک ہوتا ہے، وہ اتنا ہی ظالم اور اتنا ہی سفاک ہوتا ہے، اور ظالم اپنے ظلم و بربریت کے حوالے سے مغرور ہوتا ہے، اور لازمی طور پر مغرور انسان بڑا تنگ ظرف بھی ہوتا ہے، ہمارے لیڈران وقت وقت پر اپنی بہادری کا مظاہرہ خود اپنوں کے سامنے کردیتے ہیں، حقیقت میں وہ اپنی بزدلی، سفاکی اور تنگ ظرفی کی وجہ سے کسی بھی اہم اور بڑے اقدام کرنے سے شدید قاصر ہیں، غرض یہ کہ ان کی بزدلی، سفاکی، تنگ ظرفی اور مغرورانہ انداز نے پوری قوم کو مصیبت کے تیہ میں لاکھڑا کردیا ہے۔

واضح مقصدیت کا فقدان

کسی انسان کی عظمت ومنزلت کا راز اس میں چھپا ہوانہیں ہے کہ وہ اپنے سے کم تر پر غالب آ جائے، بلکہ اس کی عظمت ومنزلت کا راز اس میں چھا ہوا ہے کہ وہ اپنے ہی جیسے بلکہ اپنے سے زیادہ عظیم المرتبت انسان پر غالب اور فوقیت لے جائے، عظمت کوئی وہبی چیز نہیں ہوتی بلکہ وہ ایک کسبی چیز ہے، بعض لوگ اپنے منہ میں سونے چاندی کا چمچہ لے کر پیدا ہوتے ہیں، مگر وہ عظیم المرتبت نہیں ہوتے، کسی قائد، لیڈر اور سیاست دان یا عمومی میدان میں سرگرم عمل انسان کے لئے سب سے بڑا سانحہ اس کے سامنے کسی مقصد کا واضح نہ ہونا ہوتا ہے، پھر جب مقصد واضح نہ ہو، تو وہ تذبذب اور ہچکچاہٹ کا شکار ہو جاتا ہے، اس کے فیصلے ماند پڑ جاتے ہیں، وہ اس لحاظ سے اپنے مقصد مطلوبہ سے قریب یا دور ہو جاتے ہیں، فیصلہ کرنے کی صلاحیت تب ہی پوری ہوتی ہے، جب اس کے سامنے مقصد بالکل واضح ہو، ورنہ انسان یوں ہی الٹی سیدھی حرکتیں کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

آج کل ہمارے انقلابی اور سیاسی راہوں پر چلنے والے قائدین اور ارباب بست وکشاد کا یہی حال ہے کہ ان کے سامنے اپنے مقصد واضح نہیں ہے، ان کی مثال ایک ایسے انسان کی طرح ہے، جو راستے پر رات و دن چلتا رہا ہو مگر وہ نہیں جانتا کہ وہ کدھر جا رہا ہے، اور کہاں تک کا ارادہ ہے، ہمارے قائدین ہر میدان میں تذبذب کے شکار ہیں، اور ہر کہیں ہچکچاہٹ میں مبتلا ہیں، ان کے سامنے واضح مقصد نہ ہونے کی وجہ سے انہیں فریب اور دھوکے کا بھوت دبوچ رہا ہے، خاص طور پر انقلابی لیڈروں کا یہی حال ہے کہ وہ ایک ایسا فیصلہ کرنے سے شدید قاصر ہیں کہ وہ آیا جس راستے پر چل رہے ہیں، وہ ایک فیصلہ کن مقصد مطلوب تک پہنچا سکتا ہے کہ نہیں؟ سب سے بڑی بات یہی ہے کہ وہ وقت اور ماحول کے تقاضوں کو سمجھنے سے شدید ناکام ہیں، یہ تو ایک الگ بات ہے کہ وہ وقت کو اپنے ساتھ نہیں کر سکتے، بلکہ ان کے اندر اتنی سی صلاحیت کا بھی فقدان ہے کہ وہ کم سے کم وقت کا ساتھ دے کر قوم کو ایک واضح راستے پر چلا سکتے ہوں۔

اب عرض ہے کہ میرے یہی آخری جملے پڑھ لینے کے بعد مجھے کوئی ابن الوقت کہہ کر توہین نہ کریں، بات اصل میں یہی ہے کہ ہم آج کل جن جن مصائب سے دو چار ہیں، اور جن جن آزمائشیں اور ابتلائیں ہو چکی ہیں، اور حالات کے پیش نظر اور بھی امتحانوں کے دروں سے گزرنے کے امکانات نظر آ رہے ہیں، ان کے پیش نظر بھی اور ہماری قوت واستطاعت کے پیش نظر بھی یہ بات کہنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ اگر ہم وقت کو اپنے ساتھ کرنے سے قاصر ہیں تو ہمارے لئے کم سے کم وقت و ماحول کا ساتھ دے کر اپنے مقصد پر پہنچنے کی کوشش ضروری ہے۔

ہماری بعض کوتاہیوں اور خامیوں کی نشاندہی

ایک زندہ قوم کا ہر ایک فرد اس کے روشن مستقبل کا ستارہ ہوتا ہے، ایک قوم کا مستقبل اللہ تعالے کے احسان کے ساتھ ساتھ افراد کے ہاتھوں بنتا اور سنورتا ہے، اسی لئے ضروری ہے کہ ہر ایک فرد اپنی قوم میں پائی جانے والی خرابیوں کو دور کرنے کے لئے کمر بستہ ہو جائے، اگر ہر ایک فرد اس کام کے لئے اپنے آپ کو تیار کر لے گا تو اس قوم کے چہرۂ زیبا ماہِ کامل کی طرح چمکنے لگے گا، اگر ہر ایک فرد اپنے آپ کو اپنی قوم سے دور اور بہت دور اپنے آپ کو اکیلے محسوس کرتے ہوئے غفلت اور اندھیاری کی وادی میں ٹھٹھر کر رہ جائے، اور یہ سمجھ بیٹھے کہ اس کی لغزش وخطا اس کی اتنی بڑی قوم کو کیا نقصان پہنچا سکے گی تو نہ صرف اس کے لئے بلکہ اس کی پوری قوم کے لئے اس کی ناروا حرکتیں عبرتناک تازیانے کی شکل میں نمودار ہو جائیں گی، آج کی روہنگیا قوم جو تاریخ میں کبھی بھلائیوں، خوبیوں اور حسن و جمال کی منبع تھی، آج دیکھیں کہ اپنے اعمال کی وجہ سے زمانے میں گردِ راہ بن بیٹھی ہے، اس میں بعض ایسی خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں جو اس سے پہلے کبھی نہ تھیں۔

اس قوم کے علماء بس لکیر کے فقیر بن بیٹھے ہیں، ان کے اندر سے روشنی لانے والی حرکتیں چلی گئی ہیں، اور ان کے جذبات واحساسات زمانے کی برفیلی پگڈنڈیوں میں ٹھٹھر کر رہ گئے ہیں، ان کے آباء واجداد میں زمانے شناسی کے جوجوہر تھے، وہ ان کے اندر منقود ہیں، وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ ان کے آباء واجداد بس ان کو چند آداب ورسوم کے پابند اور رکھوالے بنا کر چلے گئے ہیں، حالانکہ تاریخ شاہد ہے کہ ان کے آباء واجداد بس چند رسوم وآداب کے پابند جامد انسانوں کی ریوڑ نہ تھے، بلکہ ان کے اندر وہی حسن و جمال، رعنائیاں اور تابانیاں لانے والی حرکتیں تھیں، جن کے ناطے وہ دنیا میں بھی انسانوں کو درس دے سکے اور آخرت کے لئے بھی توشۂ حیات اکھٹے کر سکے، لیکن ہمارے ملک میں پائے جانے والے آج کے علماء یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے لئے بھلائی اور فتح مندی اس میں ہے کہ وہ بس چند آداب و رسوم کے پابند ہو کر رہیں، اور زمانے کے اتار چڑھاؤ اور روز ہونے والی تبدیلیوں کی طرف غلطی سے

بھی نہ دیکھیں، اور بس یوں زندگی کو چند آداب ورسوم کے پابند بنائے گزار دیں۔

ہمارے علماء کے علاوہ ادھر دانشوروں میں ایک یہی بیماری پیدا ہوگئی ہے کہ وہ سمجھنے لگے ہیں کہ حق اس طرف ہوگا، جس طرف لوگوں کی اکثریت پائی جائے گی، حق و باطل کو وہ لوگوں کی قلت وکثرت کی ترازو میں تولنے لگے ہیں، دراصل یہ بہت بڑی غلط فہمی ہے، انسانی تاریخ شاہد ہے کہ حق و باطل کے درمیان قلت وکثرت نے کبھی بھی خط امتیاز نہیں کھینچا ہے، اصل میں حق و باطل کے درمیان عدل و انصاف ہی حد فاصل اور معیار رہے، جسے ہم مذہب کی زبان میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ حق و باطل کے درمیان قرآن وسنت ہی حد فاصل ہو سکتی ہے، اس طرح بعض افراد ایسے بھی پائے جاتے ہیں کہ جس طرف جاہ وجلال قوت وشوکت کی فراوانی ہو، یا مال ودولت کی ارزانی ہو، ان کی نگاہیں حق و باطل کی تلاش اسی طرف کرتی ہیں، یہ لوگ کمزوروں، ضعیفوں، بے بسوں اور ناتوانوں کی باتیں کتنی ہیں صحیح اور حقیقت و واقعیت پر مبنی کیوں نہ ہوں ان کو اہل حق اور ان کی باتوں کو مبنی بر حق نہیں سمجھتے ہیں، انہوں نے ایک ایسا ناروا اصول بنا رکھا ہے کہ جس کے نزدیک حق دولت وشوکت اور جاہ وجلال کے پابند ہے، ان کا یہ جھوٹا اصول پوری قوم کو دیمک کی طرح چاٹ رہا ہے۔

روہنگیا دانشوروں کی نظر میں علمائے کرام اور دین سے وابستہ لوگ کم عقل اور کور بین ہیں، اس وجہ سے علمائے کرام کی باتوں کا اثر نہ صرف ان کے دلوں میں نہیں ہو پا رہا ہے بلکہ عوام بھی ان کی اس گمراہ کن خیالات میں آئے دن پھنستے جا رہے ہیں، بلکہ ایک اعتبار سے یہ لوگ علمائے کرام کو قابل نفرت انسان تصور کرتے ہیں، اور یہ سمجھتے ہیں کہ علمائے روہانگ بس دین کے چند مسائل کے سوا اور کچھ نہیں جانتے ہیں، قرآن وسنت کی روشنی اور رہنمائی میں دنیا اور دنیا کے تمام معاملات کو حل کرنے سے قاصر ہیں، انہیں ایسے جامد علماء تصور کرتے ہیں کہ ان سے نہ دین کا کام نکالا جا سکتا ہے اور نہ دنیا کا، بس ان کی نظر میں یہ لوگ عقل وفہم سے کوسوں دور صرف مذہبی لباس میں ملبوس انسانوں کا ایک گلہ ہیں، صرف یہی نہیں بلکہ کبھی کبھار اور کہیں کہیں ان کی زبانوں سے سر دربار یا سر بازار ایسی ایسی توہین آمیز باتیں ان علماء کے خلاف نکل بھی جاتی ہیں، جبکہ اصل میں دین والوں سے دانشمند اور باخبر انسان اور کوئی نہیں ہے، اب سوچنا یہی ہے کہ ہمارے علماء کے خلاف ان کے نفرت بھرے خیالات عام ماحول میں کیسے

پیدا ہو گئے ہیں، آیا اس میں صرف ان دانشوروں کا قصور ہے یا علمائے کرام کے اندر بھی کچھ نہ کچھ خامیاں اور کوتاہیاں پائی جاتی ہیں؟ قبل اس کے کہ ہم عقل و دانش اور علم وفن کی ترازو میں ان دانشور ان عظام کی باتوں کو جانچ پڑتال کریں، ضروری معلوم ہوتی ہے کہ علم وفن اور عقل دانش کی رو سے ہمارے علمائے کرام کے اندر پائی جانے والی خامیوں اور کوتاہیوں کی کچھ نشاندہی کی جائے، تاکہ عیاں طور پر یہ سمجھ آجائے کہ ان غلط فہمیوں کی اصل ونسل اور حسب ونسب کہاں ہے، ہمارے علمائے روہانگ علم و دانش اور فہم وفراست اور دین ودھرم کے رکھوالے ہونے کے باوجود ان دانشوروں اور ان کے ہاں میں ہاں ملانے والوں کے اتنے قابل نفرت خیالات کے شکار کیوں ہو رہے ہیں۔

بہبود عامہ کا خیال لازمی امر ہے

یہ انسانی زندگی کا عام تقاضا رہا ہے کہ ذاتی یا انفرادی مقصد انسان کو زیادہ تحریک دیتا اور اسے انسانی زندگی کے عمل میں زیادہ ابھارتا ہے، بہ نسبت ایک ایسے مقصد کے جس کا تعلق بہبود عامہ سے ہو، ہر انسان میں اپنی ترقی کی خواہش ہمیشہ ہمیشہ موجزن رہتی ہے، ویسے ہم دیکھتے ہیں کہ روہنگیا قوم بھی اس مذکورہ انسانی تقاضے سے بلند نہیں، اور اپنے نجی مفاد کی خاطر رات دن کوشاں اور سرگرداں ہے، جسے ایک طور پر سراہے جانے کے قابل بھی ہے، مگر اس قوم پر گزرنے والے حالات کے پیش نظر افسوس کا مقام یہی ہے کہ جو افراد اپنے ذاتی مفاد یا دوسرے الفاظ میں اپنی ذاتی ترقی اور نجی زندگی کے سرور ولذت کے لئے سردھڑ کی بازی لگائے ہوتے ہیں، مگر پھر بھی وہ لذت وسرور سے محظوظ نہیں ہو سکتے، کیوں وہ ذرا اپنے حالات پر سوچنے کے درپے نہیں ہیں، ذاتی مفاد کے لئے انہوں نے بہت کچھ کیا اور کرہی ڈالا، آخر وہ سبب کونسا ہے، جس نے اپنی اتنی محنت کو رائگاں جانے پر مجبور کیا ہے، آخر اس نے کونسی کوتاہی کی ہے جس کے ناطے اپنی زندگی کو لذت وسرور سے محفوظ نہ کرسکا، آخر ان کی کونسی گناہ کی پاداش میں ذلت ونامرادی کی زندگی ان کا مقدر بن چکی ہے؟ اس کی بنیادی وجہ صرف اور صرف ذاتی مفاد کی خاطر کوشش اور قومی وملی ترقی و بہبودی کے خیال سے پہلوتہی ہی ہے، جس نے آج ان کو اتنا پریشان بنا رکھا ہے، وہ اپنی ذاتی زندگی کی خوش حالی کے لئے سرگرداں ضرور ہے، مگر وہ کبھی بھی کامیاب نہیں ہوسکے گا، قومی مفاد کے خیال کے بغیر وہ اپنے لئے جتنی بھی کوشش کرے گا اتنا ہی خواب و خیال کی مصیبت کی جال میں پھنستا جائے گا، اس موقع پر سب سے بڑے دکھ ان افراد قوم پر ہوتا ہے، جو اپنی ذاتی زندگی کی لذت وسرور کے بلند مقامات کو پہنچنے کے لئے ترستے ہوں، اور زندگی میں کسی قدر فراوانی بھی ہو، آخر ان بیچاروں کو کیا ہو گیا کہ ایک بار کے لئے سہی اپنی مصیبت زدہ قوم کی بہبودی کے لئے ایک منٹ کے لئے سوچنے اور فکر کرنے کو گوارہ نہیں کرتے؟

ہم دیکھتے ہیں کہ ان عام بہبودی اور ایثار کے خیال نے پوری قوم کو اس مصیبت اور کس مپرسی کے عالم

میں بھی تمدنی اور سیاسی ترقی کی طرف لے جاسکتا ہے، انفرادی ترقی کا خیال جس طرح ان کی انفرادی ترقی کا باعث بن جاتا ہے، اگر وہ عام ترقی اور بہبودی کا خیال کریں گے تو ان کا خیال ان کی قومی ترقی و کامرانی کا باعث بن جاتا ہے، اگر وہ عام ترقی اور بہبودی کا خیال کریں گے تو ان کا خیال ان کی قومی ترقی وکامرانی کا باعث بن سکتا ہے۔

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری قوم کے ہر ایک افراد اپنی قومی اور ملی ترقی وفلاح کے خیال سے دور اور بہت دور بس اپنی فکر میں لگے ہوئے ہیں، مگر وہ یہ سوچنے کو بالکل تیار نہیں کہ آیا وہ اپنی ترقی لئے جو کوشش کرتے اور کرنا چاہتے ہیں وہ کسی روشن مقصد کی خاطر ہے یا وہ غیروں کی سرزمین کو روشن اور تاباں کرنے کے لئے ہے؟ دوسروں کی سرزمین میں ہزاروں ذاتی مقاصد کی منازل طے کریں تو بھی آخر ان کی عزت نہیں کی جائے گی، ہم دیکھتے ہیں کہ کبھی کبھار خود ان کی ذاتی ترقی ان کی بے عزتی اور پریشانی کا سبب بن جاتی ہے، یہ اس لئے کہ اس نے بس دوسروں کی سرزمین میں اپنی عزت کی نشانی ڈھونڈی ہے، دوسروں کی سرزمین کو روشن وتاباں کرنا چاہا ہے، بات شاعر کی زبان میں یہی سمجھیں کہ:

مانگی ہوئی دستار سے عزت نہیں ملتی

اسی لئے اب ہم اپنے اہل وطن ان خوش حال مہاجرین بھائیوں سے گزارش کرتے ہیں کہ آپ نے جس طرح اپنی نجی زندگی کی ترقی اور کامرانی کے لئے کوشش کی ہے، اور اپنے زعم میں کامیاب بھی ہوئے ہیں، اب کی بار اپنی قوم کی اجتماعی زندگی کی فلاح وبہبودی کے لئے جدوجہد کرنا سیکھیں۔

برمی مظالم اور روہنگیا قوم کا ردعمل

روہنگیا مسلمانوں پر ایک طویل عرصے سے جو مظالم ڈھائے جارہے ہیں، ان کی نہ کوئی حد ہے اور نہ کوئی حساب، اس قوم پر جس طریقے سے مظالم ہورہے ہیں، اس کی مثال چنگیز وہلاکو، نمرود وفرعون کے طریقہائے مظالم میں بھی نہیں دیکھی گئی ہے، ان مظالم میں سب سے قابل ذکر یہ ہے کہ وہ ظالم ان کی ماں بہنوں کی عصمتیں لوٹ رہے ہیں، مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ باوجود عصمتیں لوٹی جانے کے روہنگیا قوم نے اپنی ماں اور بہنوں کو ان ظالموں کے سامنے کبھی اور کسی حالت میں بھی نہیں ڈالا، یعنی ظالم ظلم تو ڈھائیں گے ہی، مگر مظلوموں نے بھی دفاع کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی، میرا مطلب یہ ہے کہ روہنگیا قوم نے ان ظالموں کے مظالم کو قبول کرنے کے بجائے اپنی جانیں دے دیں، یا ہجرت کی راہ لی تھی، یہ ایک ثبوت ہے کہ روہنگیا مسلمان غیرت مند خوددار اور اسلام سے لو لگانے والے ہیں۔

ظاہر ہے کہ کسی قوم سے اگر اس کا ملک چھین لیا جائے تو وہ زندہ رہ سکتی ہے، اگر اس کے قومی ورثے اور خزانے لوٹ لئے جائیں تو وہ پھر بھی پنپ سکتی ہے، بڑے سے بڑا تاوان جنگ ادا کرنے کے بعد بھی ایک مرتبہ پھر اس کا سدھرنا ممکن ہو سکتا ہے، لیکن جنگ کے اس نہایت خوفناک عمل کے بعد یعنی اس کے بعد کہ اس قوم کی عورتوں کو فاتح اپنے تصرف میں لے آئے اس قوم کی بقاء بالکل محال ہے۔

اللہ تعالی کا شکر ہے اور روہنگیا مسلمانوں کی غیرت وخودی پر فخر بھی کہ نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزرنے کے بعد بھی انہوں نے ظالم برمی اوباشوں کے سامنے اپنا ہتھیار نہیں ڈالا، انہوں نے ابھی تک ہار ماننا قبول نہیں کیا، جبکہ ان کے برعکس ارکان میں بسنے والی ایک دوسری قوم یعنی رکائنگ (مگھوں) کی حالت ایسی ہے کہ انہوں نے فاتح ظالم برمیوں کے سامنے اپنی ماں وبہنوں کی عصمتیں سرے سے ڈال دیں، انہوں نے اس باب میں اپنی عزت وناموس کو برمیوں کے حوالے کرکے فخر محسوس کیا ہے، حتی کہ آج کل اس مگھ قوم کی یہ حالت ہے کہ اس نے اپنی عورتوں کو برمیوں کے سامنے با لکل ڈال دیا ہے، یہ اس قوم کے زوال کا ایک بین ثبوت ہے، اس کے برعکس روہنگیا مسلمانوں پر فخر ہے کہ اس نے یہ اور اس قسم کے ظلم کو نہ ماضی میں قبول کیا اور نہ آئندہ قبول کرے گا، انشاءاللہ تعالی۔

نظریات کی بنیاد پر نشانہ بنانا

ہماری تحریک آزادی کی تاریخ میں ایک بات ایسی ہوئی کہ ہمارے بعض حضرات اپنے نظریات کی حقانیت کے ثبوت کے لئے دوسروں کے نظریات کو قطعی طور پر خطا ماننے پر تلے ہوئے تھے۔ اور یہ بھی سمجھ بیٹھے تھے کہ انہوں نے ہمارے مخالف نظریات کی حمایت کر کے ملک وقوم سے غداری کی ہے، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ہر کوئی اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق ملک وملت کی خدمات انجام دینا چاہا ہے، البتہ یہ اور بات ہے کہ دنیا میں کبھی تیر نشانے پر بیٹھتا ہے اور کبھی نہیں بیٹھتا، اور کبھی کسی کے نشانے چوک بھی جاتے ہیں، اب کیا یہی ہونا چاہئے کہ جس کا نشانہ چوک گیا اسے غدار ملک وملت کہہ کر اور اس کی نیت وکردار کو مشکوک بنا بنا کر ملک وقوم کے سامنے ہمیشہ کے لئے پیش کر دیا جائے، پھر ساتھ ہی ساتھ اسے رسوا اور تذلیل کرنے کی کوشش بھی کی جائے، میرے خیال میں یہ ایک بہت بڑا غلط طریقہ ہوگا، اس سے آنے والی نسل کی حوصلہ شکنی ہوگی، سچ تو یہ ہے کہ کسی ایک غلط اندازے کے ذریعے برسوں کے اچھے کاموں پر پانی پھر دینا یہ احسان فراموشی کے سوا کچھ نہیں۔

جہاں تک نیت کا سوال ہے کہ جب تک پختہ ثبوت نہ مل جائے، تب تک کسی کی نیت پر شک کرنا سخت زیادتی ہے، اور یہ بھی ایک بات ہے کہ قوم کی بھلائی اور فلاح کے لئے فرزندان ملت کے کام اور سوچنے کا طرز طریقہ الگ ہوسکتا ہے، ہر معاملہ میں نفی کا پہلو تلاش کرنے کے بجائے مثبت پہلو پر دھیان دینے کی بڑی ضرورت ہے، دنیا میں کوئی بھی انسان دودھ کا دھلا ہوا نہیں ہوتا اور نہیں ہوسکتا، اس لئے ہر کسی کو چاہئے کہ اپنے اندر جھانک کر دیکھے، دوسروں کی نیت پر شک کرنے کے بجائے اپنی نیت کی اصلاح کرنے کی کوشش کرے۔

ماضی میں ہماری تحریک آزادی کے چند حضرات اپنے نظریات کی بنیاد پر زخم کھا گئے تھے، جبکہ اسلام کے روشن اور لازوال اصولوں کے تحت کہا جائے تو ان کے نظریات اسلام اور عین فطرت پر مبنی تھے، مگر ان کو بھی اس زاویے سے نشانہ بنایا گیا تھا کہ ان کے نظریات ملک وقوم کے لئے بہت بڑے

خطرے ہیں، صرف یہ نہیں بلکہ ان کے خلاف سازش اور پروپیگنڈوں کا ایک سلسلہ شروع کر دیا گیا تھا، حتی کہ ان کو مجبور کر دیا گیا تھا کہ وہ نہ صرف اپنے نظریات چھوڑ دیں، بلکہ ہمیشہ کے لئے صفحہ تحریک سے اوجھل ہو جائیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ نہ صرف خود تحریک کے صفحے سے دستبردار ہو گئے بلکہ آنے والی نسل کے لئے خود ان کے حالات مایوسی کی علامت بن گئے ہیں، جس سے روہنگیا قوم کا بہت بڑا نقصان ہوا ہے۔

اجتماعی احساس وارادہ وقوت عمل

اس میں شبہ نہیں ہے کہ مصیبت اور پریشانیوں نے روہنگیا مسلمانوں کو ایک عالم آشوب میں گرا دیا ہے، ان پر برمی اوباشوں نے حملہ کے ذریعے ان کی زندگی کو تنگ کر دیا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان مسلمانوں کے اعلی سے لے کر ادنی افراد تک میں یہ احساس ہو چلا ہے کہ وہ مظلوم ہیں اور برمی اوباش ظالم، ان میں یہ بھی احساس آ گیا ہے کہ ان پریشانیوں اور آلام سے نجات ان کے لئے ایک لازمی چیز بن گئی ہے، باوجودیکہ روہنگیا مسلمانوں کی جانب سے ان پریشانیوں وآلام سے نجات حاصل کرنے کی بارہا کوشش ہوئی، مگر ان کی ہر کوشش اپنی منزل سے دور رہ گئی ہے، اور آج تک نجات کا راستہ غیر واضح سا رہ گیا ہے۔

یہاں سب سے بڑی حقیقت یہی ہے کہ روہنگیا مسلمانوں میں اپنی مظلومیت کا احساس ضرور ہے، مگر یہ احساس انفرادی طور پر ہے، اجتماعی طور پر جس احساس کی ضرورت تھی اس کا شدید فقدان ہے، اس کی سب سے بڑی مثال اگر ڈھونڈھنی ہے تو ہمیں تاریخ کی ورق گردانی کرنی ہوگی، ۱۹۴۷ء سے لے کر برمی اوباشوں کے خلاف باوجودیکہ روہنگیا مسلمانوں کے حساس افراد نے قدم اٹھایا ہوا ہے، مگر اجتماعی طور پر خود روہنگیا مسلمانوں نے اپنے مجاہدین اور اپنی نجات کی کوشش کرنے والوں کا ساتھ نہیں دیا ہے، البتہ یہ تو ضرور ہے کہ بعض حساس افراد نے ان مجاہدین کا ساتھ ضرور دیا، مگر عوام کی اکثریت جو علم وہنر سے عاری تھی نے ان مجاہدین سے نفرت وعداوت کا برتاؤ کیا تھا، اور ان کے ہر پروگرام سے پہلو تہی کی تھی، صرف یہی نہیں بلکہ مجاہدین کے خلاف قدم اٹھانے میں بعض بدکردار افراد نے کسی قسم کی کسر باقی نہیں رکھی تھی، یہ الگ بات ہے کہ اس حوالے سے مجاہدین کی کوتاہیاں بھی تھیں اور عوام کی نازیبا حرکات بھی، خیر جو کچھ بھی ہو، مجاہدین ہیں تو ہمارے، اور عوام بھی تو ہم تھے، الحاصل یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ ان اجتماعی جدوجہد میں سوچی سمجھی منصوبہ بندی کا شدید فقدان تھا۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ ارادہ کی پختگی کی بھی بڑی ضرورت تھی، تاریخ کی ورق گردانی سے پتہ چلتا ہے کہ ایک طرف تو قومی سطح پر روہنگیا مسلمانوں میں اجتماعی احساس کا فقدان تھا اور اب بھی ہے، دوسری

طرف بعض حضرات جو حساس قسم کے تھے ان میں بھی ارادہ کی پختگی اور بلند حوصلگی کی شدید کمی تھی، ظاہر ہے کہ ایک انقلاب کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لئے قوم میں اجتماعی احساس کی ضرورت کے ساتھ ساتھ حساس افراد میں ارادہ کی پختگی اور اولوالعزمی کی از حد ضرورت ہوتی ہے، اس کے بغیر انقلاب کبھی بھی کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوسکتا۔

حد تو یہ ہے کہ آج کل روہنگیا عوام میں اجتماعی احساس کی سطح گرتے گرتے تقریباً زیرو سے بھی نیچے آ گئی ہے، حتی کہ ان کی اکثریت کے اندر اپنی مظلومیت کا احساس بھی نہیں رہا ہے، انہوں نے یہ کہہ کر ظلم یا ظالم سے ساز باز کر لی ہے کہ مظلومیت ان کی تقدیر کی چیز ہے، جسے ٹالا نہیں جا سکتا، وہ دنیا میں مظلوم ہونے آئے اور مظلوم ہی رہیں گے، جس سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ ظلم کو انہوں نے اپنی زندگی کا اثاثہ یا طبیعت ثانیہ بنا لیا ہے۔

ادھر قوت عمل کا جہاں تک سوال ہے کہ روہنگیا مسلمانوں کے چند گنے چنے حساس افراد جن میں ارادہ کی پختگی کی تھوڑی بہت جھلکیاں نظر آتی ہوں، ان کی اکثریت میں قوت عمل کی سکت کم نظر آتی ہے، ایک انسان کے اندر احساس بھی ہو اور ارادہ کی پختگی بھی، لیکن عملی دنیا میں اترنے یا اتر کر کسی عمل کو انجام تک پہنچانے کی قوت نہیں ہے تو وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا، حتی کہ اس کے لئے اپنے احساس وارادہ سمیت بیٹھے بیٹھے آہ وفغاں کرنے کے علاوہ اور کوئی راستہ باقی نہیں ہوسکتا، قوت عملی کے لئے جسمانی تندرستی کی بھی ضرورت ہوتی ہے، ہماری تقریباً پوری قوم کو مایوسی کی بیماری نے نڈھال کر دیا ہے، غرض ایک انقلابی قوم کے لئے اجتماعی احساس، ارادہ کی پختگی اور قوت عمل کی از بس ضرورت ہوتی ہے، اس کے بغیر وہ کامیابی سے ہم کنار کبھی بھی نہیں ہوسکتی۔

پھر روہنگیا مسلمانوں کو بہت سے تاریخی حادثات نے بے بس کر دیا ہے، لیکن سچ میں ایک بات یہ بھی ہے کہ اتنے حادثات کے ہوتے ہوئے بھی الحمد للہ یہ قوم کلی طور پر فنا نہیں ہوئی، مگر ان کے اندر بے شمار کمزوریاں دکھائی دے رہی ہیں، جن میں اجتماعی احساس بھی ایک بڑی کمزوری ہے، جو بڑھ کر ایک عظیم بیماری بن چکی ہے، جس کی وجہ سے یہ قوم ہلاکت کی وادی تک پہنچ سکتی ہے، حاصل کلام یہ ہے کہ روہنگیا مسلمانوں کے لئے ابھی جس چیز کی سب سے بڑی ضرورت ہے، وہ ہے اجتماعی احساس کے

ساتھ ہی ساتھ اجتماعی فکر وعمل ،جس کے بغیر یہ قوم فتح وکامرانی اور نجات سے ہم کنار کبھی بھی نہیں ہوسکتی ،اس سلسلے میں یہ بھی یاد رہے کہ جب افراد کے جذبات، احساسات، خیالات مشاعر و عواطف کے علاوہ عمل میں اتحاد وتوافق ،توازن وہم آہنگی پیدا ہوجاتی ہے،تو ان سے ایک نئی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے،جس کو شعور اجتماعی کہا جاتا ہے،جس کے بغیر ایک قوم زندگی اور زندہ دلی جیسی صفات سے بہرہ ور نہیں ہوسکتی۔

جذبۂ جنگ جوئی کا انحطاط

تاریخ شاہد ہے کہ روہنگیا قوم ایک تاریخی جنگجو قوم ہے،تاریخ میں اس نے انسانیت کے دشمنوں سے بہتوں مرتبہ جنگ لڑی ہے،ایک دو کو چھوڑ کر ہر بار وہ کامران ہی رہی ہے،اس ضمن میں ایک بات یاد رکھنے کی ہے کہ سرزمین ارکان میں جس طرح مسلمانوں کے بعض قافلوں نے یہاں کے ہندو عوام اور دیگر حکمرانوں کو اپنے پاکیزہ بلند اخلاق اور پاک اوصاف کے ذریعے اپنایا تھا،ٹھیک اسی طرح یہاں انہوں نے تلواروں،خنجروں،تیغوں، نیزوں اور ڈھالوں سے بھی ان کو رام کیا تھا،بعض حضرات ارکان میں محمد بن حنفیہ کی آمد اور ان کے جہادی کردار کو مسترد کرتے ہیں، اور ان کی ساری داستان کو ایک مصنوعی داستان اور دیو مالائی جیسی کہانی تصور کرتے ہیں،لیکن انہوں نے اس بات کا علمی طور پر جواب نہیں دے سکا کہ کوہ نائیٹونگ کی اس بلند چوٹی جسے مقامی لوگ آج بھی ”حنیفا رٹونگی“ سے جانتے اور پہنچانتے ہیں اس سے مراد اس محمد بن حنفیہ کے علاوہ اور کون ہے؟ جس نے قریہ پری (خیرہ پری) سے جنگ لڑی اور اسے زیر کر کے اسلام کے حلقہ میں داخل کرلیا گیا،ہم مانتے ہیں کہ اس جنگ وجدل کی کہانی ذرا دیو مالائی قسم کی ہے،لیکن اس حقیقت کو سرمو انکار یا مسترد کیا جائے تو دنیا کی بیشتر تاریخی کہانیوں اور تاریخی دستاویزوں کو ہمیں انکار ومسترد کرنا پڑے گا، کیوں کہ ہم دیکھتے ہیں ایران و ہندوستان کے علاوہ دنیا کی دوسری تیسری زمینوں اور علاقہ جات کی تاریخی کہانیاں اور دستاویزات کے رنگ وروپ بھی اس جیسے ہیں،ان سے انکار جس طرح تاریخ سے انکار ہے،ٹھیک اسی طرح محمد بن حنفیہ والی اس تاریخی کہانی کا انکار بھی اس سے کسی طرح کم نہیں ہے۔

بعد ازاں تاریخ کا ایک عظیم حادثہ جسے لوگ شہادت شہزادہ شجاع بن شہنشاہ ہندشاہ جہان کے نام سے جانتے ہیں،اس حادثہ کے دوران روہنگیا مسلمانوں نے اپنے غیر مہذب دشمن سے جس بے سروسامانی کے عالم میں بھی مقابلہ کیا تھا،اس سے یہ بات سورج کی طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ درحقیقت روہنگیا مسلمان ایک عظیم، باعزت جنگ جو قوم ہے، جو حق کے لئے قربانی دینا جانتی ہے،باوجودیکہ شہزادہ

والی اس جنگ میں اس کی ہار اور دشمن کی جیت ہوئی تھی، لیکن اس کے اس دلیرانہ اقدام نے تاریخ ارکان کو ایک روشن باب بھی فراہم کیا ہے، جس کا سلسلہ تادم تحریر الحمدللہ باقی ہے۔

۱۹۴۲ء کو باوجودیکہ ارکانی مگھوں کو برمی اوباشوں نے اپنا کر ایک سازش کے تحت مشرقی ارکان کے مسلمانوں پر اچانک حملہ کر کے وہ لاکھوں مسلمانوں کو تہ تیغ کرنے میں کامیاب ہوا تھا، لیکن جب مسلمانوں نے حالات اور تقاضائے حالات کو بھانپ کر مغربی ارکان میں اپنے دشمنوں سے ڈھٹ کر مقابلہ کیا تو بہت قلیل مدت میں ان مسلمانوں نے اپنے دشمن کو زیر کر کے کم سے کم مغربی ارکان کو ظالموں کے پنجے سے آزاد کر لیا تھا، اور دشمن کے سارے عزائم ومقاصد تہ و بالا ہو گئے تھے، یہ اور ان جیسی تاریخی کہانیاں اُن مسلمانوں کی زندہ دلی کی زندہ مثال ہیں، جنہیں اس قوم کی ان مٹ تاریخ ہمیشہ یاد کرتی رہے گی۔

۱۹۴۷ء کو تحریک آزادی ارکان کا روشن دور شروع ہوا تو مجاہدین آزادی کے ہیرو جناب جعفر قوال مرحوم اور آپ کے رفقائے کار نے جس دلیری اور بہادری کا ثبوت پیش کیا تھا، وہ بھی ایک یادر کھنے کی چیز ہے، جن میں سب سے بڑا واقعہ شہید اعظم جناب عبدالشکور دابوی کا واقعۂ شہادت ہے، ان کے بعد مرحوم قاسم راجا اور ان کے رفقائے کار کی دلیری اور بہادری کے وہ حسین وجمیل واقعات ہیں، جو سرزمین ارکان کے روشن خیال اور انقلاب وقومی حالات سے دلچسپی رکھنے والے لوگ ہمیشہ یاد کرتے رہیں گے، کون نہیں جانتا کہ ایک ایک مجاہد نے سینکڑوں دشمن سے جنگ لڑی تھی، راہ خدا میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کر دیا تھا۔

درحقیقت سرزمین ارکان کی تحریک آزادی (چاہے اس کا تعلق جہاد کونسل سے ہو یا مجاہد پارٹی سے، چاہے اس کی نسبت آرکان آزاد فوج سے ہو یا ار پی ایف سے) ایک ایک مجاہد سینکڑوں سے لڑکر فتح و کامرانی سے ہم کنار ہوا تھا۔

لیکن اب افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آج کل قوم کے اکثر افراد جہاد فی سبیل اللہ اور حق کے لئے مر مٹنے سے جی چرانے لگے ہیں، ماضی میں اس قوم کی دل لگی جو جہاد سے تھی اب ختم ہونے جارہی ہے، ان کے چہرے میں ایک قسم کی مایوسی اور اداسی نظر آتی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے حق کی پرچم

بلند کرنے کی عادت سے سرموانحراف کر کے دشمن اور زمانے سے ساز باز کر لیا ہے، بات تو ایسی ہے کہ ایک قوم کے اندر اگر چند حضرات اپنے دھن اور اپنے قومی لگن میں ہیں تو بھی ایک قوم کی نحوست (جو اس کے چہرے میں نظر آتی ہے) کو دو چار افراد کی انفرادی کوشش دور نہیں کر سکتی، اس کے لئے پوری قوم کو پوری ذمے داری کے ساتھ اجتماعی کوشش کرنی پڑتی ہے، ایک قوم کے چند افراد کی انتھک کوشش (جسے سراہے جانے کی قابل ضرور ہے) ایک پوری قوم کی اجتماعی خطاؤں کے کفارے نہیں ہوسکتی، پوری قوم کو اس کی تلافی کے لئے جدوجہد کرنی پڑتی ہے، اور یہ بھی یاد رکھنے کی چیز ہے کہ چند افراد کے خون کے آنسو پوری قوم کی اجتماعی خطاؤں کے کفارے نہیں ہو سکتے، بلکہ پوری قوم کو اس کی تلافی کے لئے انتھک جدوجہد کرنی پڑتی ہے، آج روہنگیا مسلمان جن جن حادثات کے شکار ہونے لگے ہیں، نہ جانے ان کا مستقبل کس وادئ پرخار میں گرنے والا ہے، میرا یقین ہے کہ ان کی آزادی اور خودداری کے بجھتے ہوئے چراغ کو قربانی اور جان سپاری کے ساتھ مر مٹنے والے پروانوں کے خونِ جگر کی ضرورت ہے۔

انانیت اور خودغرضی

روہنگیا مسلمانوں کی پچھلی تحریک میں ایک چیز بڑی عیاں نظر آتی رہی ہے، وہ ہے بعض حضرات کی انانیت اور خودغرضی، اس تحریک کی شروع ہی میں انانیت اور خودغرضی اس کے بعض اراکین اور کارکنوں میں کارفرما ہوگئی تھی، حضرت جعفر حسین قوال مرحوم نے اس تحریک کی بڑے اخلاص وللّٰہیت سے بنیاد رکھی تھی، لیکن ظالموں نے قوم کے اس عظیم قائد ورہبر کو بھی نہیں چھوڑا، بالآخر انہیں شہید کردیا گیا، البتہ یہ تو سچ ہے کہ ان کی شہادت میں دشمنوں کی سازش ضرور کارفرما تھی، مگر بات یہ ہے کہ دشمن تو آخر دشمن ہوتا ہے، لیکن ظالموں نے دوستوں کی شکل میں دشمن کی سازش کو کامیاب بنایا تو روہنگیا مسلمان اپنے اس عظیم ہیرو سے محروم ہوگئے، ان کی شہادت حسرت آیات کے بعد یکے بعد دیگرے اس میدان خاک وخون میں بہتوں شخصیتیں ابھریں، جنہوں نے ملک وقوم کی خاطر قربانیاں دیں، میدان کارزار میں خاک وخون سے کھیلا، کوئی شہید ہوئے تو کوئی غازی بنے، مگر مجموعی طور پر دیکھا جائے تو یہ ساری شخصیتیں بھی سازشیوں کی سازش سے نہ بچ سکیں، ملک وقوم کی خدمات کے اس میدان میں تقریباً ہر ایک زخم سے چور ہوئے تھے، آخر ایسا کیوں ہوا؟ اس کی اصلیت اور حقیقت ڈھونڈی جائے تو نظر آتا ہے کہ اس تحریک کے ایک دور میں اس کے بعض اراکین اور کارکنوں کو انانیت وخودغرضی کی بیماری نے گھن کی طرح کھالیا تھا، جس کے ایک مرحلہ میں ان کے اندر جو لازمی قوت تحمل وبرداشت تھی، ختم ہوکر رہ گئی تھی، جس کے نتیجے میں بارہا ایسا وقت بھی آیا کہ ان میں سے کوئی دوسرے کی عزت وآبرو کے علاوہ جان تک کے پیچھے پڑ گیا تھا، منصب قیادت کے نشے میں چور ہوکر شتر بے مہار کی طرح ہوگیا تھا، وقت کے ساتھ ساتھ یہ حالت اور بھی انحطاط کی طرف بڑھ رہی تھی، فرصت ملتے ہیں ایک نے دوسرے کو ہٹا کر خود منصب سیادت وقیادت پر جلوہ افروز ہونے پر تل گیا تھا۔

انسان کی اخلاقی کمزوریوں میں نفسانیت سب سے بڑی کمزوری ہوتی ہے، البتہ یہ تو ماننا پڑتا ہے کہ کبھی کبھار یہ انانیت جو انسان کی فطری چیز ہے مفید بھی ثابت ہوتی ہے، اور اپنی حد تک سودمند

بھی، لیکن عام طور پر انسان اسے اپنی اور اپنی نسل وقوم کی بھلائی کی جگہ خرابی کے لئے استعمال کرتا ہے، روہنگیا مسلمانوں کے قومی قائدین میں سے بعض حضرات اس نفسانیت کی بیماری میں مبتلا ہوگئے تھے، جس نے ان کی تمام دینی، قومی، سیاسی، علمی، فکری، روحانی واخلاقی اقدار کو پارہ پارہ کردیا تھا، انہوں نے اپنے ہاتھوں ساری روحانی اقدار، قومی ثقافت، دینی فریضہ، ایمانی تقاضا اور تحریکی وانقلابی چاہت وطلب کو ملیا میٹ کردیا تھا۔

اللہ تعالی نے انسان کے اندر جذبہ نفسانیت دیا اور ضرور دیا ہے، لیکن اسے استعمال کرنے کی جگہ بھی مقرر کردی ہے، اس خدا کی دی ہوئی اس ودیعت کو انسانی ترقی وکامیابی کی کوشش میں استعمال کرنا چاہئے، اسے چاہئے کہ اپنے دین، وطن وقوم اور اپنی اگلی نسل کی خیرخواہی اور حفاظت کے لئے استعمال کرے، لیکن شیطان نے اس جذبہ کو اپنے ہاتھ میں لے کر اسے گمراہ کردیا ہے، اور تھوڑی سی تبدیلی کی شکل میں اسے عشق نفس اور پرستش ذات کا روپ دے کر مصدر خیر سے ہٹایا اور شر کی وادی میں دھکیل دیا ہے۔

ہماری تحریک آزادی کے بعض کارکنوں اور قائدین میں ایک خرابی وعیب یہ بھی نظر آتا ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو بے عیب اور ہر ایک برائی سے پاک وصاف تصور کرنا شروع کردیا، باوجودیکہ بعض ان میں سے عیوب کا مخزن اور منبع بھی تھا، صرف یہ نہیں بلکہ ایسے بیمار بعض افراد اپنی ان کمزوریوں، برائیوں، خامیوں اور عیبوں کو شر تصور کرنے کے بجائے خیر بنانے کی فکر میں لگ گئے تھے، اور اپنے بعض نقائص اور عیوب کا عجیب وغریب تاویل کرنا شروع کردیا تھا، ان کی اس حالت نے آگے چل کر اپنی اصلاح نفس کے سارے دروازے بند کردیے تھے، پھر وقت کے ساتھ ساتھ ان کی یہی خواہش ہوئی تھی کہ وہ اپنی ذات کے متعلق جو چیز فرض کرلیتا تھا، وہی دوسرے حضرات بھی فرض کرلیں کہ وہ "امر خیر" ہے، اور اس کے ہر ایک اعمال اور کارکردگی چاہے اس کا تعلق شر سے ہو، اسے خیر کہہ کر لوگ خراج تحسین کا نذرانہ پیش کریں، اور ساتھ ہی ساتھ لوگ یہ بھی کہے کہ فلاں ہر ایک سے عزیز بھی ہے اور باوقار بھی، وہ ہر ایک کے قائد بھی ہے رہبر بھی ہے محسن بھی، جس کا نتیجہ یہی ہوا ہے کہ کسی بھی امر میں وہ اپنے کو تنقید کا نشانہ دیکھنا برداشت نہیں کیا تھا، یوں وہ اپنی تمام اصلاح کی گنجائش کو سد باب کرکے پوری قوم کی گردن پر ایک ظالم قسم کا طاغوت بن گیا تھا، جو آگے چل کر دیگر قائدین اور قوم وملک

کے لئے ایک عظیم خطرہ بن گیا تھا، حالت ایسی پیدا ہوگئی تو قوم کے لئے اس سے پہلو تہی کرنے کے علاوہ اور کوئی راستہ باقی نہیں بچا تھا، تو وجہ یہی تھی کہ ایسے چند افراد کی خود غرضی، خرابی نیت کی بیماری نے آگے چل کر پوری قوم کو ان مجاہدین اور تحریک کے خلاف نفرت و عداوت کی وادی میں پہنچ جانے پر مجبور کر دیا تھا، ویسے قوم نے ایک فرصت کی تلاش شروع کر دی، اور فرصت ملتے ہی اسے ختم کرنے کے لئے اپنے تاریخی دشمنوں تک کا سہارا ڈھونڈا، اس لئے کہ قوم نے یہ بات کبھی بھی برداشت نہیں کی کہ خود اس کے اندر سے نکل کر ان کے مفاد کے خلاف کوئی کام کرے، ان کے مال و دولت، عزت و ناموس پر ڈھاکہ ڈالے، ان کی وقار و اقدار کی ہولی کھیلے، اس چیز کا مظہر دراصل حضرت جعفر حسین قوال کی شہادت کے بعد سے شروع ہوا تھا، جس کا سلسلہ اگلے دن تک باقی رہا۔

الغرض خود غرضی اور انانیت کے شکار انسان خود اپنے تمام داخلی اور خارجی وسائل اصلاح سے محروم ہو کر رہ جاتا ہے، اگر کوئی اسے اصلاح کرنے آئے تو وہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ وہ اسے کنٹرول کرنے آئے، اور اس کی ساری صلاحیت واستعداد کو چرانے آئے ہیں، ویسے اس مصلح کے سارے افکار اصلاح سے تصادم کرنا شروع کر دیتا ہے، حتیٰ کہ ہماری تاریخ میں ایسی چیز بھی دیکھنے میں آئی کہ ایک آدمی ان قائدین کو اصلاح کرنے آئے تو ان کو نہ صرف ذلیل وخوار کر دیا گیا بلکہ آگے چل کر ان کو جان سے ختم کرنے کی دھمکی بھی دی گئی تھی، بالآخر اس مصلح شخص کی تمام کوشش میں پانی پھر گیا، یوں ساری خرابیاں دھرے کے دھرے رہ گئیں۔

بسا اوقات خود غرض قائدین اپنے اطراف میں پھٹو جمع کرنے کے ماہر بھی ہوتے ہیں، ایسے پھٹو جو کسی کام کے نہیں ہوتے، صرف اور صرف ''جی حضوری'' اس کا شیوہ ہوتا ہے، یہ پھٹو صرف اس کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ کسی نہ کسی طریقے سے اسے اپنے آقا کی خوشنودی حاصل ہو جائے، اور ہر وقت اپنے ممدوح کو خوش کر کے اپنا کام نکالنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں، ہمارے سیاسی معاشرہ میں چند لوگ ایسے بھی نظر آئے کہ وہ قریب سے ہو یا دور سے اپنے آقا کو یہ بات سمجھاتے رہتے تھے کہ حضور کا سارا کام اور تمام کارکردگی قابل مدح اور بالائے ذم ہیں، اس ناجائز چڑھاوے کی وجہ سے بہت سے قائدین خود یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ وہ بذاتہ بالائے تنقید ہیں، تو ظاہر ہے کہ اس عالم میں اگر ایک مصلح ان کو اور ان کے سارے اعمال کی خبر لینے نکلے تو اس کے لئے کام کرنا کٹھن ہوسکتا ہے؟ ہمارے سیاسی

معاشرہ میں ایک سے زیادہ حضرات مصلحین آ بھی نکلے تھے، لیکن اس افراتفری کے عالم میں چند قائدین کی سوانح کے جائزے سے معلوم ہوا کہ وہ ان کے پیچھے پڑ گئے تھے، اس قسم کی مثالیں سرزمین ارکان کی تحریک آزادی کی تاریخ میں نہیں بلکہ دنیا کے دیگر حکمرانوں اور سرزمینوں کی تاریخ میں بھی پائی جاتی ہیں، اس حوالے سے ہماری تحریک آزادی کی تاریخ میں ایسی چیزیں دیکھی گئیں کہ یہ کام عامۃ الناس سے بڑھ کر ایسے نام نہاد علماء نے زیادہ کیا، جو نہ دنیا کی خبر رکھتے اور نہ آخرت سے ان کا کوئی لگاؤ تھا، بعد میں ایسے نام نہاد علماء کی یہی پھٹوا گری ارکان کے سارے علماء کے ماتھے کے ٹیکے بن گئی ہے، ورنہ سرزمین ارکان ایسے علماء سے خالی تھی اور نہ اب بھی ہے کہ جنہوں نے اپنے علم وعمل سے ایک جہاں کے جہاں کو روشن اور تاباں کیا تھا، اور جن کی شخصیت اور علم وعمل کی روشنی دور دور تک پھیل چکی تھی، اللہ تعالیٰ ایسے علمائے دین کو جزائے خیر دے اور ان کے درجات کو بلند کرے۔

ویسے ہماری تحریک آزادی کا ایک باب ''مجاہد پارٹی'' کو لیجئے، جس کا قائد ومحرک جناب مرحوم ابو القاسم بن عطاء الدین راجا تھا، روایت اور وہ بھی بہت صحیح روایت سے معلوم ہوا کہ ان کو بھی چند ایسے نام نہاد علماء نے گمراہ کیا تھا، جن کا کام صرف قائد تحریک کو خوش کرنا تھا، یہ لوگ اس کو یہ سمجھاتے رہتے تھے کہ حضور کے ہر اعمال واطوار، ہر کارکردگی وسرگرمی اور فکر ونظر نہ صرف قابل مدح ہے بلکہ بالائے تنقید بھی، آپ پر تنقید کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے، ویسے ایک روایت سے پتہ چلا کہ:

> ''قاسم راجا صاحب نے ایک موقع پر چند علماء سے پوچھا کہ میں تو یہاں کا ایک راجا ہوں، ابھی میرے چار بیویاں ہیں، کیا میں ان پر اور ایک شادی کرسکوں گا؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ حضور! اسلام کی تاریخ شاہد ہے کہ ہمارے حکمران چار بیویوں کے علاوہ کتنی کتنی لونڈیاں جمع کر لیتے تھے، آپ بھی یہاں کا ایک بادشاہ ہیں، آپ کے لئے چار سے زیادہ نکاح بھی جائز ہے اور لونڈیاں رکھنی بھی جائز، اب راجا صاحب نے وقت کے ایک مربی ومرشد عالم دین سے پوچھا تو انہوں نے ممانعت پر فتوی دیا تھا، اس کے بعد کہتے ہیں کہ راجا صاحب نے ان مذکورہ علماء کو جائز سزا دی تھی، اللہ تعال ہمارے اس عالم دین کو جزائے خیر دے، جنہوں نے

دین اسلام کی روشنی میں ممانعت کا فتوی دیا تھا‘‘۔

درحقیقت ہماری تحریک آزادی کی تاریخ میں مجموعی طور پر ایسی تعلیم وتربیت کا فقدان تھا کہ جس سے انسان کو انسان پرستی سے ہٹا کر حق پرستی یا دوسرے الفاظ میں خدا پرستی کی طرف لے جاتا ہو، تحریک آزادی کے اولین قائدین کی بیشتر زندگیوں کا جہاں تک ہم نے جائزہ لیا کہ انہوں نے اپنی قوم کے نوجوانوں کو ہتھیار بازی (اور وہ بھی محدود پیمانے میں) کی تربیت دی اور ضرور دی، مگر اس ہتھیار بازی کے ساتھ ہی ساتھ ایسی تعلیم وتربیت نہ دے سکی، جس سے خود میں بھی اور اپنے مجاہدین میں بھی اسلام کی روح اور مزاج رواں دواں ہو جائے، جس تعلیم کے فقدان کی وجہ سے یہاں وہ ساری خرابیاں پیدا ہو گئیں جو ہو سکتی تھیں، جن میں خودغرضی، انانیت، غرور و پندار، تکبیر و نارو انخوت، بے یقینی و بددیانتی قتل وخون وغیرہ چیزیں سرفہرست ہیں، جن کی وجہ سے یہاں ایک ہو کا عالم پیدا ہو گیا تھا، بالآخر یہ تحریکیں اپنی راہوں پر گامزن ہوتے ہوتے ٹھہر گئیں، یہ تحریکیں پھول جیسی تھیں، لیکن بن کھلے مرجھا گئیں۔

قیادت کے افق پر ہمارے بعض ایسا خودغرض بھی دیکھا گیا کہ وہ اپنے ہم عصر کسی بھی دیگر شخصیت کو برداشت کرنے کو تیار نہیں ہوا، کوئی باصلاحیت شخصیت قومی قیادت کے افق پر آنے لگی تو وہ اس کے پیچھے پڑ گیا، اگر اس خودغرض کی نظر کسی ایسی قومی شخصیت پر پڑی کہ مستقبل میں وہ ملک وملت کے اس میدان میں کود کر سامنے آنے والا ہے اور اپنی صلاحیت واستعداد کا مظاہرہ کرنا چاہتا ہے، تو وہ خودغرض اس ابھرنے والی شخصیت کو سرے سے ختم کر دینے کی راہ ڈھونڈی، یوں ہماری قومی سیاست وتحریک کے افق پر باصلاحیت وبااستعداد افراد ابھر کر سامنے نہیں آسکے، جس کا نقصان نہ صرف ملت اسلامیہ ارکان کو ہوا بلکہ قوم بھی اگلی نسل سے ابھرنے والی نئی قیادت سے محروم ہوگئی، یہ ایک بڑی اور خطرناک محرومی ہے کہ جس کی طرف قوم کے ارباب بست وکشاد کی نظر ضرور ہونی چاہئے۔

آج کل تو معاملہ ایسا ہوا ہے کہ بعض نام نہاد انقلابی خود بھی کام نہیں کرتا اور بس کام کے نام پر میدان میں ہوائیں اڑا رہا ہے، صرف یہی نہیں بلکہ دوسروں کو بھی کام کرنے کا موقع دینا نہیں چاہتا ہے، ان کا بڑا کارنامہ یہی ہے کہ وہ دوسرے کام کرنے والے کی راہ روکے، ان کی فکر بس یہی ہے کہ خدا نہ کرے کہ کوئی ایک جماعت جو ملک وملت کے حق میں کام کرنے والی ہوا بھر کر سامنے آنے پائے، کیوں کہ

ان کو یہی اندیشہ ہمیشہ ستاتا رہتا ہے کہ ایک کام کی جماعت میدان میں قومی سطح پر ابھر کر آئے تو ان کا خودغرضانہ اور مفاد پرستانہ کردار پر تنقید شروع ہو جائے گی، ان کے اس خودغرضانہ فکر کا نتیجہ تھا کہ ماضی قریب میں انہوں نے بعض معاصر جماعت پر نہ صرف تنقید وگرفت کی بلکہ ان کے خلاف باضابطہ طور پر نبرد آزمائی بھی کی تھی، ہمارے سامنے اس نوعیت کے ایک سے زیادہ واقعات ہیں، جن سے یہ بات سورج کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ انہوں نے صحیح معنوں میں ابھرنے والی قیادت کو ختم کرنے کی کوشش کی ہے، اگر حال ایسا رہا تو ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ آئندہ ایک بھی ان مفاد پرستون کے ہوتے ہوئے صحیح معنی کی ایمانی اور روحانی، مستعد اور کام کرنے والی تنظیم قومی سطح پر ابھر نہ آسکے گی ، ہماری ایسی حالت میں ہم اپنی قوم کی نئی قیادت، نئے نوجوانوں اور نئی نسل کو کہنا چاہتے ہیں کہ آپ اس دیوار بلا کو ہمیشگی کے لئے توڑ ڈالیں، اور انقلاب وقیادت کے نام پر نام نہاد لیڈر اور عیش وعشرت کے پیچھے بھاگنے والوں کے خلاف خود خاک وخون سے کھیل جائیں، اور ہم متحد ہو کر ایک ایسی جماعت کی تشکیل دیں، جو ملک وقوم اور مذہب وملت اسلامیہ ارکان کے حق میں کام کرے، اور ان باطل طاغوتوں کے پنجے سے وطن مقدس اور ملت اسلامیہ آزادی سے ہم کنار ہو سکے۔

اب دریچے کھلنے لگے

سرزمین ارکان اپنی تاریخ کی ابتدا سے ایک امن وسکون سے بھری پڑی آزاد اور خودمختار ریاست اور مختلف مذاہب ومتنوع گروہوں کا وطن رہی ہے، تاریخ شاہد ہے کہ یہاں کی قدیم اور اصلی تمام قوموں اور نسلی گروہوں نے اپنے وطن کی حفاظت، تعمیر وترقی، خوش حالی اور امن شانتی کے کام میں ہر دور، ہر زمانے اور ہر مواقع پر حصہ لیا تھا، اہل نظر جانتے ہیں کہ یہ ملک جب سے دو بڑی قوموں روہنگیا (مسلمان) اور مگھ (بدھ مت کے پیرو) کا گہوارہ بنا، تب سے مسلمانوں اور بدھوں نے اپنے وطن کو امن وسکون، شانتی اور خوش حالی سے بھر دینے کی راہ میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹھایا تھا، مروکو دورحکومت کو میرے دعوی کی روشن دلیل کے بطور مطالعہ کیا جا سکتا ہے، یہاں دونوں مذاہب کے لوگ تھے، مگر باہم شیروشکر اور پورے طور پر ہم آہنگ، ایک دوسرے کے دکھ درد اور خوشی اور پریشانی میں حصہ لینے والیاں، ہر قوم رنگ ونسل مذہب وعقیدہ اور علاقائی عصبیت سے دور، ہر مذاہب کے ماننے والے اپنے وطن کی روایتی طمانیت اور امن کی حفاظت اور بستان امن کو لالۂ محبت والفت سے سنوارنے میں مگن تھے، یہاں اس زمانے میں ایسا سوال شاید ہی آیا ہوگا کہ فلاں آدمی کس مذہب کا ماننے والا اور کس مشرب سے تعلق رکھتا ہے، اور فلاں کا تعلق رکھائنگ قومیت سے ہے یا روہنگیا سے؟ غرض ہر قومیں اور ہر نسلی گروہیں امن و سکون کی فضا میں اور اپنے اپنے مذہب ومسلک کے حدود کے اندر زندگی بسر کر رہی تھیں، اور وطن عزیز کو گلہائے امن وسکون سے آراستہ رکھنا ان کا اپنا وطنی فریضہ بن چکا تھا۔

مگر ارکان اور یہاں کے باشندگان کے لئے ۱۹۴۸ء کا سال ایک پرآشوب اور امتحان کا سال تھا، یہ وہ سال تھا کہ جس میں ارکان کے روایتی امن سکون کی خاموش فضا کو ایک ناقابل قبول لاقانونی شکل میں توڑا گیا، جس کے بعد اخوت اور وطنی بھائیچارگی کی جگہ عداوت ونفرت، ہم آہنگی اور طمانیت کی جگہ فتنہ و فسادات نے لی، اور یہ وہ سال تھا کہ جس میں ارکان اور یہاں کے باشندوں کے غیر، مشرقی پار کے

راوایتی مفسد، وحشی اور انتہا پسند دشمن برمنوں نے ارکان کو اپنے قبضہ میں لے لیا، اور یہاں والوں کو غلامی کی زنجیریں پہنادی گئیں، جس کے بعد آج تک باوجودیکہ یہاں کے باشندوں نے اپنے وطن کی آزادی کے لئے انتھک کوششیں کیں، مگر آزادی سے ہمکنار نہ کر سکے، اس وحشی دشمن نے ان کے تمام پروگرام کو تہ وبالا اور تمام منصوبوں پر پانی پھر دیا، اور مسلسل سازشوں اور پروپیگنڈوں کے ذریعے ان کے تمام کام کو ناکام بنا دیا، تو وجہ یہی ہے کہ آج تک سرزمین ارکان نہ آزاد ہوسکی اور نہ یہاں کے باشندوں نے اپنی گردن پر پڑی ہوئی زنجیر کو اتار سکا۔

۱۸۲۴ء میں برطانوی سامراجیوں نے اپنے روایتی پروپیگنڈوں کے ناطے ارکان پر قبضہ کرلیا، برطانوی دور کی سیاسی رنگ رلیوں اور دیگر تاریخی واقعات وحقائق سے صرف نظر اس موقع پر ایک بات یہ کہنے کی ہے کہ ان کے دورحکومت میں باجودیکہ ارکان میں برمی اقتدار ایک مدت کے لئے ختم ہوگیا تھا، مگر اس وقت بھی برمن سازش کاروں نے ارکانیوں کے خلاف کسی بھی موقع کو اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیا، پھر دوسری طرف حکومت برطانیہ نے بھی برمیوں کی دلداری ودل جوئی کے لئے ارکانیوں کی شدید مخالفت کے باوجود ۱۹۳۸ء میں برما کو برطانوی ہند سے علیحدہ کرتے وقت ارکان کو بھی برطانوی برما کا ایک حصہ بنا دیا، اب کی بار برمیوں کی چال بازی جو ارکان اور یہاں کے باشندوں کے خلاف تھی اور ہے آج تک کے لئے کامیاب ہوگئی۔

برمیوں نے ۱۹۳۷ء سے ارکان اور یہاں کے امن پسند باشندوں پر جس انداز سے مظالم ڈھائے ان کی تفصیلات کے لئے کم سے کم ایک موسوعہ کی ضرورت ہوگی، ان تمام مظالم میں ایک بڑا کارگر اور موثر ظلم یہ تھا کہ انہوں نے یہاں والوں کے تنوع سے فائدہ اٹھا کر ان کے مابین نفرت وعداوت اور مذہبی عصبیت کی ہوئیں چالو کردیں، اور برمیوں نے ایک خطرناک منصوبہ بندی کے تحت ۱۹۴۲ء میں یہاں وہ خون آشام خانہ جنگی کروائی، جس کی یاد سے دل دہل جاتا اور آنکھیں اشکبار ہوجاتی ہیں، جس کے نتیجے میں ایک لاکھ سے زیادہ روہنگیا شہید اور ہزاروں رکھائنگ زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔

واقعہ یہ ہے کہ ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کی پالیسی میں برمی شرپسند اپنے استاد برطانوی بھگوڑوں سے کسی طرح کم نہیں ہے، ۱۹۴۲ء کی یہ خانہ جنگی دراصل برمیوں کی ایک کامیاب سازش کے نتیجے میں ہوئی

تھی، جس سے ان برمیوں کا بڑا فائدہ ہوا تھا، اور تو اور اگلے آنے والے دنوں سالوں کے لئے ارکان ان کا ہو گیا ہے، اس واقعہ کے بعد ان وحشی برمیوں کے لئے ارکان کا میدان صاف ہو گیا ہے، اس خانہ جنگی کا حوالہ دے دے کر یہاں کی قوموں کے درمیان مزید افراتفری، عداوت اور نفرت کی ہوائیں دی گئیں، ویسے آج تک ارکان کے امن پسند باشندے اپنے روایتی سکون وامن، اتحاد و اتفاق سے محروم ہو گئے، اور ان کے درمیان بڑھتی ہوئی بے اعتمادی اور پھیلی پھیلائی گئی عداوت ونفرت سے حاصل شدہ نتائج کا پورا پورا فائدہ برمی شر پسندوں نے اٹھایا، بالآخر ۱۹۴۸ء میں برمی شر پسند عناصر اپنے مختلف پروپیگنڈوں اور متنوع سازشوں کے ذریعے ارکان کی دو بڑی قوموں کے درمیان اپنی بھڑکی بھڑکائی گئی نفرت وعداوت کی آتش فشانی سے فائدہ اٹھا کر ارکان کو برما کا ایک مستقل حصہ (مگر ناجائز طور پر) بنانے میں کامیاب ہو گئے۔

۱۹۴۸ء کے بعد اگرچہ ارکان کے ہشیار افراد اور یہاں کے مستقبل سے آگاہ اور باخبر لیڈروں نے ان دونوں قوموں کے درمیان نفرت وعداوت ختم کرنے اور ان کو غلامی و پابہ زنجیری سے آزاد کرنے کی کوشش کی تھی، مگر برمی غاصبوں نے ان کی تمام کوششوں کو ناکام بنا دیا، اور ایک بڑی جدوجہد کے با وجود نفرت وعداوت کی اس سلگائی گئی آگ کو بجا نہ سکا۔

پھر ۱۹۶۲ء کو برما کے بدنام زمانہ فوجی جنرل نیون نے برما کے مرکزی اقتدار پر مکمل قبضہ کر کے سرزمین ارکان کے باشندوں پر ایسے انسانیت کش مظالم ڈھائے، جن کی مثال چنگیز وہلاکو اور ہٹلر کی تاریخ میں شاید ڈھونڈے سے ملے گی، درحقیقت اس ڈکٹیٹر جنرل نے بدھ مت کو اپنے اقتدار کے مستقبل کی بحالی کے لئے خوب خوب استعمال کیا تھا، اور اس کے بدنام زمانہ پروگرام جسے دنیا ''برمیز وے ٹو سوشلزم'' کے نام سے جانتی ہے، دراصل ماکسیزم اور بدھ مت کے مخلوط فلسفہ کا دوسرا نام تھا، اس نے ارکان پر بھڑکنے والی نفرت وعداوت پر تیل کا کام کیا تھا، جس نے ارکان کے امن پسند باشندوں کے درمیان ممکنہ ہونے والی مفاہمت کے سارے دروازے بند کر دیے تھے، جس نے ''بدھ مت بچاؤ'' کے نام سے فرقہ وارانہ فسادات کرائے تھے، جس نے ایک طرف ۱۹۴۲ء سے آج تک تیس لاکھ سے زائد ارکان کے روہنگیا مسلمان کو ملک سے ہجرت کر کے دنیا کے کونے کونے میں مارے مارے

پھرنے پر مجبور کر دیا، تو دوسری طرف برمیوں نے رکھائنگ قومیت کو سرے سے ختم کر کے ان کو پوری طور پر برمیانے کی سازش تیز کر دی، ساتھ ہی ساتھ ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کی پالیسی کے تحت ارکان کو برما کا مستقل حصہ بنائے رکھنے کے پروگرام کو جاندار بنایا، برمیوں کی سازش اور پروپیگنڈوں کی وجہ سے یہاں کی قوتوں اور قوموں کے مابین اتحاد و یک جہتی، ہم آہنگی اور مفاہمت کا سارا راستہ بند ہو گیا، اور یہاں کے باشندوں میں پائی جانے والی امن وآشتی جیسی صفات ہمیشہ کے لئے مفقود ہو چکیں، یوں باوجودیکہ ارکان کی آزادی کے لئے بہت کوشش کی گئی لیکن ارکان آج تک آزاد نہیں ہو سکا، اور نہ ارکان کی قوم آزادی سے ہم کنار ہو سکی، اور یہاں کی قوموں اور نسلی گروہوں کی عدم مفاہمت اور فرقہ آرائی کا پورا پورا فائدہ اس ظالم برمی قوم کو پہنچتا رہا، اگر یہاں کی قوتوں اور نسلی گروہوں کے مابین وہی تاریخی اتحاد وطنی کے جذبات کو زندہ کیا جا سکتا تو ارکان کب کا آزاد ہو چکا ہوتا، اور یہاں کے تمام باشندے کب کے آزادی سے محظوظ ہو چکے ہوتے، سچ تو یہ ہے کہ اب بھی ار کان کی آزادی، پھر اس کی تعمیر وترقی، خوش حالی اور خوب صورتی اور یہاں کی قوموں اور نسلی گروہوں کی ہم آہنگی و یک جہتی ایک متحدہ معاہدے پر منحصر ہے، اس کے بغیر نہ ارکان آزاد ہو سکتا اور نہ یہاں کے باشندے آزادی سے ہم کنار ہو کر دنیا میں امن وسکون سے زندگی گزار سکتے۔

ارکان کی آزادی کی راہ پر خون بہایا گیا اور ضرور گیا، مگر گلشن ارکان کو جھلسا دینے والی خزاں کے خلاف بہار لانا ممکن نہ ہو سکا، اور آج بھی چند افراد اس کی آزادی کے لئے اپنی اپنی زندگیاں کھپار ہے ہیں، مگر میں بسا اوقات یہ کہتا رہتا ہوں کہ چند افراد کے یہ خون جگر کے آنسو (جسے ہم کبھی کبھار بہار کی شبنم کی آمد سے تعبیر کرتے ہیں) اتنے بڑے خزاں کے مارے گلشن کی آب یاری کے لئے کافی نہیں ہو سکتے، اس کی پوری پوری آبیاری کے لئے ارکان کی ساری قومیں اور تمام نسلی گروہوں کی اجتماعی جدوجہد ناگزیر ہے، آج ارکان کی بدترین صورت حال جو ہم اور سب کی نظروں کے سامنے ہے، اسے بدلنے اور صحیح معنی میں بدلنے کے لئے رنگ ونسل، دین ودھرم کی عصبیت اور تنگ نظری کی دیوار سے بلند ہو کر ایک اجتماعی کوشش کی ضرورت ہے۔

ادھر ۱۹۹۹ء میں اس سلسلہ کا ایک دریچہ کھل بھی گیا تھا کہ ارکان کی اس بدترین صورت حال کے پیش

نظر ایک طرف ارکانی مسلمانوں کی سابقہ تمام متحرک سیاسی اور انقلابی تنظیموں کے ارباب بست وکشاد نے قرآن حکیم کے حکم کے مطابق "واعتصمو بحبل الله جميعا و لا تفرقوا" کو سامنے رکھتے ہوئے اپنی اپنی جماعتوں کو کالعدم قرار دے کر ارکان روہنگیا نیشنل آرگنائزیشن (ARNO) کی بنیاد رکھی تھی، اور اس تنظیم نے پوری روہنگیا قوم کی اس واحد نمائندہ اور قانونی تنظیم بن کر قومی فریضہ انجام دے رہا تھا۔ پھر دوسری طرف ہمارے برادرانِ وطن رکھائنگ اور دوسری نسلی گروہوں کی تمام معروف سیاسی اور انقلابی پارٹیوں نے بھی اپنی اپنی سابقہ پارٹیوں کو کالعدم قرار دے کر نیشنل یونائی ٹڈ پارٹی آف ارکان (NUPA) کے نام سے ایک تنظیم کی بنیاد ڈالی، پھر مذکورہ دونوں متحدہ جماعتوں نے یعنی ارکان روہنگیا نیشنل آرگنائزیشن (ARNO) اور نیشنل یونائی ٹڈ پارٹی آف ارکان (NUPA) نے آپس کے تمام مسائل کو پوری سنجیدگی اور آگہی، پوری دانش مندی اور باریک بینی کے ساتھ تصفیہ اور ارکان کے قومی وسیاسی مسائل کو ایک ہی خیال سے سوچتے پھر دفاعی اور بین الاقوامی جیسے تمام مسائل کو ایک ہی سطح اور ایک ہی نقطۂ نظر سے سمجھتے ہوئے ۱۶ /ستمبر ۲۰۰۰ء کو ایک سیاسی معاہدہ (الائنس) کر چکا تھا، بعد ازاں ۱۸ /ستمبر ۲۰۰۰ء کو ایک متحدہ اعلان منتظر عام پر آچکا تھا، جس سے صاف ظاہر ہوا کہ ارکان اور یہاں کے تمام مسائل کو حل کرنے کے حوالے سے ایک دریچہ کھلنے لگا ہے۔

عقیدت کے گل دستے

تاریخ شاہد ہے کہ ارکان کے روہنگیا ایک باوقار، معزز اور زندہ دل قوم ہے، ماضی میں اس قوم کے اسلاف نے سرزمین ارکان میں اپنے دین وایمان، عقیدہ ومسلک کی اشاعت وتبلیغ کے لئے قندیل روحانی لئے آئے تھے، جنہوں نے وہاں وہی کچھ کیا جسے اسلام نے ان سے چاہا اور مطالبہ کیا تھا، جنہوں نے یہاں کی غیر مہذب اجڈ اور وحشی اقوام کو اسلام کی روشنی، ثقافت وتہذیب سے روشناس کرایا، اور ایک دنیا کی دنیا کو ظلمت واندھیاری کے طوفان سے نکال کر روشنی اور ہدایت کی طرف لایا تھا، اسلام کے فیضان انسانیت کی وجہ سے یہاں کی اجڈ اور گھنوار اقوام کو وہ زندگی ملی، جس کے حصول کے بعد انسان تمام مخلوقات خداوندی سے بلند وبرتر ہو کر اعلی سے اعلی مقام اور بلند سے بلندتر مراتب پر فائز ہو جاتا ہے۔

ان کی دعوت وعزیمت کے واقعات کہانیوں، داستانوں اور کارناموں کی دھندلی سی جھلکیاں اور نشانیاں جو تاریخ میں ملتی ہیں، ان سے ہم یہ اندازہ کئے بغیر نہیں رہ سکتے ہیں کہ انہوں نے اشاعت دین اور تبلیغ ملت کے لئے زمانے کی چاہت وطلب کے مطابق مختلف حکمت عملیوں کو اپنایا، ہم ان میں سے بہتوں کو ایسے بھی پاتے ہیں کہ انہوں نے اس راہ عزیمت ودعوت میں اپنی اخلاقی رعنائیوں اور خوبیوں سے لوگوں کو خوگر اور متوالے بنا کر اسلام کے حلقہ میں داخل کر لیا تھا، ان میں سے بہتوں عبقریوں کو ایسے بھی پاتے ہیں کہ جنہوں نے اپنے تطبیقی فیصلوں سے جہاد فی سبیل اللہ کا پرچم ہاتھ لیا اور تیغ وتفنگ، تلواروں اور نیزوں کے سائے تلے اسلام اور مسلمانوں کی آبرو اور ناموس بچائی، پھر یہاں اسلام کا سچا نظام، عدل، انصاف، مساوات وبھائیچارگی کے ذریعے امن وآشتی، طمانیت اور سلامتی کی فضا قائم کی تھی۔

ہم اپنے بزرگوں اور اسلاف میں عالی مشرب درویش وصوفیاء بلند ہمت علماء وصلحاء، روشن خیال شعراء و ادباء، عالی تمام مصنفین ومولفین، دل دردمند وفکر ارجمند کے مالک دانشوران وسیاست دان، جاں سوز

و دل گداز رہنمایان، اور کوہِ ہمالہ سے ٹکر لینے والے قائدین وشہواران عرض سب کچھ پاتے ہیں ، جنھوں نے اسلام کی چاہت طلب کے علاوہ زمانے کی فضا اور ماحول کو خوب خوب سمجھا اور اپنے اپنے عہد اور زمانے میں اپنی اپنی صلاحیات اور استعداد کے مطابق ذمے داریاں نبھائیں، اور ملک وقوم کی خدمات انجام دیں، پہلی صدی ہجری سے لے کر آج تک ہم اپنے اسلاف اور بزرگوں کو اسلام اور انسانیت، ملک وقوم کی خدمات انجام دیتے ہوئے پاتے ہیں، ۱۹۴۸ء سے لے کر آج تک عزیمت و دعوت کا روشن سلسلہ جو ہم دیکھ پاتے ہیں، یہ ہمارے ان بزرگوں کی خدمات کی ایک روشن کڑی ہے، ماضی میں زمانے کی پر کٹھن ڈھلوانوں اور پگڈنڈیوں سے چکر کاٹتے ہوئے ہمارے بزرگوں نے اس روشن اور تابناک سلسلہ کو باقی رکھنے کی کوشش کی اور اب بھی یہ سلسلہ الحمدللہ تعالی باقی ہے۔

بظاہر یہ ہے کہ ۱۹۴۲ء کو ہمارے بزرگوں نے ایک مرتبہ پھر سے علم جہاد اس سرزمین میں بلند کیا تھا، اسلام کی بقاء اور مسلمانوں کی عزت وناموس کی حفاظت کی خاطر بہتوں نے اپنی اپنی جان کے نذرانے پیش کئے، پھر ۱۹۴۰ء کی آخری دہائی میں ارکانی مسلمانوں کی جان وجگر اور سوز ودھڑکن شہید وطن وملت حضرت جعفر حسین قوال نے ہمارے بزرگوں کے اس جہادی سلسلہ کو نکھارا اور سنوارا، پھر ان کے متبعین اور رفقائے کار نے اس میں آنے والی بہار کی شبنم سے آبیاری کی تھی، تو ان پر ان کی روشن خدمات کے صلے میں عقیدت ومحبت کے جتنے بھی گل دستے نچھاور کئے جائیں تو بھی کم ہیں، ہم ان کے عقیدے و مسلک، فکر وجذبات ، اولوالعزمی و عالی مشربی، قربانی و جان نثاری ، اخوت ومحبت ، ایثار وہمدردی، عبادت وخدا ترسی، صبر وحق پسندی، فدائیت وللّٰہیت، غرض ان کے انسانی اور اخلاقی اوصاف کو موجودہ نسل کے لئے نشانِ راہ اور آنے والی نسل کے لئے معالم الطریق سمجھتے ہیں۔

۱۹۴۸ء سے لے کر آج تک اس راہ عزیمت ودعوت میں ہزاروں فدایان ملت نے اپنے بزرگوں کی طرح جان کے نذرانے پیش کئے ، جن کی تفصیلات کے لئے ایک اچھے خاصے موسوعہ کی ضرورت ہوگی ، دراصل سرزمین ارکان کی تحریک آزادی کے سائے تلے خدمات نباہنے والے تمام قائدین ومجاہدین زندہ دل اور اپنے مستقبل سے باخبر اور ملک وقوم کی راہ میں اپنی زندگیوں کو کھپا دینے والے تھے ، انہوں نے ملت اسلامیہ کے بزرگوں کے کارناموں سے درس لیتے ہوئے

دعوت و جہاد کو شیوۂ حیات بنالیا تھا، انہوں نے غلامی کی زنجیروں کو کاٹ کر آزادی اور حریت کے لئے مرمٹنے کو زندگی کا مقصد بنا رکھا تھا، انہوں نے اس راہ عزیمت میں طاغوت کی غلامی کے بجائے خون کے سمندر پار کرنا مناسب سمجھ لیا تھا، غرض انہوں نے طوق غلامی کو کبھی بھی قبول نہیں کیا، اسلام کی بقا اور اپنی عزت کی حفاظت کے لئے دل کو دہلا دینے والے طوفانوں سے مقابلہ کیا تھا۔

مگر افسوس ہے کہ ہم میں سے بعض نادان افراد آج اپنے بزرگوں اور اسلاف کی دل سوزی اور جان گدازی سے سرمو انحراف کرتے جارہے ہیں، اور چند ایسے بھی نکل پڑے ہیں کہ جنہیں نہ صرف جہاد و کفاح سے نفرت ہے بلکہ غلامی سے دل چسپی اور دل لگی اور طالب اور طلب آزادی سے چھیڑ بھی ہے، انہیں مایوسی اور اداسی کے بھوت نے نوچ کر کھا چکا ہے، انہوں نے اسلام اور قوم کی چاہت و طلب کو جھانسہ دے کر طاغوت اور دشمنوں کے ساتھ ساز باز کرلیا ہے۔

دراصل بات یہی ہے کہ ایک قوم کی نحوست کو دو چار افراد کی کوششیں دور نہیں کرسکتیں ، اس کے لئے پوری قوم کو پوری تیاری ، پوری دلسوزی اور پوری مستعدی سے ایک اجتماعی انداز میں کوشش کرنی ہوتی ہے، ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ ایک قوم کی سب سے بڑی خطا بلکہ سب سے بڑا گناہ یہی ہوتا ہے کہ وہ ظلم واستبداد اور جبر وتشدد کے خلاف لڑنے اور حق کی آواز بلند کرنے سے دست بردار ہوجائے ، اور یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ چند افراد کے خون کے آنسو ایک پوری قوم کی اجتماعی مظلومیت کا مقابل نہیں ہوسکتے ، بلکہ مقابلہ کے لئے پوری قوم کو اجتماعی کوشش اور پیہم جدوجہد کرنی ہوتی ہے، آج ہماری قومی جاں فشانی اور قربانی کے بجھتے ہوئے چراغ کو شعلوں اور آتش فشانوں سے ٹکر لینے والے جان سوز پروانوں کے خون جگر کی ضرورت ہے، جس کے بغیر خزاں کا مارا ہوا یہ گلستان پھر سے باد بہار کی رعنائیوں سے آشنا نہیں ہوسکتا، میں نے یہ بات بار بار دہرائی ہے کہ:

''ہمارے پچھلے بزرگوں کی خدمات اور اسلاف کے روشن کارناموں کے حوالے سے میرا اتنا یقین ہے کہ ہماری ملی اور قومی زندگی میں جتنے بھی دھارے بہہ گئے، اور آج بھی ایک حیرت انگیز طریقے سے بہہ رہے ہیں، سیاست وقیادت کے جتنے چشمے ابل پڑے اور میدان کارزار میں جتنی پاک روحوں کے عزائم بیدار، جوان اور

دار ورسن کی کشمکش وکشاکش سے غیر متزلزل ہیں، یہ بس ان بزرگوں کی قربانی، جان سوزی، اخلاص وللّٰہیت، فدائیت اور جان فروشی کا فیضان ہیں، غیرت مندوں اور غازیوں کے روشن کارناموں اور خدمات اور ان کے اثرات ونتائج کا صحیح صحیح اندازہ مقبوضات کی وسعت، مالِ غنیمت کی فراوانی، جشن وجلوس کا ہما ہمی، عیش وعشرت کا طرب ونشاط، تمغوں اور تاجوں کی چمک دمک، تیر وتفنگ، نیزوں اور تلواروں کی جھنکار سے نہیں کیا جاسکتا، بلکہ اس کا صحیح صحیح اندازہ ٹوٹی ہوئی تلواروں، بکھرے پڑے خیموں، دیکتی ہوئی روحوں، دمکتے ہوئے چہروں اور خون کے بہتے ہوئے دریاؤں سے کیا جاسکتا ہے، ظالم کے ظلم وجبر استبداد وستم جتنے بھی تپاں کیوں نہ ہوں، مگر ہمیں یقین ہے کہ ہر طلوع کے پردے میں راز ہائے زوال بھی مضمر ہوتے ہیں، دنیا میں آج تک صبح کو بلند ہونے والا تپاں سورج اپنے غروب کے دھیما پن سے عہدہ برآ نہیں ہوسکا ہے''۔

ہم اپنی تاریخ اور اپنے ماضی کے تمام بزرگوں کو جنہوں نے اپنے اپنے زمانے میں اس ملک وقوم کی خدمات نبھائیں، ان کے پاک قدموں پر عقیدت ومحبت کے گل دستے پیش کرتے ہیں، اور پیش کر پانے کو اپنی عزت بھی سمجھتے ہیں، اور اللہ تعالی کے حضور دعا گو ہیں کہ وہ اپنی خاص رحمت سے ان پاک روحوں کے مراتب بلند کرے، اور ہمیں اپنے ان بزرگوں کی خدمات کے سائے تلے جینے، انہیں یاد رکھنے، اور ان کی اتباع کرنے کی توفیق سے نوازے، آمین یارب العالمین۔

برما کے اعلان آزادی دراصل اعلان جنگ تھا

سرزمین ارکان قدیم زمانے میں روہانگ کے نام سے معروف تھی، جو ابتدائے تاریخ سے لے کر ۱۷۸۴ء تک دنیا کے نقشے میں ایک مستقل، آزاد اور خود مختار ریاست تھی، جس میں حکومت ارکانیوں کی تھی، جن کی علیحدہ مگر زندہ، باوقار ثقافت اور تہذیب رہی تھی، اور یہاں کے اصلی باشندے روہنگیا (مسلمان) اور رکھائنگ (بودھسٹ) کے علاوہ دیگر تمام قومیں اور نسلی گروہیں اتحاد واتفاق کے ساتھ مذہبی اور نسلی امتیازات سے بلند وبالاتر ہوکر نہایت پرسکون اور پرامن زندگی گزارتی تھیں، ان قوموں اور نسلی گروہوں کے درمیان صلح وآشتی، اخوت وبھائی چارگی جیسے بلند اخلاق وصفات موجود تھیں، اور ہر ایک گروہ دوسرے گروہوں کے دکھ درد کلفت ومصیبت، خوشی اور راحت میں شریک ہوا کرتا تھا، ان قوموں نے ہر زمانے میں اپنی اپنی منفرد تہذیب وثقافت، رسم ورواج کی حفاظت کی تھی، سیاسی وعسکری، معاشی اور اقتصادی معاملات کو مل جل کر فیصلہ کیا تھا۔

پھر بھارت سے آئے ہوئے ہندو اور بدھ دھرم کے لوگوں نے جس طرح بدھ ازم اور ہندو ازم کی اشاعت کی تھی، ٹھیک اسی طرح عالم اسلام وعالم عرب سے آئے ہوئے مبلغین مسلمانوں نے بھی اسلام اور اسلامی ثقافت وتہذیب کی خوب خوب اشاعت کی تھی، بین شہادت اور باوزن دستاویزات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سرزمین ارکان کے ساتھ مسلم اور اسلامی مملکتوں کا رابطہ ہزار سالہ قدیمی ہے۔

ماضی میں ارکان میں ہندو مملکت تھی، ہندومت کے پیرو چندرا خاندان نے ۷۸۸ء سے لے کر ۹۵۷ء تک مسلسل حکومت کی تھی، جس کا دار الحکومت ویسالی تھا، جو دریائے لیمرو کے پچاس میل دور واقع تھا، حکومت ویسالی کے حکمران اور رعایا دونوں ہندوستانی اور بنگالی تھے، ظہور اسلام سے قبل عرب تجار عرب مملکتوں سے کوسوں دور چین تک کے اگلے سمندری سفر پر ارکان وارد ہوا کرتے تھے، ظہور اسلام کے بعد عرب تجار اپنی تجارت کے ساتھ ساتھ دین کی اشاعت اور تبلیغ بھی کیا کرتے تھے، جس کی وجہ سے عرب سیاحوں، تاجروں اور مبلغوں کے ہاتھوں مسلسل انداز میں

اسلام کی اشاعت ہوگئی، اس زمانے سے لے کر اس علاقے میں اسلام کی اشاعت کا سلسلہ جاری رہا، تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ اشاعت اسلام کے چند سال بعد دیگر مذاہب کی بہ نسبت اسلام کا پوزیشن مستحکم رہا تھا۔

آٹھویں صدی عیسوی میں بھارت کے شمالی مشرق میں واقع مگدھ میں ہندومت کے پیروں کے ہاتھوں مہایانا بدھ مت کے پیرو اس بری طرح ستائے گئے کہ ان کا جینا وہاں دوبھر ہوگیا تھا، حتی کہ وہ لوگ وہاں سے بھاگنے پر مجبور ہوگئے تھے، جس کے نتیجے میں بدھوں کے ایک گروہ نے بھاگ کر ارکان میں پناہ لی تھی۔

۹۵۰ء میں ارکان منگولوں کے حملے کا شکار ہوا، جس کے نتیجے میں چندرا خاندان کے دور حکومت کے اختتام کی شکل میں یہاں ہندو حکومت کی مکمل استیصال ہوگئی، تاریخی دستاویزات سے معلوم ہوتا ہے کہ باوجودیکہ منگولوں نے ارکانی حکومت پر مکمل قبضہ کرلیا تھا، جس کے بعد یہاں کسی خاندان کی شہنشاہیت کبھی بھی مستحکم نہ ہو پائی تھی، ہندو خاندان کی حکومت کی استیصال کے بعد حملہ آور منگول لوگ ارکان کے باشندے روہنگیا اور رکھائنگ میں ضم ہوگئے، کہا جاتا ہے کہ بعد کی پانچ صدیوں یعنی ۹۵۷ء سے لے کر ۱۴۳۰ء تک کی درمیانی مدت میں تبتی بدھ برمن باشندے یہاں وارد ہوئے تھے، تاریخ اس درمیانی مدت کو تاریخ ارکان کا ایک تاریک دور کہتی ہے، اس درمیانی مدت کی کسی بھی تاریخی دستاویزات ومعلومات فراہم نہیں ہوسکیں، لیکن اگلی صدی کی ابتدائی دہائی میں تب ارکان میں مسلمانوں کی سیاسی اور معاشرتی اثرات بڑے پیمانے پر بڑھنے لگے تھے، جب ارکان نے اپنے مغرب کے مسلم بنگال کی طرف توجہ مبذول کی تو ارکان میں ایک روشن ثقافتی دور کا آغاز ہوگیا تھا، جس کی وجہ سے ظاہر ہے کہ ماضی میں روہنگیا مسلمان ارکان کا ایک مستقل گروہ بن گئے تھے، یعنی ۱۴۳۰ء کو جب ارکان میں مروکو دور حکومت کا آغاز ہوا تو روہنگیا مسلمان ارکان کے ایک قابل قدر سیاسی قوت میں تبدیل ہوگئے تھے۔

۱۷۸۴ء کو برمی غاصب راجا بدھو پھیا کے ارکان پر قبضہ تک دہلی کے مغل شہنشاہیت کے طرز اسلوب پر ارکان کے نظام سلطنت چلتا تھا، اور روہنگیا مسلمان ہی اسی نظام سلطنت اور انتظامیہ کے رکھوالے اور مالک رہے تھے، بعد میں دلال اور نمک حرام گاتھاندی کی قیادت میں رکھائنگ کے ایک گروہ نے برما جاکر برمی راجا بدھو پھیا کو ارکان پر حملہ کی دعوت دی تو ۱۷۸۴ء کو بدھو پھیا نے ارکان پر مکمل قبضہ کرلیا، تو ظاہر ہے کہ ارکان کا میر جعفر کس قوم سے نکلا تھا؟ مسلمانوں نے ارکان کے ساتھ کبھی بھی بے

ایمانی، دغا بازی، مکاری اور نمک حرامی نہیں کی ہے، تاریخ شاہد ہے کہ جب جب ارکان پر کوئی مصیبت آئی تو روہنگیا مسلمانوں نے سب سے پہلے اس کے مداوا کے لئے کوشش کی تھی، مسلمانوں نے کبھی بھی کسی غاصب کا ساتھ نہیں دیا تھا، صرف یہی نہیں بلکہ ہر زمانے میں ارکانی مسلمانوں نے اپنے وطن کو غاصبوں کے پنجے سے آزاد کرنے کے لئے خون کے سمندر پار کرنے کی راہ لی تھی۔

۱۴۳۰ء میں ارکان کا راجا سلیمان شاہ (نرمیخلا) غوری سلطان ناصر الدین شاہ کے معاون جلال الدین محمد شاہ کے تعاون سے مروہانگ یعنی مروکو سلطنت کی بنیاد رکھی، ۱۴۰۴ء کو برمی راجا نے ارکان پر قبضہ کیا تو ارکانی راجا نرمیخلا بھاگ کر اس وقت کے بنگال غور میں پناہ لی تھی، جہاں اس نے چوبیس سال گزارے، جہاں اس نے تاریخ، سیاسیات، سماجیات اور اسلامیات پر خاصے عبور حاصل کرلیا تھا، بعد ازاں اس نے غوری سلطان کے تعاون سے ۱۴۳۰ء کو ارکان کو پھر فتح کیا تھا، اور مسلمان ہوکر محمد سلیمان شاہ کے نام اختیار کر کے مروکو سلطنت کی بنیاد رکھی تھی، ان کے قابل جانشین زبوک شاہ (۱۴۳۰ء۔ ۱۵۵۳ء) نے دکھن تناسرم کو بھی فتح کر کے سلطنت ارکان میں ضم کرلیا تھا، اور اور ارکانی راجا سلیم شاہ (۱۵۹۳ء۔ ۱۶۱۲ء) نے مملکت ارکان کو ایک عظیم الشان سلطنت میں تبدیل کردیا تھا، اس زمانے میں سلطنت ارکان ایک خاصی مسلم سلطنت میں تبدیل ہوگئی تھی، اور اسلامی تہذیب وتمدن، ثقافت وادب یہاں کی سب سے بڑی تہذیب وتمدن، ثقافت وادب بن گیا تھا، ارکان کے راج سبھا کو غوری راج سبھا کے طرز پر سجایا گیا تھا، حتی کہ راجا نے بادشاہ کا خطاب اختیار کیا تھا، پھر فارسی زبان وادب یہاں کی سرکاری زبان وادب قرار پایا تھا، جو ۱۸۴۵ء تک مسلسل چالو تھا، سکہ کے ایک پیٹ پر عربی رسم الخط میں کلمہ طیبہ جبکہ دوسرے پیٹ پر وقت کے بادشاہ کا نام اور کسی کسی سکے میں اقیم الدین چسپاں ہوتا تھا۔ ارکان کے مسلمان خواتین کے علاوہ غیر مسلم خواتین بھی پورے اسلامی پردے سے محظوظ ہوتی تھیں، مروکو سلطنت کے ہر ایک راجگان دو دو نام اختیار کرتے تھے، ایک اسلامی نام اور دوسرا مگھی نام، جس طرح انڈونیشیا اور ملائشیا کے حکمران اختیار کرتے تھے، مروکو راجگان شاہ، راجا، راجا جی جیسے سلطانی خطاب اختیار کرتے تھے، اس دور کے اُن سلطانی خطابات میں ہندوستانی سلطانوں کے خطابات کا رنگ نظر آتا ہے۔

پندرھویں صدی عیسوی سے لے کر اٹھارھویں صدی عیسوی کی اس درمیانی مدت میں بدھ مت کے پیرو ایک بڑے پیمانے پر اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے تھے، یہاں ایک بات جو قابل ذکر ہے وہ یہ ہے کہ سترھویں صدی عیسوی میں بہتوں ڈچ لوگوں نے یہاں کی مقامی لڑکیوں سے شادیاں کی تھیں، انہیں اپنی بیویاں اور اولاد کو یہاں چھوڑ جانا بڑا گراں گزرا تھا، تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے بطن سے پیدا ہونے والی اولاد مسلمان ہو گئی تھی، یاد رہے کہ ۱۶۷۰ء تک ارکان میں وارد ہونے والے کسی بھی پردیسی کے لئے یہ اجازت نہیں تھی کہ ان کی مقامی بیویوں اور اولاد کو ارکان کے باہر لے جایا جائے، سترھویں صدی میں ارکان کے دارالحکومت میں رہنے والے ڈچ تاجروں کی دستاویزات کے مطابق کہا جا سکتا ہے کہ وہ لوگ ارکان سے کوچ کرتے وقت اپنی بیویوں اور اولاد کو چوری چھپے اس لئے لے جانا چاہتے تھے کہ ان کو یقین تھا کہ اگر انہیں یہاں چھوڑ چلا جائے تو وہ ضرور مسلمان ہو جائیں گی، اس لئے وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی بیویاں اور اولاد ارکان میں رہ جائیں۔

ارکان میں مسلمانوں کا حوصلہ اور اثر ورسوخ اس وقت اور بھی زیادہ ہو گیا، جب مغل شہزادہ ۱۶۶۰ء کو ارکان میں وارد ہوا تھا، شہزادہ شجاع تو قتل ہوا، مگر اس کے بچے کچھے لوگ اور بعض اقرباء کو ارکانی بادشا نے قومی افواج میں بھرتی کر لیا تھا، اور وقت کے ساتھ ساتھ ارکان میں مسلمانوں کے تناسب ایسے بڑھے کہ ایک زمانہ ایسا بھی آ گیا کہ ارکان میں مسلمانوں کی کھلی اکثریت ہو چکی تھی، اور ۱۹۴۲ء تک یہاں روہنگیا مسلمانوں کی یہی حیثیت بحال رہی تھی۔

یاد رہے کہ ساحلی علاقہ جات میں پائے جانے والے ارکان کے بہادر اور جفاکش مسلم قوم نے ماضی کی کئی صدیوں میں چنداں خارجی حملوں کا مقابلہ کیا تھا، ۱۷۸۴ء میں برمی راجا بدھو پھیا نے ارکان پر حملہ کیا تو اس کا پالا سب سے پہلے ان مسلمانوں سے پڑا تھا، جنگ میں ہار جیت کا فیصلہ تو ایک عجیب و غریب حیثیت سے ہوتا ہے، اس بار یہاں برمیوں کی جیت ہوئی اور ارکانیوں کی ہار، حتی کہ برمی راجا نے ارکان پر مکمل قبضہ کر کے اگلے چالیس سالوں کے لئے یہاں ایک بربر نظام چالو کر دیا تھا، بدھو پھیا کے ہاتھوں ارکانی سلطنت کا زوال دیگر ارکانی قوموں اور نسلی گروہوں کے مقابلے میں مسلمانوں کے لئے زیادہ بھاری ہوا، دراصل ارکانی مسلمانوں کی مصیبت کا دور یہاں سے شروع ہوا، جس سے گلو

خلاصی آج تک ممکن نہیں ہو سکی، برمی غاصبوں نے یہاں داخل ہو کر اسلام کی تمام روایات اور پرانی نشانیوں کو ایک ایک کر کے مٹانا شروع کیا تھا، جس کا سلسلہ آج تک بدستور جاری ہے، اس سلسلے میں یہ بات نہ کہی جائے تو شاید حق تلفی ہو گی کہ برمن لوگ اتنے غیر مہذب، بربر اور وحشی ہیں کہ خود ان کے مذہب کے لوگوں کی پرانی نشانیوں کو انہوں نے مسمار کرنا شروع کر دیا تھا حتی کہ ارکانی بدھوں کے مقدس ہیکل ''مہامنی'' کو مقامی بدھوں کی سخت ناراضگی کے باوجود منڈلائے لے جایا گیا، بڑے پیمانے پر انہوں نے یہاں کے مسلمانوں اور بعض مزاحمتی بدھوں کو قتل کیا، ہزاروں علماء، صلحاء، اکابرین پنڈتوں، گیانیوں اور دیگر فوجی حکاموں کو حراست میں لے کر منڈلائے لے جایا گیا، تقریباً دو لاکھ ارکانی باشندے، جن کی اکثریت مسلمان تھی نے جان بچا کر حالیہ بنگلہ دیش کے معروف علاقہ چاٹگام میں پناہ لی، ارکان کا دارالحکومت مروہانگ جسے پتھری قلعہ بھی کہا جاتا ہے کو کھنڈرات میں تبدیل کر دیا گیا تھا، آدھونا، مانڈلائے اور وسطی برما کی جتنی مسلمان بستیاں آج دیکھنے میں آ رہی ہیں، یہ سب وہی مسلمان ہیں جنہیں برمی راجا نے ارکان سے پکڑ کر وہاں لے گیا تھا۔

تاریخ کا یہ ایک حسرتناک المیہ تھا کہ ارکان کی مشرقی سرحد کے اس پار سے ایک نہایت داغ دار قوم نے یہاں آ کر اس پر قبضہ کر لیا تھا، باوجودیکہ اس وحشی، شرپسند اور غارت گر قوم کے حملوں اور بعد میں اس کے اس ناجائز قبضے کے خلاف یہاں کی اصلی قوموں اور نسلی گروہوں نے مشترکہ طور پر ایک خون آشام دفاعی انداز کی جنگ لڑی تھی، لیکن وہ اپنی ہزار کوششوں کے باوجود بظاہر ناکام رہے، ستم یہ ہے کہ اس ناجائز اور دل خراش قبضہ کے بعد غاصبوں نے یہاں کے باشندوں پر ایسے ایسے مظالم ڈھائے جن کے تصور سے دل دہل جاتے اور آنکھیں اشک بار ہو جاتی ہیں۔

پھر ۱۸۲۴ء سے لے کر ۱۹۴۸ء تک کی درمیانی مدت میں ارکان پر برطانوی سامراجیوں کا قبضہ رہا تھا، برطانوی سامراجی دور حکومت میں صوبہ ارکان کی کلیدی عہدوں اور ذمے داریوں پر انگریزوں کے بعد برمی متعصب اور شرپسند عناصر ہی فائز رہے تھے، اسی لئے یہاں ارکانیوں کو سیاسی و معاشی، اجتماعی اور ثقافتی اعتبار سے کچلنے اور ان کے بلند اور برتر عزائم پر پانی پھرنے میں برمی نسل پرست وحشیوں کو موقع مل گیا تھا، چنانچہ ہر موقع پر برمیوں نے ارکانیوں کو کچلنے میں کسی قسم کی کسر باقی نہیں رکھی تھی۔

برطانوی سامراجی دور حکومت کے اواخر میں برمیوں نے جب دیکھا کہ اب کی بار ارکانی باشندے اپنے وطن کی آزادی کے لئے جان کی بازی لگائیں گے، تو اس نے ارکان کی نسلی گروہوں کے مابین نسلی فسادات کی ہوائیں دیں، جس کے نتیجے میں یہاں کی دو بڑی نسلی گروہ روہنگیا اور رکائنگ کے درمیان زبردست خون آشام جنگ چھڑ گئی تھی، تو ظاہر ہے کہ ۱۹۴۲ء میں ہونے والے فسادات ان برمی اوباشوں اور شاطروں کی سازش کا نتیجہ تھے، جن کی فطرت میں سازش ہی سازش بھری ہوئی ہوتی ہے، اس خانہ جنگی میں روہنگیا مسلمان ایک لاکھ تک شہید کردیئے گئے، اور لاکھوں مسلمان بے گھر ہو چکے تھے، باوجودیکہ اس نسلی اور قومی فسادات میں روہنگیا مسلمانوں کا جانی اور مالی نقصان زیادہ ہوا تھا، مگر سب سے بڑے دکھ اور پریشان کی بات یہ ہوئی تھی کہ اس جنگ کے نتیجے میں مخصوص طور پر ان دو نسلی گروہوں کے درمیان پائے جانے والے اعتماد، صلح وآشتی، محبت اور وطنی بھائی چارگی کی صفات پارہ پارہ ہو کر رہ گئی تھیں، بالآخر برمی شرپسندوں کی اس خطرناک سازش نے ارکان کو اپنی آزادی سے محروم کر کے یہاں کی تمام قوموں اور نسلی گروہوں کو غلامی کی زنجیر میں جکڑ کر ہمیشہ کے لئے محرومی کے ایک دھکتی جہنم میں گرادیا۔

۱۹۴۲ء سے لے کر ۱۹۴۸ء تک کی اس درمیانی مدت میں ارکان کی نسلی گروہیں، خاص طور پر روہنگیا اور رکھائنگ میدان جنگ سے چور ہو کر دم واپسیں کی حالت میں تھیں، جس کے نتیجے میں سیاسی اور معاشی اعتبار سے دونوں گروہیں مفلوج ہو چکی تھیں، ان دونوں کی قوتیں ہر میدان میں جواب دے بیٹھی تھیں، جس کا فائدہ سراسر برمی غاصبوں کو ہوا تھا، جس کا انتظار مدتوں سے اُن کو تھا، ان دونوں نسلی گروہوں کے مضمحل حالات سے برمیوں نے زبردست فائدہ اٹھایا تھا، یوں ان کی سازش اور پروپیگنڈے کامیاب ہی کایاب ہو گئے تھے، انہوں نے مذکورہ درمیانی مدت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اور یہاں کی تمام قوموں کو میدان میں پیچھے چھوڑتے ہوئے ارکان کو غلام بنانے کی سازش مکمل کر لی تھی، اور ساتھ ہی ساتھ برطانوی سامراجیوں کو یہاں کی نسلی گروہوں اور برمیوں کے درمیان ہمیشہ کے لئے ایک جنگ کی فضا قائم رکھنی تھی، تو ان جھگوڑوں نے ۱۹۴۸ء کی جنوری میں برما کی آزادی کے ساتھ ارکان کو بھی برما کا ایک مستقل حصہ ہونے کا اعلان کر دیا۔

یہ کس سازش کا نتیجہ ہے؟

برما کے غاصب اور شرپسند لیڈران انیسویں صدی کے آغاز سے ارکان سمیت کل برما کی آزادی کا خواب دیکھ رہا تھا، انہوں نے ارکان کو غصب کرنے کے لئے چالوں پر چالیں، سازشوں پر سازشیں اور پروپیگنڈوں پر پروپیگنڈے کئے تھے، اور برطانوی جھگوڑوں سے مل کر وہ اپنی سازش میں تب کامیاب ہوئے جب ۱۹۴۸ء میں برما کی آزادی کا اعلان کر دیا گیا۔

مگر برمی غاصب شرپسندوں کی اس خطرناک سازش کو ارکان کے چند دانشوران وعلماء جو دور اندیش بھی تھے اور ہشیار بھی، دل دردمند بھی تھے اور فکر ارجمند بھی نے خوب خوب تاڑ لیا تھا، تاہم ارکان کی یہ بدقسمتی تھی کہ وہ ابھی اس خطرناک سازش کے خلاف جنگ لڑنے کے لئے کمر ہمت باندھ رہے تھے کہ برمیوں نے ارکان کو غلام بنانے کی سازش مکمل کر لی تھی، ظاہر ہے کہ ان دور اندیش اور دردمندوں کے سرخیل شہید ملت ووطن حضرت محمد جعفر حسین قوال تھے۔

شہید ملک وملت نے اپنے وطن اور قوم کو غلامی کی جہنم میں گرتے ہوئے دیکھا تو اپنے رفقائے کار جو وہ مدتوں سے جمع کر رہے تھے سے بیعت لی، کہ وطن کی راہ میں اپنے قیمتی خون کے آخری قطرہ تک قربان کر دیں گے، چنانچہ وہ اس خطرناک غاصب دشمن کے خلاف برما کے اعلان آزادی سے قبل میدان جہاد میں کھود پڑا، یاد رہے کہ اعلان آزادی برما سے قبل ارکان کے ہشیار مسلمانوں نے دنیا کی دیگر زندہ قوموں کی طرح برطانیہ سے اپنے وطن کی آزادی کا مطالبہ کیا تھا، اور شہید ملت وقوم اور ان کی جماعت کا عملی اقدام گویا اتمام حجت تھا، کہا جاتا ہے کہ حکومتِ برطانیہ بھی ارکان کی آزادی پر تھوڑی بہت سوچ بچار کر رہی تھی، مگر برمی شاطروں نے ارکانیوں کا مطالبہ اور برطانیہ کے اس غور وفکر پر پانی پھر دیا تھا۔

اب جب برما کی آزادی کا اعلان ہو گیا تو ارکانیوں نے اپنے پرامن اور مجاہدین نے اپنے عملی اقدام کے ذریعے اپنے دیرینہ مطالبہ کو برمیوں کے سامنے پھر دہرایا تھا، لیکن ان کے اس مطالبے سے

برمیوں کے کان میں جوں تک نہیں رینگی ، اور یہاں کے باشندوں کے خلاف رنگا رنگ کے بہانے تراشتے ہوئے ان کوسرے سے ختم کردینے کی راہ تلاش کر لی گئی تھی ، چنانچہ ارکانیوں کے جائز مطالبہ کے خلاف پروپیگنڈے اور سازش کرتے ہوئے ۱۰ /مئی/ ۱۹۴۸ء کو شمالی مغربی ارکان میں فوج کشی کی گئی ، ویسے پندو پرانگ (بوسیدنگ) کے مقام پر برمی غاصبوں اور مجاہدین کے درمیان گھمسان کی لڑائی ہوئی ، باوجودیکہ اس معرکۂ کرب وبلا میں غاصبوں کو زبردست ہزیمت کا منہ دیکھنا پڑا ،لیکن اس واقعہ کے بعد ارکانیوں نے سمجھ لیا کہ برمی غاصب حکومت برما ارکان کو ہمیشہ کے لئے غلام بنانے کا عزم کر چکی ہے، چنانچہ مجاہدین نے اپنے دین و وطن کی آزادی کی خاطر ایک سخت ترین معرکہ کی تیاری کو ضروری سمجھا ، اسی لئے انہوں نے اپنی قوم اور ممکنہ قومی وسائل کو منظم ومرتب کرنے کی تگ و دو میں دن رات کو ایک کردیا تھا ، ویسے برما کے اعلان آزادی کے پہلے انہوں نے ۳۰ / اگست / ۱۹۴۸ء کو ایک کمیٹی کی تشکیل موضع دابری چونگ (بوسیدنگ) میں دی تھی ، پھر انہوں نے ایک باقاعدہ اور منظم جماعت کی تشکیل کو ناگزیر سمجھتے ہوئے ۱۹ / جولائی / ۱۹۴۸ء کو فقیرہ بازار کے مقام پر ایک منظم انقلابی جماعت ''جہاد کونسل'' کے نام سے تشکیل دی ، جس کے بعد مجاہدین نے شمالی مغربی ارکان کے تقریبا تمام بالائی علاقے کو اپنے قبضہ میں لا کر جہاد کا اعلان کر دیا تھا۔

مجاہدین کے اس کھلے اعلان کے بعد برمی بھیڑیوں نے نومبر ۱۹۴۸ء کو مجاہدین سمیت ارکانی باشندوں کے عزائم کو کچلنے کے لئے ایک اور فوج کشی ''میجر آپریشن'' کے نام سے کی ، اور جو سیدنگ میں مجاہدین کے کمانڈر انچیف جنرل عبد الشکور دابوی اور ان کے بعض ساتھیوں کے ساتھ خون آشام جنگ ہوگئی ، ۲۲ /نومبر/ ۱۹۴۸ء کو میدان جنگ بہت ہی گرم ہو گیا تھا ، مجاہدین جو پہلے سے اتنی بڑی جنگ کے لئے تیار نہ تھے ، ان کی محدود گولیاں ختم ہونے جارہی تھیں ، ایسی حالت میں یکا یک عقب سے مجاہدین پر حملہ ہو گیا ، جس میں سرزمین ارکان کے شیر پلنگ ، مرد میدان کارزار اپنی بہادری کا لوہا منوا رہا تھا ، اب دشمن نے گولیوں کی بارش کردی ، اور حالات نے پلٹا کھایا ، اب لال رومی ٹوپی والے جنرل عبد الشکور دابوی کے دائیں بازو پر گولی لگی ، دائیں ہاتھ گیا تو بائیں ہاتھ سے گولیاں چلاتے رہے ، اب گردن پر ایک گولی آ لگی تو ہتھیار اپنے ساتھی کرنل مستفیض الرحمن کا حوالہ کیا اور مجاہدین کو دل کھول کر راہ

خدا میں لڑنے اور جان کھپانے کا حکم دیا ، بالآخر ان کے پاک سینہ پر ایک گولی ایسی لگی کہ راہ بناتی ہوئی پیچھے سے نکل گئی ، یوں سرزمین کے شیر پلنگ ایک مدت تک کفار کے خلاف لڑتے اور دندناتے ہوئے ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے ، انا للہ وانا الیہ راجعون ۔

فروری/ ۱۹۵۰ء کو گوریلا جہاد کی حکمت عملی کے پیش نظر مجاہدین کی از سرنو ترتیب دی گئی ، یاد رہے کہ حضرت محمد جعفر حسین قوال اور شہید اعظم جنرل عبد الشکور دونوں باقاعدہ عسکری ترتیب کے ماہر تھے ، ان دونوں کے علاوہ بھی مجاہدین میں باقاعدہ فوجی تربیت یافتہ جنرلوں اور دیگر عسکری کارکنوں کی کمی نہ تھی ، کرنل رشید احمد بن مولانا ابو الخیر پوئمالوی ایک مشاق کرنل ہونے کے علاوہ فوجی ترتیب کے اعتبار سے ماہر استاد تھے ، جنہوں نے جہاد کونسل کی عسکری تربیت میں جان ڈالی تھی ، انہوں نے جہاد کونسل کی جنوبی مشرقی کڑی جو اس وقت محمد قاسم بن عطاء الدین (راجا) کی سرکردگی میں تھی کو عسکری اعتبار سے مرتب اور منظم کر دیا تھا ، غرض یہ ہے کہ جہاد کونسل شروع ہی سے عسکری اور فوجی اور سیاسی ڈسپلن کے اعتبار سے کسی قدر منظم اور باقاعدہ جماعت تھی ، جس کا اعتراف دوستوں اور اپنوں کو تھا ہی ، بلکہ دشمنوں نے بھی سینکڑوں مرتبہ اعتراف کیا تھا ، اگرچہ کچھ نادان ، خود غرض ، اپنے مستقبل سے اندھے اور بہرے لوگوں نے ہمارے ان بزرگوں اور اسلاف کو بدنام کرنے کی ناجائز اور ناکام کوشش کی ، لیکن ان کی یہ کوشش خود ان کی کور بینی ، نادانی اور اپنے اسلاف کے روشن اور بارآور کارناموں سے جاہل ہونے کی دلیل بن گئی ہے ۔

دوسری طرف ہمارے ان بزرگ مجاہدین کے تمام کارنامے اور ان کارناموں کی تاریخ جس طرح مرتب ہے ، اسی طرح روشن اور تاباں بھی ہے ، انہوں نے جو کچھ بھی کیا اور کر دکھایا ، یہ سب کچھ بارآور ، باثمر اور منظم ومرتب طور پر کیا ، جن کی تاریخ آج کسی قدر محفوظ بھی ہے اور واضح بھی ، انہوں نے نہ کسی کو سیاسی دھوکہ دیا اور نہ دھوکہ دینے کو پسند کیا ، انہوں نے جہاد فی سبیل اللہ میں جو کچھ بھی کیا ، وہ صرف اللہ تعالی کی رضا جوئی کے لئے کیا ، غرض جس طرح ان کی دوستی اللہ تعالے کے لئے تھی ، ان کی دشمنی بھی صرف رب کبریاء کی خوش نودی کے لئے تھی ، جس پر کسی قسم کے شک کرنے اور کسی کو ان کے حالات اور کارناموں کو مشکوک بنانے کی سرے سے گنجائش نہیں ہے ، پھر وہ آدمی جسے اپنے آباء واجداد سے

ورثے میں شجاعت، امانت، اطاعت، بلند حوصلگی اور روشن ضمیری جیسی صفات ملی ہوں، اور شریف بھی ہو اور شرافت ونجابت کے رکھوالے بھی، اپنے ماضی کی یاد اور اپنے مستقبل کا احساس بھی ہو، وہ آدمی اپنے بزرگوں کے روشن کارناموں اور خدمات کو اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتا، اپنے اسلاف کو سب و شتم اور گالم گلوچ کرنا اور ان کی خدمات کے اعتراف کرنے کے بجائے ان پر بے لگام ہو کر سب وشتم کرنا ایک شریف النسل آدمی کا کام نہیں ہوسکتا:

باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو
پھر پسر قابل میراث پدر کیوں کر ہو

پھر ۱۱/ اکتوبر/ ۱۹۵۰ء کو قائد تحریک محمد جعفر حسین قوال کی شہادت خود روہنگیا مسلمانوں کے لئے ایک جانکسل المیہ تھا، اس واقعہ کے بعد مجاہدین کی ازسرنو ترتیب دی گئی تھی، اور جنوری/ ۱۹۵۱ء کو سرپرستوں کی ایک مجلس کے علاوہ کونسل کے ایوان بالا اور ایوان زیرین کے انتخابات مکمل کر لئے گئے تھے، پھر لیڈروں نے مجاہدین کو اس انداز سے ترتیب دیا کہ جسے دیکھ کر دشمن حیران ہو گیا تھا۔

مئی، جون اور جولائی/ ۱۹۵۱ء کے یہ تین مہینے ایسے گزرے کہ جہاد کونسل نے سیف وسنان اور قلم و لسان سے اپنے مطالبہ مسلم اسٹیٹ کو دہرایا، اور اپنے بامقصد اور جائز نصب العین اور مطالبات سے عوام اور حکومت کو مطلع اور باخبر کیا تھا، اس درمیان صدر جہاد کونسل مسٹر عمرہ میاں کی عہدۂ صدارت سے معذرت کے بعد کونسل نے محمد عباس کو صدر کونسل کا عہدہ سونپا تھا۔

اب مجاہدین کی روز افزوں ترقی سے خائف ہو کر بزدل دشمن نے اپنے خطرناک پروپیگنڈوں کا جال پھیلا دیا، اور دنیا بھر میں مجاہدین کو بدنام کرنے کی کوشش تیز کر دی، جس سے مسلمانانِ ارکان جن کے لئے اتنی کوشش ان مجاہدین نے کی تھی وہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے، ستم یہ ہے کہ دشمن کی سازش اور پروپیگنڈوں سے متاثر ہو کر اس وقت روہنگیا مسلمانوں کے چند افراد مجاہدین کے خلاف اپنی قلمی اور زبانی جنگ شروع کر دی تھی، جس کا سلسلہ اب بھی جاری ہے، اور تو اور حال ہی کی بات ہے کہ امریکہ میں رہنے والا ایک روہنگیا نوجوان جس نے خود بھی روہنگیا مسلمانوں کی مظلومیت کی داستان دہرا کر امریکہ میں پناہ لی، اس نے ای میل کے ذریعے ایک بیان جاری کیا

ہے کہ جسے پڑھ کر راقم سطور کو اتنی تکلیف پہنچی اور دکھ ہوا کہ جس کے بیان سے زبان وقلم قاصر ہے، اس نوجوان نے روہنگیا مسلمانوں کی اس پوری جہادی تاریخ کے چہرے کو ایسے عجیب انداز میں مسخ کیا کہ جس سے شبہ ہوسکتا ہے کہ وہ مجاہدین اسلام جنہوں نے اپنی پوری زندگی اس راہ عزیمت میں کھپا دی تھی آیا مسلمان بھی تھے؟ ساتھ ہی ساتھ اس نے ان مجاہدین اسلام کو ایسا سب وشتم کیا کہ جس سے کلیجے کانپ اٹھتے اور دل دہل جاتے ہیں، لیکن اس کا پورا مقالہ پڑھنے کے بعد کوئی بھی قاری یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ وہ نوجوان خود کس سازش کا نتیجہ ہے۔

یوں بھی ماضی میں اس آدمی کی شرافت نسبی اور شرافت انسانی پر صرف اپنوں کو نہیں بلکہ غیروں کو بھی شبہ تھا، آج یہ شبہ ایک یقین میں تبدیل ہو گیا ہے، اب ہم قوم کو ایسے نادانوں اور سازش کاروں، پر وپیگنڈے کرنے والے دجالوں سے بچانے کی کوشش کو ناگزیر سمجھتے ہیں، ویسے ہم ان کی شرارت اور ان کی ناروا حرکات وسکنات سے آگاہ کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ہم اپنے بزرگوں اور اسلاف کو گالم گلوچ اور سب وشتم کرنے والے مفاد پرستوں کے مفاد کے خلاف جہاد شروع کرتے ہیں۔

چلتے چلتے ایک بات، بہت طویل ہو چکی ہے، اب حکومت برما اور اس سے ساز باز کرنے والوں کے پروپیگنڈوں اور سازشوں سے تنگ ہو کر جہاد کونسل کے صدر محمد عباس نے ایک جامع اور موثر انداز میں بیانیہ جاری کیا، جس کا اقتباس قابل ملاحظہ ہے:

’’گذشتہ سات برسوں سے مجاہدین، ارکان میں ایک خودمختار ریاست کا مطالبہ کر رہے تھے، لیکن حکومت برما اپنی پوری طاقت کے ساتھ حقائق پر پردہ ڈالنے کے لئے ہمیں ڈاکوؤں کا ایک گروہ قرار دے رہی ہے، اور ہماری جدوجہد کو غلط رنگ میں پیش کیا جا رہا ہے، مگر ہمیں یقین ہے کہ اس قسم کے غلط پروپیگنڈوں سے ہم لوگوں کے مطالبہ کو دبایا نہیں جا سکتا، اور نہ ہی فوجی کارروائیوں سے ہمارے عزائم متزلزل کئے جا سکتے ہیں، اور نہ ہی ہمارے حوصلے پست کئے جا سکتے ہیں، ہم اپنے احباب، معاونین، خیر اندیش اور ہمدردوں کو یقین دلاتے ہیں کہ حکومت ہمارے نیک اور بلند مقصد سے باخبر اور بخوبی واقف ہے، اسے اچھی طرح علم ہے کہ ہم شمالی

ارکان میں اپنے حقوق اور اپنی خود مختار ریاست کے حصول کے لئے عہد کر چکے ہیں، اس امید میں کہ ہم جائداد وعزت وآبرو اور آزادی کے پورے تحفظ کے لئے پورے شعور کے ساتھ باعزت طور پر زندگی گزار سکیں گے، جس طرح برما کے دوسرے شہریوں کو حاصل ہے، اسی طرح شمالی ارکان میں ہم ایک خود مختار مسلم ریاست چاہتے ہیں، ہم لوگوں کی ایک نمایاں تہذیب ہے، اور ایک الگ مذہب ہے، جس کے تحفظ کے بغیر زندگی کی ترقیات ناممکن اور بے معنی ہیں، نیز ایک ثقافتی قوت کی حیثیت سے ہماری زندگی کچھ بھی نہیں رہی، عوام اور ذہین طبقہ کے لوگ ان تمام باتوں کا حل صرف شمالی ارکان میں ایک خودمختار مسلم ریاست کے قیام کی صورت میں پاتے ہیں، ہم برما کے موجودہ لیڈروں سے اپیل کرتے ہیں کہ جس پاکیزہ جذبات واحساسات کے تحت ہم نے شمالی ارکان کی بے یار و مددگار مسلم اقلیت کے مفاد کے تحفظ کے لئے ایک خودمختار مسلم ریاست کی تشکیل کا مطالبہ کیا ہے، وہ ان جذبات کی قدر کریں، اور ہم لوگوں کو اپنے ملک کے عوام کی فلاح اور بہبودی کے لئے کام کرنے کی اجازت دیں، ہم دوسری اقلیتوں کی سیاسی، ثقافتی، اقتصادی، مذہبی اور دینی آزادی کے لئے حکومت برما سے اپیل کرتے ہیں، ملک کے مفاد کے لئے یہ کبھی بھی مناسب نہیں کہ اقلیتوں کے پاکیزہ جذبات اور آئینی بیداری کو دبا دیا جائے، ہماری امید اور تمنا ہے کہ برما کے حکمرانوں کو بصیرت عطا ہوگی (بحوالہ روزنامہ پاسبان، ڈھاکہ ۱۹/اپریل/۱۹۵۴ء)۔

عقلاء کہتے ہیں کہ کسی چیز کا موجود نہ ہونا اور چیز، اور وجود کا علم نہ ہونا اور چیز ہے، اور ان دونوں کے تہ بتہ کسی چیز سے تجاہل عارفانہ سب سے بڑا جرم اور خطرناک چیز ہوتا ہے، اگر کوئی روہنگیا مسلمان یہ کہے کہ ۱۹۴۸ء سے چلنے والی تحریک جہاد جس کا پہلا سرا ۱۹۶۲ء تک محفوظ اور منظم نہیں تھا، یہ سراسر غلط تو ہے ہی، اگر اس نے اپنی لاعلمی کی بنیاد پر یہ دعوی کیا تو الگ بات ہے، اگر اس نے تجاہل عارفانہ سے کام لیا تو یہ ایک قومی جرم ہے، بظاہر بعض لوگوں کے مطابق ہماری تحریک کا یہ روشن سلسلہ ایک ناکامی اور نامرادی کی داستان ہے، انہیں میں عرض کروں گا کہ بظاہر کسی کامیابی اور ناکامی کے پیچھے بہت سارے نہ کہوں تو کچھ راز تو ضرور

مضمر ہوتا ہے، اس ظاہری ناکامی اور نامرادی سے کچھ بے معنی کے نتیجہ نکال کر ان بزرگوں کی تمام کارناموں اور جدوجہد کو بے کار اور بے فائدہ سمجھ لینا ایک جہالت سے کم نہیں ہے، واقعہ یہ ہے کہ ہمارے اسلاف کہ جنہوں نے ۱۹۴۸ء سے برمی وحشیوں، اوباشوں اور غاصبوں کے خلاف علم جہاد بلند کیا، ان کے کارنامے قوم اور ملک وملت کے لئے مفید بھی تھے اور جائز بھی، جو آج تک محفوظ، منظم اور مرتب ہے، ان بزرگوں کی ذات وصفات اور کارناموں کو داغ دار کرنے کی کوشش نہ قومی وملی خدمت ہوسکتی ہے اور نہ قوم کی رہنمائی اور اسلاف سے وفاداری، کوئی بدحواسی کا شکار ہوا تو الگ بات، ورنہ اس سوال کے جواب کے بطور ہمیں سوچنا چاہئے کہ ان کی یہی ناروا کوشش کس سازش کا نتیجہ ہے؟

ہمارے بعض علماء ودانشوران

اگر یہاں ایک بات کہہ دی جائے تو شاید بے جا نہیں ہوگی کہ ہمارے اکثر علماء اور مشائخ وقت جنہیں ہم اپنے پیشوا مانتے ہیں نے اسلام کو ایک مکمل دین ماننے کے بجائے عملی طور پر ایک مذہب یا دھرم مان لیا ہے، یہ حضرات دین کے بجائے مذہب یا دھرم کے پیروکار بن بیٹھے ہیں، انہوں نے عملی طور پر دین اسلام کو مذہب اسلام قرار دے رکھا ہے، ان کے نزدیک اسلام ایک ایسا مذہب ہے کہ جس میں قرآن وسنت پر کلی عمل درآمد ممکن نہیں، بلکہ اس پر جزوی عمل درآمد ممکن ہے، جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے عملی اور فکری اعتبار سے انسان کی اجتماعی اور انفرادی زندگی کو تقسیم کر رکھا ہے، ان کے نزدیک قرآن وسنت کو حیات اجتماعی اور حیات انفرادی کے ہر حصے پر حاوی نہیں کیا جا سکتا، صرف یہی نہیں بلکہ ان کے نزدیک مذہب، مشرب اور مسلک کو کسی بھی طور پر ترک نہیں کیا جا سکتا۔

ہمارے اکثر علماء کی مثال ایسے اشخاص جیسی ہے جو اپاہج ہونے کے ساتھ ساتھ بصیرت، بصارت، قوت ارادی، تمیز، عقل سلیم اور جودت فکر سے بھی کلی طور پر عاری ہو چکے ہوں، یہ ایک عیاں حقیقت ہے کہ قرآن وسنت کے مطالبات کو اجتماعی اور انفرادی حیات کے حاشیے پر کر دینے اور دین کی جگہ مذہب، مشرب اور مسلک پر چلتے رہنے کے بعد ان کی صلاحیت ختم ہو گئی ہے، علاوہ ازیں خارج میں صورت حال کی سنگینی اور داخل میں ان کی معطلی نے انہیں عجیب مخمصے میں گرفتار کر لیا ہے، پھر بھی عجیب سی بات ہے کہ اب بھی یہ لوگ زعم علم وفہم میں گرفتار ہیں، شاید ان کو بس امام مہدی ورحضرت عیسی مسیح کے انتظار نے اپاہج بنا دیا ہو۔

ہمارے یہاں موجود مذہبی اور دینی تعلیم کے ادارے، ان میں رائج نصاب تعلیم اور ان کے مصادر و مراجع زمانے کے معرکہ کے لئے اہل ہمم تیار کرنے سے شدید قاصر ہیں، ان سے پیدا ہونے والے علماء کام کے لئے کم ترین لیاقت سے بھی محروم ہوتے ہیں، ضروری تھی کہ ان سے اہل ہمم پیدا ہوں، اور تلمیذ الرحمن ہونے کے ناطے دنیا کو کچھ دینے اور سکھانے والے ہوں، مگر افسوس ایسا نہ ہو سکا، ادھر علماء کا یہی

حال ہے تو ادھر عصری علوم کے حامل اکثر مسلمان بھی ''بزِ اخفش'' بن چکے ہیں، ہمارے علماء کی اس بے حسی سے اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں وہ علمائے یہود کی روش اختیار نہ کر لے، جس کی خبر دی گئی ہے کہ:

''لتتبعن سنن الذین من کان قبلکم''

ہمارے بعض اہل فکر ونظر

ہماری بعض قیادت کو ایسا بھی دیکھا گیا کہ وہ بظاہر اسلام دشمن نہ سہی لیکن اسلام دوست بھی نہیں ہے، ایسے قائدین روہنگیا مسلمانوں کے جذبات سے کھیلتے ہوئے بس حصول نیک نامی یا اپنی قیادت کو چمکانے اور اسے مزید درمزید مستحکم کرنے کے لئے اسلام کا سہارا لیتے ہیں، اسلام ان کے دل ودماغ میں براہ راست ایک عملی قوت کے بطور گھر کیا ہوا نہیں ہے، جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ اسلام کے حوالے سے روہنگیا مسلمانوں کے عواطف کی اپیل اتنی شدید ہے کہ مذکورہ خصائل کے حامل قائدین بھی اسلام کے نام لیوا بن جانے پر مجبور ہو جاتے ہیں، ورنہ یہ پورے طور پر مغرب زدہ ہیں، ان کے دل ودماغ میں مغرب ہی چھایا ہوا ہے، اب ہم اسلامیانِ ارکان کے لئے بہت ضروری ہے کہ اسلام کو مغربی تہذیب وتمدن سے زیادہ سودمند اور کارآمد ثابت کرنے کی کوشش کریں، ہمارے مستقبل کے لئے ایک ایسے لائحہ عمل کی تیاری لازمی ہے کہ ہمارے لوگ اپنے ملک میں علمی، تحقیقی، صنعتی، اور فنی اداروں کے قیام کی طرف متوجہ ہو جائیں، سردست ہمارے لئے ضرورت اس کام کی ہے کہ جہاد کے ذریعے ملک کو غاصبوں سے پاک کیا جائے، لیکن ہم آئے دن دیکھتے ہیں کہ ہمارے یہاں جہاد اسلامی ایک ایسا عمل ہو چکا ہے، جس کا نام سنتے ہی یہ لوگ بدحواس ہو جاتے ہیں۔

ادھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ملک میں تخریبی کاموں کو فروغ دینے کے لئے ہمارے بعض لوگوں کے پاس بہت ساری میکانزم ہیں، لیکن کسی تعمیری کام کا فارمولہ ان کے پاس سرے سے نہیں، سرِ دست میرے نزدیک جہادی کام کو کنٹرول کرنے کے لئے کوئی تعمیری میکانزم کا ہونا بہت ضروری ہے، کیوں کہ ظاہر ہے کہ آج کل جہاد کے نام پر ہمارے یہاں کھلے فساد کا دور دورہ ہے، اس قسم کے نام نہاد جہاد سے ہماری مشکلات حل ہونے کے بجائے مزید ہمارے مسائل پیچیدے ہوتے جا رہے ہیں۔

بہر حال میں اپنی قوم کی ان قیادتوں کی بات کہہ رہا تھا جو مغرب زدہ ہیں، ان کو میں دوسرے الفاظ میں متغربین یعنی مغرب سے مرعوب لوگ کہوں گا، بایں ہمہ ہمارے یہ لوگ کسی ملحدانہ رویہ کے حامل بھی

نہیں ہیں، بس یہ لوگ اسلام کو چند تعبدی امور یعنی چند عقاید، امور ثقافت اور رسوم ورواج تک محدود سمجھتے ہیں، میرے خیال میں ان کی زندگی کے بس نو دس فیصد حصے میں اسلام ہے ورنہ بقیہ نوے فیصد حصے میں مغربی علم وفکر چھائی ہوئی ہے، یہ لوگ مغربی علم وفکر کو انسانی ترقی کا معراج قرار دیتے ہیں، مغربی اداروں کو معراج ترقی اور انسانی دنیا کے لئے قابل تقلید قرار دیتے ہیں، اور یہ لوگ مسلمانوں کی اجتماعی وانفرادی حیات میں ترقی کے لئے مغرب نے جس نصب العین پر کام کیا ہے اس پر کام کرنے کو ناگزیر قرار دیتے ہیں، غرض یہ لوگ معاشرتی، معاشی، علمی، ثقافتی، صنعتی، فنی، تہذیبی، تمدنی حتی کہ تحقیقی وتعلیمی اداروں کو بھی ان مغربیوں کے سانچے میں ڈالنے کے لئے کوشاں ہیں۔

طلبہ مدارس عربیہ سے اپیل

اسلام طاقت وسطوت، عزت وشوکت اور قوت وحکمت کا دوسرا نام ہے، لیکن ہمارے بعض لوگوں نے ان میں بعض علماء بھی شامل ہیں، سمجھتے ہیں کہ اسلام کمزوری، حالات ووقت کی غلامی اور شکستگی کا نام ہے ، ان کو یہ خبر نہیں ہے کہ اسلام کے رکھوالے ہمارے اسلاف نے یہ واضح کر دیا ہے کہ اسلام انصاف پسندی، پاکیزگی، آزادی، مساوات اور معاشرتی برابری کا دین ہے، ارکان میں اسلام کے رکھوالے روہنگیا مسلمان متنوع مظالم، تکالیف، برمیوں کی ایذارسانی کے سبب سے کراہ رہے ہیں، یہ مسلمان مصیبتوں میں ڈوب چکے ہیں، ان کی آزادی سلب اور حکومت وسطوت ختم کی جا چکی ہے، ظالموں نے انہیں ذلیل ورسوا کر کے چھوڑا ہے، برمی ظالموں ں نے انہیں دبا کر رکھا ہے، تو اس حالت میں یہاں کے مسلمانوں کے لئے ضرورت ہے کہ وحدت اور اتحاد کے پرچم تلے جمع ہو جائیں۔

اسلام ہی مومنوں کے درمیان بھائی چارے کا باعث اور مسلمانوں کے درمیان ایک جہتی کا وسیلہ ہے۔ اسلام نیکی اور تقوی پر تعاون کرنے اور باہم یک جا ہو کر خیر پھیلانے اور شر وفساد کو ختم کرنے کی تلقین کرتا ہے، گویا اسلام بھلائی، سعادت مندی اور انسانی فلاح کے لئے ایک روشنی کا مینار ہے، ایسی روشنی جسے اللہ تعالی نے زمین کی طرف اتارا ہے، تاکہ ظلم وبربریت، جہالت اور اندھیاری کو ختم کر کے کرۂ ارضی کو ظلم وفساد سے پاک کر دیا جائے۔

سرزمین ارکان کے مستقبل کی تعمیر کے حوالے سے جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ یہاں اسلام کی بقاء اور ازدھار کے لئے ایک ایسی جماعت کی ضرورت ہے جو دنیا کے عام انسانوں کی طرح پیدا ہونے، کچھ پڑھ لکھنے، کھانے پینے اور دنیا سے گزر جانے جیسے رکیک ترین مقاصد کے بجائے قلندری صفات سے متصف ایک عظیم نصب العین اور اعلی وارفع مقصد کے حامل ہو، میرے نزدیک یہ جماعت صرف اور صرف طلاب مدارس عربیہ سے تشکیل پا سکتی ہے، جو ارکانی مسلم سماج کے نمایاں ترین عناصر ہیں، جو خیر امت کے ممتاز افراد ہیں، جو زمین میں اللہ تعالی کے خلیفے اور قرآن وسنت کے علم بردار ہیں، جن کی

زبانیں ہمہ وقت قال اللہ اور قال الرسول کی شیرینی سے ہمیشہ تروتازہ رہا کرتی ہیں، یہی دنیا میں انبیائے کرام کے وارث ہیں، نیز دنیا کے بے ڈھنگے اور جہالت کے مارے حکمرانوں کو احکام خداوندی کی روشنی میں سلیقہ اور تہذیب عطا کرنا جن کا مشن ہوتا ہے، ظلم واستحصال، بدامنی اور ناانصافی کا سد باب کرنا ان کا اولین مقصد وترجیح ہوا کرتا ہے، نیز علمائے امت کی چودہ سالہ تاریخ دعوت وعزیمت ان کا رہنماء ہوتی ہے۔

لیکن شرط ہے کہ ان میں اسلام کا صحیح فہم وادراک اور لازمی شعور ہو، یادرہے کہ دین کی اتنی سمجھ جو ایک دیہاتی کاشتکار اور ان پڑھ شخص کے لئے کافی ہے، لیکن اتنی سی سمجھ ایک اسلامی تعلیم یافتہ کے لئے کافی نہیں ہے، لہذا وہ لوگ جنہیں سماج اور معاشرہ کی اصلاح وتعمیر کا فریضہ انجام دینا ہے، ان کے لئے اسلام کا گہرا شعور وفہم درکار ہے، انہیں یہ جاننا چاہئے کہ مختلف شعبہ ہائے حیات میں اسلام کیا رہنمائی کرتا ہے، عصر حاضر کے قانونی اور معاشی اصول کیا ہیں، اور ان کے مقابلہ میں اسلام کیا اصول پیش کرتا ہے، مزید برآں ان اصولوں کو عملی زندگی پر کس طرح اور کس طریقے سے منطبق کیا جا سکتا ہے۔

علاوہ ازیں ان کو اپنے اسلامی مقصد سے بے پناہ لگاؤ کے ساتھ ساتھ اس کے مطابق ان کی سیرت اور کردار کا ہونا بھی ضروری ہے، کیوں کہ محض فہم وشعور کے ساتھ ادراک اور افکار کی درستگی کافی نہیں ہے، بلکہ ان کی زندگی اس فکر کے مطابق بننا بھی ضروری ہے، طلبۂ مدارس کو خصوصا اپنی عملی زندگی میں ان اصولوں کو پوری طرح برتنا چاہئے، جن کی صداقت وبرتری پر وہ ایمان رکھتے ہوں، نیز ان تمام چیزوں کو اپنی زندگی سے یکے بعد دیگرے خارج کر دینا چاہئے جو اصل مقصد سے دور لے جانے والی ہوں، نیز یاد رہے کہ ہر وہ عمل جو انسان کو اپنے عقیدے سے دور کرتا ہے، اس سے آدمی کے اندر منافقت پیدا ہوتی ہے ، اور منافقت انسان کے اخلاق وکردار میں گھن لگا دیتی ہے، اس کے بعد وہ کسی کام کا نہیں رہتا، دنیا میں انہی لوگوں نے کوئی مثبت کام سرانجام دیا ہے، جن کی عملی زندگی ان کے عقیدے کے عین مطابق تھی، کیوں کہ کوئی بات کہنا اور خود اس پر عمل نہ کرنا اپنی بات کو خود جھٹلانے کا مترادف ہے، اس طرح طلبہ مدارس کو خصوصا اپنے مشن پر صبر واستقامت کے ساتھ قائم رہنا بھی بے حد ضروری ہے، کیوں کہ کسی بھی بڑے کام اور اہم کام کے لئے خواہ وہ اصلاح معاشرہ ہو یا اقامت دین کی سعی وجدوجہد، یا

کوئی اور میشن، اس کے لئے صبر واستقامت جز ولاینفک ہے، یہ اور اس جیسی دیگر صفات حمیدہ سے طلبۂ مدارس کو بالخصوص متصف ہونا چاہئے، کیوں کہ ان صفات حمیدہ سے متصف ہوئے بغیر اصلاح معاشرہ اور سماج کی تشکیل کی کوشش جوئے شیر لانے کا مترادف ہے، آج کل وہ کون سی برائی اور لعنت نہیں ہوگی جو ہمارے وطن کے مسلم معاشرہ کو اپنی زد و جھرمٹ میں نہ لے چکی ہو؟ جہالت، غربت، افلاس، اخلاقی بحران وزوال، عصمت فروشی وتضییع اوقات یہ اور اس قبیل کی متعدد لعنتیں ہمارے معاشرہ کے لئے ناسور بن کر اس کی اصلاح وترقی کی راہ میں حائل ہیں، آج کل ہمارے روہنگیا نوجوانان فکری پراگندگی، مایوسی، احساس کمتری، کاہلی، کم ہمتی اور دین سے بیزاری کے شکار ہیں، گھر کا ماحول باوجود مسلم گھرانا ہونے کے اسلام کا آئینہ دار نہیں رہا ہے، اسلامی ثقافت وتعلیمات سے انہیں چنداں شغف نہیں ہوتا، علاوہ ازیں یہاں جہیز اور دیگر خرافات کا فخریہ ارتکاب کیا جارہا ہے، کسی زمانے میں جہیز کی یہ لعنت اسکول اور کالجوں کے طلبہ میں عام تھی، مگر افسوس آج کل اس کا ارتکاب مدارس دینیہ کے طلبہ فخریہ کررہے ہیں، فی الجملہ ہمارے مسلم معاشرہ اور سوسائٹی کی صورت حال انتہائی ناگفتہ بہ ہے، واقعہ یہ ہے کہ اس دور میں جو اخلاقی برائیاں پھیل رہی ہیں، ان کو سب سے بڑھ کر ہمارے نوجوان پھیلا رہے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ عصر حاضر کے طلبہ اور نوجوان مذکورہ اور ان جیسی دیگر صفات حمیدہ سے متصف کیوں نہیں ہیں؟ ان کے اندر خود پرستی اور خدا فراموشی کی کیفیت کیوں نظر آتی ہے؟ آج کل کے نوجوانانِ اسلام دنیا سے بے رغبت ہونے کے بجائے حصول دنیا کے لئے اتنے فکرمند کیوں ہیں؟ ان حقائق اور واقعات پر غور وخوض سے چند اسباب سامنے آتے ہیں۔

ا۔ موجودہ دور کے افکار ونظریات نے نوجوانوں میں دنیا کی لالچ پیدا کردی ہے، معاشی جہد وسعی کے حوالے سے نفسا نفسی کا عالم ہے، یہاں اخلاقی قدریں پامال ہوتی جارہی ہیں۔

۲۔ دوسرا سبب طلبہ اور نوجوانوں کی سہل انگاری اور سطحی معلومات ہے، خصوصاً مسلم طلبہ اور نوجوان علمی محنت اور تحقیقی جستجو کے سلیقے سے بھی واقف نہیں رہے، اور تو اور خود طلبۂ مدارس دینیہ اسلام کے متعلق کم معلومات کے شکار ہیں، اگر بعض طلبہ اس سلسلے میں اپنا علم اور معلومات بڑھانا چاہتے ہیں

تو بعض فقہی اور نام نہاد منطقی مصطلحات کے شکار ہوجاتے ہیں۔

بایں ہمہ واقعہ یہ ہے کہ ہمارے معاشرہ کے طلبۂ مدارس دینیہ وعربیہ سے آج بھی ہماری امیدیں وابستہ ہیں، کیوں کہ بہر کیف اصلاح معاشرہ اور اقامت دین ہی طلبۂ مدارس کا فریضۂ اولین ہوتا ہے، ویسے وین کے ان حاملین کو ان بنیادی صفات سے متصف ہونا ضروری ہے جو ایک داعی اور مصلح کے لئے لازمی اور ضروری ہوا کرتی ہیں، جن کے بغیر ایک داعی نہ اپنی دعوت میں کامیاب ہوسکتا اور نہ ایک مصلح اپنے اصلاحی میشن میں کامران ہوسکتا ہے۔

ناروداری اور برمی غاصب

سرزمین ارکان اور برما میں قومی نارواداری ایک خطرناک بحران کی شکل میں پائی جاتی ہے، برمی غاصبوں نے ارکان کو ہمیشہ کے لئے غصب کرر کھنے کے لئے یہاں قومی نارواداری کی ہوا پھونک رکھی ہے، انہوں نے مگھوں کو اپنا کر مسلمانوں پر ایسے ایسے مظالم ڈھائے، جن کا تصور مسولینی کی فاشزم میں بھی نہیں کیا جا سکتا، مسولینی اور ہٹلر کی طرح برمی غاصبوں نے نسلی نارواداری کی ہوا بھی پھونکی ہے ، یہاں مذہبی نارواداری کا جہاں تک تعلق ہے، برمیوں اور مگھوں کا بس یہی حال ہے کہ وہ دنیا میں بدھ مت کے علاوہ اور دیگر تمام مذاہب کے ماننے والوں کو انسان تک تصور نہیں کرتے ، اونو کے دور حکومت سے لے کر آج تک یعنی برما کا نظام حکومت جمہوریت ہو یا کمیونزم یا سوشلزم بہرحال برمی لوگ بدھ مذہب کے ماننے والوں ہی کو انسان تصور کرتے ہیں، ان کے علاوہ تمام مذاہب بلکہ بطور خاص اسلام کے پیروکار کو انسان تصور نہیں کرتے ہیں، یہ لوگ مسلمانوں سے بڑے خائف ہیں، شاید یہ لوگ مسلمانوں کو اس لئے ڈرتے ہیں کہ ایک نہ ایک دن یہ مسلمان نہ صرف ارکان بلکہ پورے برما پر قابض ہو سکتے ہیں، یعنی یہ ایک زندہ مذہبی قوم ہے، جس نے برما کی آزادی سے قبل جہاد کی تیاری کی تھی، اور انہیں یہ بات ہمیشہ ستاتی رہتی ہے کہ ارکان کے مسلمانوں نے آزادیٔ برما کی صبح اول سے پہلے ارکان میں جہاد اسلامی کا اعلان کر دیا تھا۔

تاریخ ارکان کے درخشاں ستارے

(جلد اول)

دوسرا حصہ

عظیم شاعر الاول

حیات وکارنامے

مدخل

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین و الصلاۃ و السلام علی رسولہ الأمین و علی آلہ و صحبہ اجمعین و من تبعهم باحسان الی یوم الدین و لا عدوان الا علی الظالمین و بعد:

سرزمین ارکان کے صوفی ودرویش شاعر مرحوم الاول کے متعلق بہتوں نے مختلف انداز میں بہت کچھ لکھا ہے، سچ تو یہ ہے کہ جنھوں نے بنگلہ زبان وادب، شعر وشاعری، نقد وتبصرہ کی نسبت سے اس شہرہ ٔ آفاق مرحوم شاعر پر لکھا وہ سب داد تحسین اور خراج عقیدت کے مستحق ہیں، میری کوتاہ نظر اور علمی وفنی بے مائگی کے باوجود ان کے کلام اور شخصیت پر لکھنے والے درجنوں سے زیادہ مصنفین اور قلمکاروں کی تصانیف میری نظر سے گزریں، جن میں مرحوم عبد الکریم ساھتیہ بیشارد قابل صدر آفرین اور لائق عقیدت ہیں، اللہ تعالی کریم صاحب کو اپنی جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔

لیکن مرحوم شاعر کی زندگی کے کچھ ایسے پہلو بھی ہیں، جن کی طرف عام مصنفین اور عام قلم کاروں کے تخیلات نہیں گئے، بعض نقادوں اور قلم کاروں نے باوجود یکہ شاعر کی زندگی کے چھپے ہوئے پہلوؤں کے کھوج لگانے اور ان پہلوؤں کے تہ میں چھپے ہوئے موتی اور جواہرات کے پتہ لگانے کی کوشش کی ہے، مگر جہاں تک راقم سطور کا خیال ہے کہ وہ حضرات اپنے دراسہ وتحقیق میں صحیح معنوں میں کامیاب نہ ہو سکے، اس ناکامی کی وجوہات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ چونکہ شاعر ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک انسان تھے، تو ان کی حیات اور کارناموں پر قلم اٹھانے کے لئے ایک ایسے نقاد یا قلم کار کی ضرورت تھی جو ہمہ گیر علوم اور ہمہ گیر معلومات کے حامل ہو، ادبی ولسانی اعتبار سے نظر ڈالی جائے تو دیکھا جاتا ہے کہ شاعر پر قلم اٹھانے والے سرزمین بنگال کے قلم کار ونقاد حضرات اگر چہ بنگلہ زبان وادب کے ماہر

ہیں تو وہ شاعر کی دوسری تیسری زبانوں سے مکمل طور پر نہ کہوں تو تقریبا نابلد ہیں، اوراسی طرح اگر ایک قلم کار بنگلہ زبان وادب کے تہ بتہ عربی اور فارسی سے بھی واقف ہیں مگر اسے شاعر کے ایک اندیکھ پہلو (جسے عام زبان میں علم تصوف کہا جاتا ہے) سے بالکل ناآشنا پایا گیا ہے، تو میرے خیال میں شاعر کی زندگی اور کارناموں پر قلم اٹھانے والے بنگلہ زبان وادب میں کامل ومکمل مہارت رکھنے کے ساتھ ساتھ عربی، فارسی، سنسکرت اور پالی زبانوں سے واقفیت کی ضرورت تھی، صرف یہ نہیں بلکہ ان کی زندگی پر ایک کامیاب سوانح حیات لکھنے کے لئے ان زبانوں میں مہارت کے ساتھ ساتھ تصوف وسلوک کی دنیا سے مکمل آشنا ہونے کی ضرورت بھی ہے، بایں ہمہ ان تمام قلم کاروں کی تحریروں کو ایک جگہ میں جمع کیا جائے تو شاعر کی زندگی اور کارناموں پر تقریبا ایک مکمل تصنیف وجود میں آسکتی تھی، جوضرورت بھی تھی اور چاہت بھی۔

ادھر شاعر الاول کا زمانہ ایک ایسا زمانہ تھا کہ جس زمانے میں پوری سرزمین بنگال خونریزی، آشفتہ سری اور پریشانی میں ڈوبی ہوئی تھی، لیکن ان کا یہ دور علمی، فکری، معاشی، ثقافتی، ادبی، فنی، سماجی اورعرفانی نقطۂ نظر سے ارکان کو بڑا ثروت مند نظر آتا ہے، باوجودیکہ بنگالی باشندوں کی زبان وادب بنگلہ تھا، مگر آشفتہ سری اور پریشانی کی وجہ سے شاعر کے دور میں یہاں ادب کا چرچا تقریبا ختم ہو چکا تھا، لیکن ٹھیک اس وقت سرزمین ارکان، بنگلہ زبان وادب کا گہوارہ بنی ہوئی تھی، جہاں بڑے بڑے جید علماء وخدارسیدہ درویش وعرفاء اور جید الفکر شعراء موجود تھے، شاعر نے ارکان کی بہتر سے بہترین علمی اور روحانی مجالس سے خوب خوب استفادہ کیا، اور اپنی خداداد صلاحیت اور موہوبی استعداد کی بنا پر ملک کے تمام معاصر علماء، فضلاء، عرفاء اور شعراء میں نامور ہوئے تھے۔

شاعر نے اپنے دواوین میں معاشرے کی اخلاقی پستی اور رذالت پر بڑی خوبی سے تنقید کی ہے، انہوں نے بڑی خوش اسلوبی سے علماء کی ریاکاری اور علمی وعملی بے مائگی، ظاہر بینی اور خود فراموشی، عام لوگوں کی عصبیت وتنگ نظری پر سخت تنقید کی ہے، چونکہ شاعر کا مشرب صلح کل ہے، اسی لئے وہ ہر انسان کی طرف دست دوستی بڑھاتے ہیں، کسی سے دشمنی پسند نہیں کرتے اور سارے انسان کو صلح وآشتی کا پیغام دیتے ہیں، وہ بڑے حلیم الطبع اور منکسر المزاج انسان تھے، فقیری و درویشی انکا شیوہ تھی،

معاشرہ میں ظلم واستبداد، غرور وپندار دیکھتے ہیں تو رنجیدہ خاطر ہو جاتے ہیں، غرض الاول ریاکاری و تکبر سے سخت ترین متنفر تھے، شاعر کے دوادین کے مطالعے سے جہاں تک معلوم ہوا کہ انہوں نے فلسفہ وحکمت کا بھی گہرا مطالعہ کیا ہے، وہ بعض وقت ایک مفکر کی حیثیت سے حیات وکائنات کے راز ہائے سربستہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے یا کم سے کم آرزومند تھے، وہ غور وفکر کے بعد اس مرحلہ پر پہنچے کہ انسان کی عقل کوتاہ اور حق کی دریافت سے عاجز ہے، وحق کی دریافت کے لئے عشق کی ضرورت واہمیت کے قائل تھے۔

شاعر کے نزدیک زندگی ناپائدار ہے، انسان مختصر وقت کے لئے اس دنیا میں آتے ہیں، اگر وہ اس مختصر وقت سے پورے پورے فائدہ نہیں اٹھاتے ہیں تو وہ اگلی زندگی کی تمام لذتوں سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو جائیں گے۔

الاول ایک صوفی شاعر کی حیثیت سے مشہور ومعروف ہیں، اور یہ ایک یقینی بات ہے کہ انہوں نے سلسلہ قادریہ عالیہ سے وابستہ ہو کر مراحل طریقت طئے کئے، اور معرفت الہی میں جو مقامات واحوال سالک کے سامنے آتے ہیں ان سے کامل ومکمل آگاہ تھے، اور ساتھ ساتھ ادراک حقیقت کے لئے ہمہ تن کوشاں تھے، انہوں نے ذہنی اور فکری طور پر تصوف سلوک کے اسرار ورموز کو سمجھا ہے، وہ ہمیشہ عشق الہی میں مستغرق وسرشار تھے، چنانچہ ان کا مشہور دیوان ''پدابتی'' اس حقیقت کا آئینہ دار ہے، الاول کا یہی عشق تھا کہ جس نے اس دیوان کے تمام کلام کو دلکش، جاذب، عمیق ولطیف بنادیا ہے۔

صوفیائے کرام کو ایک نقطۂ نظر سے دو گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، ایک اصحاب سکر، دوسرے اصحاب صحو، اصحاب سکر وہ ہیں جو ماسوء اللہ سے سمیٹ کر عزلت وتنہائی کی زندگی اختیار کرتے ہیں، اور عشق خداوندی میں جذب ومستی کے عالم میں ہمیشہ مستغرق رہتے ہیں۔ اور اصحاب صحو وہ ہیں جو طریقت کے تمام مقامات طئے تو کرتے ہیں، لیکن عزلت، خود فراموشی اور خانقاہیت کی محدود زندگی سے بلند ہو کر اجتماعی زندگی سے وابستہ رہتے ہیں، وہ مخلوق خدا سے محبت کرتے اور رشد وہدایت میں مصروف رہتے ہیں۔ تو ہم اپنے ممدوح شاعر کو دوسرے زمرہ میں پاتے ہیں، کیوں کہ انہوں نے ذاتی طور پر مخلوق خدا سے منقطع ہو کر عزلت کی زندگی سے گریز کی ہے۔

ممدوح شاعر کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت ان کا عارفانہ نظریہ عشق ہے، جوان کے کلام میں جاری وساری ہے، ان کے نزدیک حقیقت مطلق تک رسائی کے لئے عقل نہیں بلکہ عشق کی ضرورت ہے، کیوں کے عقل ان کے نزدیک زیرکی کے ساتھ وسوسہ کو جنم دیتی ہے، جب کہ عاشقی اور عشق ایمان اوروجدان کو پیدا کرتا ہے۔

الاول ایک قادرالکلام شاعر ہیں، جو بنگلا زبان کے پیچ وخم اور تغیرات کے مدوجزر اور لفظوں کے تشخص سے بخوبی آگاہ ہیں، وہ موزون الفاظ وتعبیرات کو موزون محل وموقع کے مطابق نہایت چابکدستی سے استعمال کرتے ہیں، ان کے کلام کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے کلام کے پردۂ الفاظ و تعبیرات میں معانی کو چھپادیتے ہیں، جو بڑی فکروتامل کے بعد قاری پر منکشف ہوجاتے ہیں۔

الاول رموز موسیقی سے خوب واقف موسیقار تھے، وہ یقیناً خوش آواز بھی رہے ہوں گے، کیوں کہ انہوں نے اپنے کلام کے لئے موزون اور مناسب اوزان تلاش کرتے رہے ہیں، تا کہ لطافت اور نغمگی میں فرق نہ آنے پائے۔

اب راقم سطور کے اس موضوع پر قلم اٹھانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کا خواہ مخواہ یہ دعوی ہو کہ وہ اس ہمہ گیر شخصیت کے مالک شاعر پر قلم اٹھانے کی مستحق ہے، تاہم سچ تو یہ ہے کہ شاعر پر قلم اٹھانے والے قلم کاروں کی تحریروں نے راقم سطور کو اس بات پر مجبور کردیا ہے کہ ان کی تحریروں کا ازسرنو جائزہ لیا جائے، اور تحقیق و دراسہ کر کے ایک نیا مطالعہ دنیا کے سامنے پیش کیا جائے، راقم سطور نے ہر موقع پر تنقید وتبصرہ کا وہ جامع اصول اور مسلم ضوابط کا پاس رکھا ہے جو ایک غیر جانبدار، حق گو، حقیقت پسند نقاد وقلم کار کے لئے ضروری ہے۔

اللہ سے دعا ہے کہ وہ اپنی خاص رحمت سے اس حقیر کاوش کو قبول فرمائے، اور خاکسار کو مزید علم وعلماء کی خدمت اور قوم وملت سے لگاؤ کی توفیق سے نوازے، واللہ الموفق و المستعان و الیہ أنیب۔

خاکسار/

محمد طاہر جمال ندوی

۲۵/نومبر/۲۰۲۲ء

چاٹگام، بنگلادیش۔

پہلا باب

ارکان کا جغرافیہ اور قدرتی وسائل

سرزمین اسلام ارکان کے حدود میں مختلف ادوار میں مختلف وجوہات کی بنیاد پر کمی بیشی ہوئی ہے، کبھی ایسا بھی ہوا تھا کہ ارکان کے حدود ایک طرف ڈھاکہ تک پہنچی تو دوسری طرف تھائی لنڈ اس کا دوسرا سرا تھا، یہاں تک کہ ۱۶۲۵ء تک بنگال کے علاقے نواخالی اور باقرگنج سمیت ڈھاکہ کو بھی اس مملکت میں شامل کرلیا گیا تھا، آئین اکبری کے مطابق ارکان بنگال کے جنوبی مشرق میں ایک وسیع ملک ہے، جسے ارخنگ کہا جاتا ہے، اور چاٹگام کی معروف بندرگاہ اس ملک میں شامل ہے۔

سرزمین ارکان کا حالیہ رقبہ چودہ ہزار دوسو (۱۴۲۰۰) مربع میل ہے، جو میانمار کے جنوب میں دریاؤں اور بلند پہاڑوں، زرخیز اور خوش فضا میدانوں پر مشتمل ایک خوب صورت علاقہ ہے، اور خلیج بنگال کے مشرقی ساحل کے ساتھ جنوباً وشمالاً پھیلا ہوا ہے، جس کی چوڑائی شمال میں زیادہ ہے، تقریبا ایک سومیل سے بتدریج کم ہوتی ہوئی یہ چوڑائی جنوب میں صرف بیس میل تک رہ جاتی ہے۔

۱۹۶۵ء تک ارکان کا معروف پہاڑی علاقہ ''پلوا'' ارکان ہی میں شامل تھا، مگر حکومت برما نے اپنی آزادی کے بعد اس پہاڑی علاقے کا بیشتر حصہ چھن اسٹیٹ میں شامل کردیا ہے۔ اسی طرح ساندوے ضلع سے بھی مزید دوسومیل کا علاقہ بشمول دوجزائر کو ایراوڈی ڈویژن میں شامل کردیا گیا ہے، جس پر ارکان کے تمام باشندے ناراض ہیں۔

اس سرزمین کے شمال میں ہندوستان کے علاقے اور برما کی ریاست چھن اور مشرق میں اس کی سرحد بلند وبالا کوہ ارکان ہے، جو کوہ ہمالہ کا ایک عظیم پہاڑی سلسلہ ہے، جسے ارکان یوما کہا جاتا ہے، جو ارکان کو برما کے دوسرے علاقوں سے مکمل طور پر جدا کردیتا ہے۔

سرزمین ارکان ہزاروں سالوں سے ایک الگ تلک ریاست رہی تھی، مگر تاریخ کا یہ ایک بڑاالمیہ ہے کہ برطانوی سامراجیوں نے ۱۹۳۶ء میں برما کو برطانوی ہند سے علیحدہ کرتے وقت اس سرزمین کو برما کا ایک صوبہ بنادیا تھا، جبکہ تاریخی اورجغرافیائی اعتبار سے ارکان بنگال سے ملاہواایک علاقہ ہے۔

کوہ یوما، برمااورارکان کے مابین ایک قدرتی فصیل ہے، جس نے برما سے اسے جدا کر کے ایک طبیعی اورجغرافیائی اکائی کی صورت عطا کی ہے، اور یہ عظیم الشان پہاڑ جسے کوہ ارکان بھی کہاجاتا ہے، نہ صرف ارکان کو برما سے جدا کرتا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ پہاڑ مہابھارت اور چین کے درمیان ایک قدرتی فصیل بھی ہے۔

اوراس کوہ یومایا کوہ ارکان کے چار پہاڑی سلسلے ہیں جو دوڑتے اور رینگتے ہوئے جنوب کی طرف سمندر میں جاگرتے ہیں، جس کا اجمال یہ ہے:

(۱) ناف تنگ: جوحالیہ ارکان کے مغربی سرحد سے نکل کر دریائے ناف کے مغربی کنارے کنارے دوڑتا ہوا ٹیکناف تک چلاجاتا ہے۔

(۲) کوہ لیمرو: جودریائے لیمرو کے مغربی کنارے کے ساتھ ساتھ ممبیا کے مغرب سے پکتوتک چلا جاتا ہے۔

(۳) کوہ سیندنگ: جو دریائے کلاڈان اور دریائے مایو کے مابین پھیلتا ہوا مانگائی تک چلا جاتا ہے، جس میں ایک مشہور درہ ہے، جسے ''درۂ افک'' کہاجاتا ہے، اور یہ وہی درہ ہے کہ جس کے نام آتے ہی آج بھی ارکان کے مسلمان خون کے آنسو روتے اور ۱۹۴۲ء میں کئے گئے مسلمانوں کے قتل عام کی یادتازہ کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ کوئی پچاس ہزار سے زیادہ مسلمانوں کو اس وقت درہ عبور کرنے کے دوران وحشی مگھ اورظالم برمیوں نے شہید کردیا تھا۔

(۴) کوہ گولنگی یا گاؤلنگی: جو دریائے ناف اوردریائے مایو کے درمیان سے رینگتا ہوامایوٹیک تک چلا جاتا ہے، اس سلسلے میں چندمشہور درے بھی ہیں، جن میں درۂ گوفی، درۂ علی چنگ، درۂ سیندی پرانگ، درۂ ناکائندنگ، اوردرۂ یونگ چنگ بہت مشہور درے ہیں، درۂ علی چنگ میں ایک پختہ سڑک بھی ہے، جو منگڈو کو بوسیدنگ سے ملاتی ہے، کہا جاتا ہے کہ اس ناہموار پہاڑی درہ کو جنرل ولی خان نے

کاٹ کرراستہ بنایا تھا۔

ارکان کا ایک تاریخی نام روہانگ بھی ہے، جوحالیہ برما کے شمال مغرب میں واقع ہے، جس کی خلیج بنگال سے ساتھ چلنے والی ۳۶۰ر میل ساحلی پٹی ہے، علاوہ ازیں اس کی بری سرحد جو ۱۷۶ر میل بشمول ۳۶۰ر میل لمبی آبی سرحد کے بنگلا دیش کے ساتھ متصل ہے، جو بنگلا دیش کے معروف علاقہ چاٹگام کوارکان کے ساتھ ملاتی ہے۔

ارکان پہاڑوں، دریاؤں، گھنے جنگلات اورکھاریوں پر مشتمل ایک علاقہ ہے، بعض ماہرین کے مطابق کل سطح زمین کا ۷۰ رفیصد حصہ جنگلات پر مشتمل ہے، ارکان کی سدابہار پہاڑیوں میں ساگوان اور ربڑ کے علاوہ بہت سے قیمتی درخت پائے جاتے ہیں، اس ملک کا شمالی حصہ ہموار، ڈیلٹائی اور گھنی آبادی والا ہے، جبکہ جنوبی حصہ تنگ، چٹانی اورکم آبادی والا۔ پوری سرزمین میں کل سات مشہور دریا پائے جاتے ہیں، وہ یہ ہیں:

(۱) دریائے ناف۔
(۲) دریائے کلاڈان۔
(۳) دریائے مایو۔
(۴) دریائے لیمرو۔
(۵) دریائے این۔
(۶) دریائے تنگوپ۔
(۷) دریائے سانڈوے۔

یہ ساتوں دریا عموماً گہرے اور جہازرانی کے لئے بہت موزون ہیں، علاوہ ازیں ان سے بڑی مقدار میں مچھلیاں شکار کی جاتیں اورموتیاں بھی نکالے جاتے ہیں، کلاڈان ارکان کا سب سے لمبا دریا ہے، جس کا بالائی سرا کوہ ہمالہ سے شروع ہوتا اورخلیج بنگال میں جااترتا ہے، یہ تمام کے تمام دریا ارکان میں نقل وحمل یا آمدورفت کے لئے مرکزی ذریعے کےطور پر استعمال ہوتے ہیں۔

ساحل ارکان کے قریب چند جزائر ہیں، جن میں رحمبری اور چیڈوبا سب سے بڑے اور مشہور ہیں، اور

جزیرۂ رحمبری ایک تاریخی جزیرہ ہے، جوکیا کتاؤ ٹاؤن شپ سے مشرق میں چند میل دور واقع ہے، جہاں گہرے پانی میں ایک بندرگاہ بھی ہے، خلیج کے نیلے پانی میں چیڈوبا اور رحمبری دو خوشنما جزیرے ہیں، جن کی زمینیں نہایت زرخیز بھی ہیں۔ ارکان کے آس پاس کے تمام جزائر میں عام طور پر رہنگیا مسلمانوں کی آبادیاں اکثریت پر مشتمل تھیں، لیکن مگھ برمیوں کے مظالم نے آج اقلیت بنا کر رکھ دیا ہے۔

ارکان میں کل سترہ شہر ہیں، دریائے کلاڈان کے دہانے پر واقع شہر اکیاب اس کا دارالحکومت بھی ہے اور مرکزی بندرگاہ بھی، ارکان میں مواصلات کا نظام بڑا پسماندہ ہے، گذشتہ صدی کے آواخر تک یہاں صرف ۱۵۰ / میل لمبی ایک بدنما سڑک پائی جاتی تھی، مگر برمی فوجی حکومت (SPDC) نے اپنی جنگی حکمت عملی کے پیش نظر برما سے ارکان کو ملانے والی ایک عام سڑک تیار کرلی ہے، ارکان میں کوئی ریلوے نہیں ہے، برطانوی دور میں قدیم شاہراہ ارکان کے ساتھ ساتھ حالیہ بنگلا دیش کے صوبۂ چاٹگام سے ملانے والی ایک ریلوے لائن موجود تھی، جس کی کچھ بوسیدہ نشانیاں آج بھی کہیں کہیں دیکھی جاتی ہیں۔ کوہ ارکان میں تین پہاڑی راستے ایسے بھی ہیں جو برما کے ساتھ ارکان کا زمینی اتصال قائم کرتے ہیں، جن میں درۂ تنگوپ زیادہ مستعمل تھا، مگر آج کل درۂ این سے ایک پختہ سڑک نکالی گئی ہے، جو برما کو ارکان سے ملاتی ہے۔

سرزمین ارکان قدرتی وسائل سے پھٹا پڑا ایک علاقہ ہے، دنیا کے ترقی یافتہ علاقوں کے وسائل سے توازن کیا جائے تو ارکان کسی بھی اعتبار سے کم نہیں ہے، چونکہ یہ علاقہ مسلم اکثریتی علاقہ تھا، تو ترقی دینے کے لئے برمی غاصبوں نے چاہا نہ اور کسی کو کرنے دیا۔ حکومت برما کی ہمیشہ چاہت یہی رہی ہے کہ یہاں کے قدرتی وسائل سے مسلمان مستفید نہ ہوسکے، ہر ممکنہ طریقۂ کار کو اپناتے ہوئے حکومت یہاں کے مسلمانوں کو اپنے وطن کی دولت سے مستفید نہ ہونے دی۔ سطور بالا میں جس طرح عرض کی گئی ہے کہ ارکان کی زمین بڑی زرخیز ہے، اور ۹۶۴۲۵۷ / ایکڑ قابل کاشت زمین میں سے ۸۲۴ ۱۸۵۴ / ایکڑ زمین ہر سال کاشت میں لائی جاتی ہے، وہ بھی سال میں ایک فصل سے زیادہ نہیں ہوتی، ۱۹۸۰ء کے عشرے سے پیداواری شرح گر جانے کے باوجود یہ خطہ ایک زائد مقدار میں تقریبا دو لاکھ ٹن چاول سالانہ پیدا کرتا ہے، ساٹھ سال قبل ارکان ۴۵۰۰۰۰ / من زائد مقدار میں چاول

پیدا کرتا تھا، جو دنیا کے بہت سے ملکوں کو چاول برآمد کرتا تھا۔ یہاں چاول کی کاشت روایتی طریقے سے کی جاتی ہے، اور بعض ماہرین کا اندازہ ہے کہ اگر زمین کی کاشت کے لئے جدید آلات و وسائل استعمال کئے جائیں تو ہر سال یہاں کی زمین دس لاکھ ٹن زائد فاضل چاول پیدا کرسکتی ہے۔

سرزمین ارکان کے ۳۶۰ / میل لمبے ساحل کے علاوہ بھی اندرون ارکان میں بھرے پڑے دریا مختلف قسم کی مچھلیوں کا مخزن ہیں، جن میں جینگا بڑی نامور مچھلی ہے۔ جدید سامان سے آراستہ ماہی گیر کشتیوں کی عدم موجودگی اور ماہی گیروں پر حکومت کی طرف سے عائد ناروا پابندیوں کی وجہ سے سالانہ پیداوار پڑوسی ملک بنگلا دیش کے مقابلے میں کہیں کم ہے۔ ارکان کے ساحلی علاقے ماہی پروری کے لئے مثالی حیثیت رکھتے ہیں، ماہی پروری کے بند دریائے ناف، مایو اور کلاڈان کے مدوجزر والے دہانوں پر بہترین قسم کی مچھلیاں پیدا کرتے ہیں، یہ اکثر و بیشتر بند مسلمانوں کی ملکیت میں تھے، لیکن برمی مفسد اور نسل پرست حکومت نے اکثر و بیشتر بند مسلمانوں سے چھین لئے ہیں، جس کی وجہ سے شرح پیداوار بہت کم ہوگئی ہے۔

سرزمین ارکان کی تخمینی آبادی، اور یہاں پائے جانے والی ٹاؤن شپ اور ان کے مربع میل کا ایک

گوشوارہ

تعداد	ٹاؤن شپ	مربع میل	آبادی
۱	اکیاب	89.42	169090
۲	چوکپرو	672.35	12373
۳	سانڈوے	1360.16	95490
۴	بوسیڈنگ	779.55	185263
۵	کیوکتاؤ	695.55	154419
۶	ممبیا	1338.46	126436
۷	گوا	885.11	50784
۸	تنگوپ	1906.62	92949
۹	پکتاؤ	413.74	104113

۱۰	مروکو	440.97	146878
۱۱	منگڈو	585.92	479798
۱۲	پوناجون	419.63	85191
۱۳	مرے بون	942.12	79360
۱۴	مینونگ	202.04	63736
۱۵	رٔمبری	506.73	94574
۱۶	راسیدنگ	437.76	200000
۱۷	این	2467.51	75942

ارکان کے سدا بہار پہاڑوں کے جنگلات سے خاصی پیداوار حاصل ہوتی ہے،خشکی کا ستر فیصد علاقہ جنگلات سے پٹا ہوا ہے،جس میں بہترین عمارتی لکڑیاں پیدا ہوتی ہیں،ان میں ساگوان اور ربڑ کے علاوہ بہت سے قیمتی درخت پائے جاتے ہیں، یہ کل برمی لکڑی پیداوار کا پندرہ فیصد ہے،اگر ساگوان باقاعدہ سائنسی طریقے پر اگائے جائیں تو اس سے کہیں زیادہ مقدار میں برآمد کر کے ملک کو خوش حال بنایا جاسکتا ہے۔آہنی لکڑی جو پینکاڈو کے نام سے مشہور ہے،اس خطے میں وافر مقدار میں پائی جاتی ہے، بانسوں کی بھرمار ہے، ماہرین کے اندازے کے مطابق یہاں کے بانس سے بہترین قسم کے کاغذات اور دوسری چیزیں عالمی منڈیوں کے لئے تیار کی جاسکتی ہیں،ارکان کی اگر کسی موزون اور برمحل جگہ پر ایک کاغذ سازی کا کارخانہ ہوتا تو اس کی پیداوار چاٹگام(بنگلادیش) کی مشہور ومعروف فکٹری''کرنافولی پیپرمیل'' سے بڑھ جاتی۔بعض ماہرین کے مطابق شمالی ارکان چائے اور ربڑ کی کاشت کے لئے بھی نہایت موزون علاقہ ہے،علاوہ ازین سرزمین کے گھنے جنگلات اور پہاڑی علاقہ جات میں وحشی جانور بھی کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ارکان میں اگرچہ گلہ بانی اور حیوانی نسل بندی کا کوئی سرکاری منصوبہ اب تک موجود نہیں ہے، تاہم تمام کسان،گائے،بھینس،بکری،مرغی،بطخ،کبوتر وغیرہ پالتو جانوروں کےطور پر رکھتے ہیں۔

بوسیدنگ شہر سے تقریبا پندرہ میل جنوب مشرق میں دریائے سیندنگ کے بالائی دہانوں پر واقع قدرتی آبشارہ جسے مقامی زبان میں''تارائنگ'' کہا جاتا ہے،ایک زبردست کام کی چیز ہے، اس ۲۲۰ فٹ بلندی سے گرنے والا آبشارہ سے خاصی مقدار میں بجلیاں پیدا کی جاسکتی ہیں،اگر سائنس دانوں کی مدد سے اس قدرتی آبشارہ سے بجلیاں پیدا کی جائیں تو یہ بہت بڑی برق آبی پلانٹ کو قوت مہیا کرسکتا ہے،بعض ماہرین کے مطابق اس آبشارہ کے سرے میں ایک تیل کی کان بھی موجود ہے۔۱۹۶۰ءکو اس وقت کی اونو حکومت نے اقوام متحدہ کے تعاون سے اس آبشارہ کی جگہ ایک برق آبی پلانٹ لگانے کا منصوبہ بنایا تھا،مگر ۱۹۶۲ء میں جنرل نیون کے اقتدار پر قبضے کے بعد فوجی حکومت نے اس منصوبے پر عمل درآمد ترک کردیا تھا،یادرہے کہ اس آبشارہ کے علاوہ اس علاقے میں اور بھی متعدد آبشارے پائے جاتے ہیں۔

ارکان میں قدرتی وسائل جیسا کہ کوئلہ اور مٹی کے تیل کی کانیں بڑی مقدار میں موجود ہیں،ساحل ارکان کے قریب پٹرولیم اور گیس بھی موجود ہے، ماضی میں یہ ساری چیزیں غیر دریافت شدہ تھیں،مگر بعد میں گیس اور پٹرولیم کی کچھ کانیں دریافت ہوگئیں یا کی گئی ہیں،جن کی وجہ سے پڑوسی ملک بنگلادیش اور برما کے درمیان کچھ کشیدگیاں بھی ہوگئی تھیں،ایک ذرائع کے مطابق ۱۹۷۰ء میں بعض جاپانی فرموں کے اشتراک سے تیل کے ذخائر تلاش کرنے کی کوشش ہوئی تھی،لیکن بعض سیاسی یا مالی وجوہات کی بنا پر برمی نسل پرست حکومت نے اس منصوبہ کو ترک کردیا تھا،رٔمبری اور چیڈوبا جزائر میں خام تیل دستی طریقوں سے برآمد کیا جاتا ہے، اور ماہرین ارضیات کا دعوی ہے کہ راسیدنگ، جزیرۂ چیڈوبا اور رٔمبری وغیرہ علاقے میں بہت سے خام تیل محفوظ ہیں۔

علاوہ ازیں لوہا، یورنیم، چونے کا پتھر، گرینائٹ، اورفلز وغیرہ اس علاقے میں بڑی مقدار میں ہے، بعض ماہرین کے انکشاف کے مطابق سب سے زیادہ ارزانی کے ساتھ دستیاب ہونے والی شئ سنگ مرمر کے ذخائر ہیں،بعض ذرائع کے مطابق کچھ جاپانی فرموں نے ان ذخائر کی اجازت کے بدلے علاقے میں منفعت بخش ترقیاتی منصوبوں کی پیش کش کی تھی،لیکن ان تجاویز پر سنجیدگی کے ساتھ غور نہیں کیا گیا، بلکہ یہ علاقہ چونکہ روہنگیا مسلمانوں کا علاقہ ہے،تو برمی حاسد، مفسد اور نسل پرست

حکومت نے ان تجاویز کو مسترد کر دیا تھا۔

ارکان کے طویل ساحلی علاقے کے علاوہ یہاں کے بعض دوسرے اندرونی دریاؤں کے کھارے پانی سے وافر مقدار میں نمک پیدا کیا جاسکتا ہے، ابھی بھی ارکان کے مختلف مقامات میں سمندری پانی کو گڑھوں میں بند کر کے پھر اسے خشک کر لیا جاتا، جس سے بہترین قسم کے نمک تیار ہوتے ہیں، یہ سارے کاروبار بدون سرکاری تعاون سے کیا جاتا ہے، منگڈو، اکیاب، سانڈوے اور تنگوپ وغیرہ علاقوں میں سمندری پانی سے بہترین قسم کے نمک پیدا کئے جاتے ہیں۔

ارکان میں ناریل کی کاشت بڑے پیمانے پر کی جاسکتی ہے، مگر ملک کے طول وعرض میں ناریل کی کاشت بہت ہی چھوٹے پیمانے میں کی جاتی ہے، اندازہ کیا جاتا ہے کہ ناریل کی سالانہ پیداوار پندرہ لاکھ ہے، سنڈوے اور گوا شہروں میں صرف ایک ایک فکٹری ہے، جہاں ناریل کے چھلکوں سے رسیاں تیار کی جاتی ہیں، یہاں ناریل کے تیل کی فراوانی کے باوجود اس سے دوسرے کام لینے کی کوئی بھی تیاری نہیں ہے۔

ارکان میں صنعت وحرفت کا کیا کہنا؟ بس ملک کے طول وعرض میں چاول کے چھوٹے چھوٹے چند کارخانے موجود ہیں، دراصل یہاں کے لوگوں کو اندھا بنا کر رکھا گیا ہے، صرف اور صرف ارکان کے دارالحکومت اکیاب میں ایک کارٹون فکٹری موجود ہے، کیا کتو شہر میں حکومت نے ایک چھوٹی سی شکر میل کی بنیاد رکھی تھی، مگر غضب یہ ہے کہ اس کے ساتھ ایک شراب سازی کا کارخانہ بھی موجود، یہاں شکر زیادہ تر گنے سے پیدا کی جاتی ہے۔

مذکورہ ان تمام وسائل کے علاوہ مرچ، تمباکو، گنا، لوبیا، اڑوی، چنا، مونگ، ارہر، بھنڈی، تیل، پیاز، لہسن، چالیہ، توری، کدو، لوکی، اور مختلف قسم کی سیم، مونگ پھلی، ادرک، ہلدی، باجرہ، بیگن، مولی، گاجر، بندگوبی، پھول گوبی، کھیرا، ٹماٹر، آڑو، آم، کھٹل، پپیتا، لیچی، آلو ،لکی، تربوز، کیلا، امرود، انناس، آنار، سنترہ، سرد، شریفہ، کاجو، خربوزہ، ترنجین اور رس بھری وغیرہ پیدا ہوتا ہے، اور یہ ساری چیزیں روایتی طریقے پر کسی بھی سرکاری تعاون کے بغیر پیدا کی جاتی ہیں، اگر انہیں سائنسی طریقے پر پیدا کیا جائے تو دوسرے ملکوں کو خاصی مقدار میں برآمد کیا جاسکتا ہے، مگر غضب یہی ہے کہ یہاں سرکاری تعاون تو کجا

بلکہ شر پسند حکومت کسانوں پر ایک زبردست پابندیوں کے ذریعے ان کی نیند حرام کر رکھی ہے، جس کی وجہ سے زراعت ویران ہوتی گئی اور اب بھی ہوتی جا رہی ہے۔

یہ تو معلوم ہے کہ یہاں حیوانی نسل بندی کا کوئی بھی سرکاری منصوبہ بندی نہیں ہے، مگر علاقے میں وحشی اور جنگلی جانوروں کا بھرمار ہے، جن میں شیر، ہاتھی، ارنا، بھینسا، بارہ سنگھا، سانبھر، طوطا، ہرن، سور، ریچھ، بھیڑیا، جنگلی بکری، مختلف قسم کے بندر، چرخ لومڑی، بھانت بھانت کے سانپ، اژدھا، مینا، مور، فاختہ، چیل، کوا، الو، جنگلی کتا، جنگلی مرغ، اور تیتر وغیرہ پایا جاتا ہے، علاوہ ازیں شہد کی مکھیوں کا کیا کہنا، کہ ارکان کے سارے جنگلات عمدہ قسم کی مکھیوں سے بھرے پڑے ہیں۔

ارکان موسم کے حوالے سے مدارینی (TROPICAL) آب وہوا کا علاقہ ہے، سالانہ اوسطا ۲۰۰/ انچ کی بارش ہوتی ہے، ساحلی علاقوں کے مقابلے میں پہاڑی علاقوں میں حرارت اور سردی کچھ زیادہ ہے، یہاں کے تمام موسم یہاں کے اصلی باشندوں کے لئے بڑے موزون ہیں۔

تاریخی پس منظر

آغاز تاریخ سے پہلے ارکان میں آدم خور اور اوہام پرست انسانوں کی بود و باش کا سراغ ملتا ہے، کہا جاتا ہے کہ آرین کے حملوں کی وجہ سے ہندوستان میں ایک عظیم انقلاب آیا تھا، ان حملوں سے متاثر ہو کر پنجاب کے اصل باشندے ڈراویر مشرق کی طرف بھاگ گئے تھے، اس سلسلے میں ڈراویر کے چند قبائل اراکان میں آبسے تھے، اور انہوں نے اس سرزمین کو آباد کر کے یہاں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی ،بعض مورخین کے مطابق یہ قبائل ہندومت کے پیرو دیوتاؤں کو پوچھتے تھے، ارکان کے مختلف مقامات میں آبسنے والے ان چاروں قبائل اور ان کی چار ریاستوں کے علاوہ بعد میں ان کی ایک مرکزی حکومت کے قیام کا پتہ ملتا ہے، بعد میں یہ جو قبائل ان ریاستوں میں اپنے اپنے دیوتاؤں کے نام سے معروف ہوئے تھے، ان کے نام یہ ہیں:

ا۔دھنووتی: اکیاب میں آبسنے والا قبیلہ کی دیوی تھی۔

۲۔راماوتی: چوکپر و میں آبسنے والا قبیلہ کی دیوی تھی۔

۳۔میگاوتی چیڈ وبا میں آبسنے والا قبیلہ کی دیوی تھی۔

۴۔دباراوتی: سانڈوے میں آبسنے والا قبیلہ کی دیوی تھی۔

ابتدا میں ان قبائل نے اپنے اپنے مذکورہ علاقوں میں ایک ایک ریاست قائم کر چکی تھی ، بعد میں ان قبائل کے مابین اتفاق رائے ہوا اور جس کے نتیجے میں ایک متحدہ حکومت (جو چار ندکورہ ریاستوں پر مبنی تھی) قائم ہو چکی تھی۔

اب جب عربوں کا اس علاقہ میں آنا ہوا تو انہوں نے ان چار ریاستوں پر بنی ہوئی ایک حکومت دیکھی جسے مقامی زبان میں ”مہاوھیتو استھان“ کہا جاتا تھا، عربوں نے اس متحدہ حکومت کو پایا تو انہوں نے ان چار ریاستوں کو ایک ایک رکن قرار دے کر ان کی مرکزی حکومت کو ارکان کے نام سے موسوم کیا تھا۔

ویسے تاریخ ارکان میں ہندوراجوں اور مہاراجوں کا ایک طویل سلسلے کا سراغ ملتا ہے، یہ سلسلہ ۲۶۶۶ قبل مسیح سے شروع ہو کر سن عیسوی کے اوائل تک قائم رہتا ہے، ۷۸۸ء میں یہاں دھنووتی / یا دھنیا ودی یا ویسالی حکومت قائم ہوئی، معروف مورخ ار بی اسمارٹ بیان کرتا ہے کہ عرب تجار کا ارکان باسیوں کے ساتھ ۷۸۸ء سے پہلے قریبی رابطہ رہا، انہوں نے یہاں کے باشندوں کو اسلام سے متعارف کرایا تھا، جزیرۂ رامبری کی بندرگاہ عرب جہازرانوں کے لئے ایک مانوس نام تھا۔(۱)

سن عیسوی کی ابتدا میں موریہ سلطنت کے زوال کے بعد ہندوستان میں مسلسل آٹھ صدیوں تک بدھ مت اور ہندومت کے درمیان کشمکش جاری رہی تھی ، بہار میں نسل پرست ہندوؤں اور حریف مہایانا بدھ فرقہ کے ہاتھوں تھراوَڈا بدھ فرقہ اس بری طرح ستایا گیا کہ وہ مشرق کی طرف فرار ہونے پر مجبور ہو گیا تھا، بعد میں ان لوگوں نے بنگال، اریسہ، آسام کی راہ چوری چھپے ارکان کی ہندو مملکت میں پناہ لی تھی۔

یوں تو ارکان میں عربوں کے بہتوں دعاۃ و مرشدین آئے تھے، لیکن ان کے ساتھ ساتھ اور ایک عظیم مجاہد اسلام بھی اس سرزمین میں تشریف لائے تھے، جن کے نام گرامی محمد الاکبر تھا، بعض مورخین کے مطابق کربلا کے واقعہ کرب و بلا کے بعد اسلام کا چوتھا خلیفہ حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کا بیٹا حضرت محمد الاکبر معروف بہ محمد ابن الحنفیہ نے ایک قافلہ لئے بحری راستے سے مشرق کی طرف ہجرت کی تھی ، اس موضوع پر بعض ارکانی داستان سراؤں نے طول طویل داستانیں لکھی ہیں، جن میں شاعر محمد خان کی داستان ”حنیفہ کی لڑائی“ اور شاہ باردخان کی داستان ”حنیفہ اور خیرہ پری“ قابل ذکر داستانیں ہیں ، ان دونوں داستان سراؤں کی داستانیں اگر چہ اصول تاریخ کے نقطۂ نظر سے قابل ملاحظہ ہیں، لیکن ان داستانوں کے تہ میں کچھ حقائق بھی موجود ہیں، جن کے متعلق مورخ محترم پروفیسر حبیب اللہ صاحب رقم طراز ہیں کہ:

”ویسے شاہ باردخان اور محمد خان کی داستانوں میں اگر چہ کچھ خیالی باتیں بھی ہیں، لیکن کہانی کے اصلی روپ میں کچھ حقائق بھی چھپے ہوئے ہیں ،شاہ باردخان کی

RB.SMART, BURMA GAGETTER AKYAB DISTRICT,VOL:2,P:19.(1)

> داستان میں اسلام کے چوتھے خلیفہ حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کے بیٹے کی شاہی رام راجا سے جنگ، فتح کے بعد خیرہ پری سے ان کی شادی، دھر میک راجا کا اسلام کے حلقے میں داخل ہونا، اور محمد خان کی داستان ''حنیفہ کی لڑائی'' میں پائی جانے والی داستان میں جوئی گون پری کا گرفتار ہونا، روہانگ میں محمد بن حنفیہ کی لڑائی، خیرہ پری کی رہائی، اور اس کے ساتھ حنیفہ کی شادی جیسی داستانیں پائی جاتی ہیں، یادرہے کہ ٹیکناف (کوکس بازار) کے آخری سرا میں شاہ پریر دیپ نامی ایک مقام ہے، ادھر حالیہ ارکان کے مشہور منگڈو کی مشرقی جانب دور سے دیکھے جانے والے ایک پہاڑی سلسلے میں دو بڑی بڑی پہاڑی چوٹیاں ہیں، ایک کا مقامی نام حنیفا رٹونگی، جب کہ دوسری چوٹی کا نام خیرہ پریر ٹونگی ہے، ویسے ان شواہد سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ ان دونوں داستان سراؤں کی داستانوں میں کچھ حقیقت بھی موجود ہے، یہ ساری چیزیں اور دونوں داستان سراؤں کی داستان کی حقیقت کی بین دلیل ہے''۔(۱)

مقامی لوگوں کی روایات اور بعض مورخین کے بیان کے مطابق محمد الاکبر (۲) معروف بہ محمد بن الحنفیہ واقعہ کربلا کے بعد مشرقی دنیا کو نکل گئے تھے، اور بحری راستے سے ہوکر شاہ پریر دیپ (جس زمانے میں وہاں ایک مہاراجا کی حکومت تھی) میں تشریف فرما ہوئے تھے، یہ وہ زمانہ تھا کہ جس وقت شاہ پری کی بیٹی خیرہ

---

(1) پروفیسر حبیب اللہ، روہنگیا ذاتیر ایتی ہاش، ص: ۷۷۔

(۲) امام محمد الاکبر سیدنا امیر المؤمنین حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کی دوسری بیوی حضرت خولہ بنت جعفر بن قیس بن مسلمہ کے بطن سے تھے، تاریخ میں آپ محمد ابن الحنفیہ کے نام سے معروف ہیں، آپ کی ولادت ۲۱ھ میں ہوئی، بعض شیعوں کی رائے یہ ہے کہ آپ حضرت امام حسین رضی اللہ تعالی عنہ کی شہادت کے بعد امام مقرر ہوئے، شیعوں کے اس فرقہ کو کیسانیہ کہا جاتا ہے، کہا جاتا ہے کہ ابن الحنفیہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے بہتوں معرکے میں بحیثیت شہسوار یا قائد لشکر جرار شریک ہوئے تھے، اس حوالے سے تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو محمد رضا کی مشہور تصنیف ''الامام علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ رابع الخلفاء الراشدین، ص: ٦، ۸، ۶۴، ۱۱۰، ۲۱۰، ۲۶۲، ۲۹۵۔

پری کو ارکانی راجا نے یرغمال بنا کر ارکان لے گیا تھا، اب محمد ابن الحنفیہ کی بہادری کو دیکھ کر راجا نے ان سے التجا کی کہ آپ ارکانی راجا سے اس کی بیٹی کو واپس دلائیں، چنانچہ محمد ابن الحنفیہ نے ایک لشکر جرار کی قیادت کرتے ہوئے ارکان پر حملہ کردیا، سخت معرکہ کے بعد فتح وکامرانی نے آپ کے قدم چومے، کہتے ہیں کہ اس لڑائی میں بہتوں ارکانی وحشی مارے گئے اور بہتوں گرفتار ہوئے اور بہتوں نے راہ فرار اختیار کی تھی، لڑائی کے نتیجے میں خیرہ پری رہائی ہوئی تو اس سے ابن الحنفیہ کی شادی ہوئی تھی، مزید یہ کہ جتنے وحشی گرفتار ہوئے وہ اسلام کے حلقہ میں داخل ہوگئے اور جو لوگ فرار ہوئے ان کے متعلق آپ نے ''ثم'' کہا، یعنی انہیں بعد میں پکڑا جائے گا، کہا جاتا ہے کہ آج کل کے ارکان اور بنگلادیش کے درمیان پائے جانے والے پہاڑی قبائل ''ثاکموا'' ان فرار ہونے والوں کی اولاد ہیں، جن کے متعلق ابن الحنفیہ نے ''ثم'' کہا تھا، ان باتوں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ سرزمین ارکان میں اسلام صرف اور صرف دعوت وتبلیغ سے نہیں پھیلا بلکہ یہاں دین وایمان کی اشاعت اور کلمۂ توحید کی سربلندی کے لئے حق وباطل کی جنگیں بھی لڑی جاچکی تھیں۔

یہاں مسلمانوں کے بسنے اور اس سرزمین میں اسلام مستحکم ہونے کے بعد بڑی تعداد میں مگدھی بدھوں کا دخول ہوا، اس کے تھوڑے عرصہ بعد ۹۵۰ء میں منگولوں نے چڑھائی کردی، منگولوں نے اس سرزمین کو تاراج کیا، اور مگدھی بدھوں نے ان وحشیون کا ساتھ دیتے ہوئے اس ملک کو خوب لوٹا، اور یہاں کی ہندو مملکت کو تباہ وبرباد کردیا تھا، مورخین کے بیان کے مطابق بعد کے مسلسل پانچ صدیوں کو تاریخ ارکان کا تاریک دور مانا جاتا ہے۔

بعد ازاں ۱۴۰۳ء میں برمی غاصب راجا من کھاؤن نے ارکان پر یلغار کردیا، اور یہاں کے ہندو راجا من سامون (بعد کے سلیمان شاہ) نے فرار ہوکر بنگال کی غوری سلطنت میں پناہ لی، یہاں وہ مسلسل ستائیس سال رہے،، وہ اسلام سے متاثر ہوکر حلقہ بگوش دین اسلام ہوئے، چنانچہ سلیمان شاہ ان کا نام ٹھہرا، اس کے بعد غوری سلطان جلال الدین محمد شاہ نے ۱۴۳۰ء میں جنرل ولی خان کی قیادت میں ایک بھاری لشکر دے کر سلیمان شاہ کی مدد کی، باوجودیکہ جنرل ولی خان نے برمی غاصبوں کو مار بھگایا، لیکن سلیمان شاہ کو تختِ شاہی کی مسند پر بٹھائے بغیر ولی خان تختِ شاہی پر جلوہ افروز ہوگیا، اس کے

بعد کسی طرح سلیمان شاہ غوری سلطنت میں واپس پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

جنرل ولی خان نے یہاں اسلامی احکام نافذ کر دئے تھے، اور عربوں کی یاد میں سلطنت کا خوبصورت نام سرکاری طور پر ارکان رکھ دیا تھا۔

مگر غوری سلطان نے سندھی خان کی قیادت میں ایک بھاری لشکر دے کر سلیمان شاہ کی دوبارہ مدد کی، ویسے سندھی خانی افواج نے ولی خان کی سلطنت پر قبضہ کر لیا، جس کے بعد سلیمان شاہ ارکان کے تخت شاہی کے مالک بنے تھے ، جس کے بعد سلیمان شاہ نے پایۂ تخت وسالی سے منتقل کر کے مروہانگ (پتھری قلعہ) لے گیا، چونکہ جنرل ولی خان سلیمان شاہ کا دشمن تھا، ویسے اس نے اپنے دشمن کا منتخب کردہ نام ''ارکان'' کو پسند نہ کیا اور سلطنت کا سرکاری نام رحم سے مشتق کر کے روہانگ (۱) رکھ دیا تھا، بعد میں بنگالی زبان میں شعر وشاعری کرنے والے شاعروں نے اسے روہانگ، روشنگ وغیرہ لکھا تو اس ملک کا نام روشنگ بھی مشہور ہو گیا تھا۔

ظاہر ہے کہ روشنگ، روہانگ کے ماخذ اور ارکان کے ماخذ میں تطبیق کی کوئی گنجائش نہیں ہے، کیوں کہ ارکان کا ماخذ رکن اور روہانگ کا ماخذ رحم ہے، آج کل کے بعض ارکانی باشندے اس سرزمین کو رکھاپورہ جیسے من پسند لفظ سے مشتق کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے اس سرزمین کے نام کو توڑ مروڑ کر رکھائنگ اور رکائنگ پرے بتاتے ہیں، یہ لوگ خواہ مخواہ نامعقول اور ناجائز کوشش میں وقت خراب کر رہے ہیں، دراصل ارکان کا پرانا نام یا تو ارکان ہی ہے، یا رحم سے مشتق کردہ روہانگ ہے۔

اگر وہ لوگ خواہ مخواہ سرزمین ارکان کے نام کو رکھائنگ پرے ہونے کے دعویدار ہیں تو ان سے میرا ایک مشورہ رہے گا کہ وہ رکھائنگ پرے کے ماخذ کو ارکان سے مشتق مان لینے کی تکلیف گوارہ کریں،، خیر جو کچھ بھی کیوں نہ ہو کہ اگر ارکان کا نام ارکان ہے تو ٹھیک ہے ، اگر اس کا نام رکھائنگ پرے

(۱) تاریخ میں ایک کہانی جو شہرت میں سورج جیسی ہے کہ کہتے ہیں کہ عربوں کا ایک تجارتی قافلہ جزیرۂ رامبری کے قریب بحری حادثہ کا شکار ہو گیا تھا، ان میں سے بہتوں تو مارے گئے اور بہتوں لوگوں نے جان بچاتے ہوئے رامبری میں پناہ لی، مقامی وحشیوں نے ان سے برا سلوک کرنا چاہا تو انہوں نے وحشیوں کے سامنے رحم رحم کہتے ہوئے اچھے سلوک کی التجا کی تھی، ویسے مقامی باشندوں نے انہیں پناہ دی، تب سے ان لوگوں کو رحمی سے پکارے جانے لگا۔

یا روہانگ مانتے ہیں تو بھی اس سرزمین کے نام مسلمانوں کی تاریخ سے متعلق ہے۔

بہر حال تاریخ ارکان سلیمان شاہ کے ہاتھوں بنیاد پڑی ہوئی سلطنت کو مرد کو سلطنت کہتی ہے، یہ سلطنت ۱۴۳۰ء سے شروع ہو کر ۱۷۸۴ء تک چلتی ہے، جس میں ۴۸/ تاجدار تخت وتاج کے مالک بنے تھے، باوجود یکہ اس سلطنت کی بنیاد ایک مسلمان کے ہاتھوں پڑی تھی، مگر اس میں بہتوں غیر مسلم تاجدار (مگر وہ بھی مسلمانوں کے زیر نگین) تخت شاہی کے مالک بنے تھے، بہر کیف اس سلطنت کے چند نامور مسلم تاجداروں کے نام درج ذیل ہیں:

ارکان کے چند نامور مسلم تاجدار سلطنت

عدد	مسلمان بادشاہ	سن عیسوی	سن عیسوی
۱	سلیمان شاہ	۱۴۰۴	۱۴۳۴
۲	علی خان	۱۴۳۴	۱۴۵۹
۳	کلمہ شاہ	۱۴۵۹	۱۴۸۲
۴	منکوشاہ	۱۴۸۲	۱۴۹۱
۵	محمد شاہ	۱۴۹۱	۱۴۹۳
۶	نوری شاہ	۱۴۹۳	۱۴۹۴
۷	شیخ مقدول شاہ	۱۴۹۴	۱۵۰۰
۸	علی شاہ	۱۵۰۹	۱۵۱۳
۹	جلال شاہ	۱۵۱۳	۱۵۱۵
۱۰	ایل شاہ آزاد	۱۵۱۵	۱۵۲۱
۱۱	الیاس شاہ	۱۵۲۳	۱۵۲۵
۱۲	علی شاہ	۱۵۲۵	۱۵۳۱
۱۳	سلطان زبوک شاہ	۱۵۳۱	۱۵۵۳

۱۴	سکندر شاہ	۱۵۷۱	۱۵۹۳
۱۵	سلیم شاہ	۱۵۹۳	۱۶۱۲
۱۶	حسین شاہ	۱۶۱۲	۱۶۲۲
۱۷	سلیم شاہ	۱۶۲۲	۱۶۳۸

۱۶۶۰ء میں مغل شہزادہ شجاع ارکان پہنچا، اس وقت کے ارکانی راجا سند سودھمہ نے شہزادہ سے ایک بحری جہاز فراہم کرنے کا وعدہ کیا تھا، جو اسے مکہ پہنچائے گا، یعنی مکہ معظّمہ میں وہ اپنی زندگی کے آخری ایام گزارنا چاہتا تھا، لیکن سند سودھمہ نے مغل شہزادہ کو اپنے اہل وعیال اور اس کے بہتوں ساتھیوں سمیت قتل کر دیا، تو اس کے بعد ارکان کے بادشاہوں اور مغلوں کے درمیان ایک جنگ کی فضاء قائم رہی، اور شہزادہ کے قتل کے بعد ارکان کی دو ہمسایہ قوموں کے باہمی تعلقات میں پہلے جیسی ہم آہنگی بھی باقی نہ رہی، چنانچہ اس سازگار حالت وموقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے برمی راجا بدھو پھیا نے ارکان پر حملہ کر دیا تھا، یہاں سے ارکان غلامی کی زنجیر میں بند ہوگیا۔

بدھو پھیا نے ۱۷۸۴ء میں ارکان کو مکمل قبضہ کر لیا (۱) بودھو پھیا نے ارکان کو تاراج کیا، یہاں کے بہتوں بڈھسٹ اور مسلم باشدے فرار ہوکر بنگال چلے گئے، لاکھوں کو تہ تیغ اور لاکھوں کو قید خانے کی اندھیری میں غرق کر دیا گیا، بہتوں مدرسے، خانقاہیں اور مساجد شہید کر دی گئیں، بدھوں کا مقدس مہامنی مجسمہ بھی مقامی بدھوں کے شدید احتجاج اور ناراضگی کے باوجود اٹھا کر برما لے جایا گیا۔

پھر ۱۸۲۳ء میں انگریزوں نے بعض عذرہائے لنگ کا سہارا لے کر ارکان پر چڑھائی کر دی، جس کے بعد مختصر سی انگلو برمن جنگ لڑی گئی تھی، اور ارکان پر قبضہ کرنے کے بعد برطانوی حکومت نے برما پر مسلسل حملے جاری رکھے، پھر برما پر مکمل قبضہ کرنے کے لئے ۱۸۲۴ء، ۱۸۵۲ء اور ۱۸۸۵ء کو حملے کئے گئے تھے، چنانچہ موخر الذکر حملہ برما کے سقوط کا باعث بنا، ویسے برما مکمل طور پر برطانیہ کے قبضہ میں جا چکا تھا۔

بعد ازاں دوسری عالمی جنگ چھڑ چکی تو جاپان نے عظیم تر ایشیا کی باہمی خوشحالی کا پرکشش نعرہ لگایا اور

(1).D.GE Hall History of South East Esia 4th Edition P:222.223.

برطانیہ کو دھکیل کر برما قبضہ کر لیا تھا، ارکان پر برما کے قبضہ کے دوران مگھ بدھوں نے برمی اوباشوں کی مدد وتعاون سے مسلمانوں کی زبردست قتل عام کیا تھا، حکومت ناکام تھی، کوئی حملوں کو روکنے والا نہ تھا، چنانچہ اس موقع میں ایک لاکھ سے زائد مسلمان شہید کئے جا چکے تھے۔(۱)

پھر برصغیر ہندوستان کی طرح برما اور ارکان میں بھی برطانیہ سے آزادی کے لئے جدوجہد ہوئی تو بالآخر ۴/جنوری/۱۹۴۸ء کو برطانیہ نے برما کی آزادی کا اعلان کر دیا، اب برمی حکام نے بطور خاص ارکان کے روہنگیا مسلمانوں کو مشکوک شہری ہونے کا جھوٹا الزام لگا کر انہیں دانستہ طور پر آزادی کے حق سے محروم کر دیا، مسلمانوں نے اس لا انسانیت کے خلاف شدید احتجاج کیا، مگر ان کی جائز آواز بالکل سنی نہیں گئی، تو ارکانی مسلمانوں نے ان بربروں سے آزادی حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا اور محمد جعفر حسین قوال کی قیادت میں تحریک آزادی کی جدوجہد شروع کر دی، اور ارکانی مسلمانوں کی تحریک آزادی مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے اب تک جاری ہے، خدا کرے کہ یہاں کے مسلمان اپنے مقصد حاصل کرتے ہوئے برمی اوباشوں کے مظالم سے نجات حاصل کر لے۔

(۳) اردو دائرۃ المعارف الاسلامیہ، جلد چہارم، ص: ۲۵۰۔ ۲۵۲۔

ارکان میں بنگلا زبان وادب

تاریخ اسلام سے واقفیت رکھنے والوں کے یہاں یہ بات مخفی نہیں ہے کہ جنوب مشرقی ایشیا کی تاریخی سرزمین ارکان ایک آزاد ریاست اور کسی زمانہ میں ایک آزاد مسلم مملکت تھی، باوجودیکہ یہاں کے مسلمان نسلی اعتبار سے متنوع ہیں مگر عقیدہ، مسلک اور مذہبی اعتبار سے ان کے مابین کسی قسم کا اختلاف نہیں بلکہ ہم آہنگ ہیں، باوجودیکہ یہاں کے مسلمان نسلی اعتبار سے عربوں، فارسوں، ترکوں، مغلوں، ہندوستانیوں، یمنیوں، عراقیوں غرض دنیا کے مختلف گوشوں اور نسلوں کے سنگم کا نام ہیں، مگر ۱۴۳۰ء کو بنگالی غوری حکومت کے تعاون سے یہاں جب مسلم مملکت کی بنیاد پڑی تو ایک طرف طبعی اور جغرافیائی حیثیت سے بنگال سے قریب ہونے، دوسری طرف مسلم حکمرانی کے ساتھ ساتھ باوقار سرکاری عہدوں میں بنگالی مسلمانوں کی موجودگی اور ان کی بنگالی زبان وادب سے دلچسپی کی وجہ سے بہتوں بنگالی مسلمان اور بنگالی شعراء یہاں آبسے تھے، ویسے بہت ہی کم مدت میں یہاں کے غیر بنگالی مسلمانوں میں بھی بنگلہ زبان وادب کے ساتھ دلچسپی بڑھی تھی، حتی کہ چاٹگامی بنگلہ زبان یہاں کے مسلمانوں کی قومی زبان بن گئی، ویسے ملک کے شعراء اور پنڈٹ حضرات اور ارباب بست وکشاد کے علاوہ شرفاء کی چاٹگامی زبان میں عربوں کی عربی، فارسیوں کی فارسی، ترکوں کی ترکی، ہندوستانیوں کی ہندی غرض دنیا کے مختلف مسلم زبانوں کے خوبصورت الفاظ وتعبیرات اور لہجے ان کی زبان میں داخل ہوگئے۔

ان متنوع زبانوں کی خوبیوں، الفاظ وتعبیرات نے یہاں کے مسلمانوں کی زبان کو خوب سے خوب تر بنا دیا، اگرچہ ابھی تک یہاں کے مسلمانوں کی زبان کا ایک علیحدہ رسم الخط سرکاری طور پر منصۂ شہود پر نہ آسکا، مگر سچ تو یہ ہے کہ اگر ان مسلمانوں کی زبان میں گہری نظر ڈالی جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ دنیا کی مختلف مسلم قوموں کی ملاوٹ سے بنی ہوئی ارکانی مسلم زبان بہت اونچی اور بڑی تونگر زبان ہے۔

مسلم حکمرانی کی ابتداء سے ارکان میں بنگلہ زبان وادب کا چرچا ہوا، اور بہت کم مدت میں یہاں کے مسلمانوں نے چاٹگالی بنگلا زبان کو اپناتے ہوئے اسے اپنی قومی زبان مان لیا، اسی زمانے سے لے کر اب تک یہاں بسنے والے مسلمانوں کی زبان چاٹگالی زبان ہی جیسی ہے۔

بنگال کے دیگر علاقوں سے کم لیکن چاٹگام سے بڑے بڑے شعراء ارکان کے راج دربار میں پہنچے تو یہاں کے مسلمانوں کے ذوق شاعری میں رنگ بھرا اور آہستہ آہستہ بنگلہ رسم الخط میں لکھنے کا دور شروع ہوگیا تھا، حتی کہ ایک زمانہ ایسا بھی آیا تھا کہ بنگلہ زبان وادب خود بنگال میں اگرچہ مظلومیت کا شکار ہوگیا لیکن وہ یہاں آکر گویا حکمران بن گیا تھا، یوں تو سرزمین ارکان میں بڑے بڑے شعراء اور پنڈت پیدا ہوئے مگر زبان وادب اور شعروشاعری کے حلقوں میں بنگال اور چاٹگام سے پہنچنے والے شعراء اور پنڈتوں کا وزن اور وقار یہاں ہمیشہ برقرار رہا تھا، جہاں تک تاریخ سے پتہ چلا کہ الاول، دولت قاضی، ناصرالدین مردن جیسے شعراء سرزمین ارکان کے حلقۂ زبان وادب کی جان وجگر تھے، یہ وہ شعراء تھے کہ جو بنگلا زبان وادب سے مرتے دم تک جدا نہ ہوئے، اور جنہوں نے بنگلا زبان و ادب اور شعروشاعری کو اپنی جان وجگر بنا رکھا، ان کی خدمات نے بنگلہ زبان وادب کو ارکان کی مسلم قوم کی قومی زبان بنا دیا، مورخین کے ہاں سے ہاں ملاتے ہوئے ہم بھی یہ کہہ سکتے ہیں کہ بنگال میں بنگلہ زبان وادب کی قدر جتنی نہیں تھی اس سے زیادہ قدر اس کی ارکان میں ہوئی تھی (۱) اس کی چند وجوہات میں سے ایک یہ بھی تھی کہ اس زمانہ میں سلطنت ارکان امن وسکون، سلامتی وطمانیت کا مرکز بن گئی تھی، جب کہ بنگال فتنہ وفساد، خانہ جنگی وغارت گری، لوٹ کھسوٹ سے پامال ہو چکا تھا، پرتگیز اور مگھ ظالموں نے یہاں کے باشندوں کی نیند حرام کر رکھی تھی، یوں بنگال ہر اعتبار سے مصیبت کا شکار ہوا چکا تھا، جس سے نجات گویا یہاں کے باشندوں کی بس کی بات نہ تھی، سچ تو یہ ہے کہ اگر بنگال میں مغلوں کی آمد نہ ہوئی ہوتی تو یہاں کے باشندے ان قزاقوں اور لٹیروں کے وحشیانہ سلوک سے شاید نجات پاسکتے۔

ستارھویں صدی عیسوی میں بنگلہ زبان وادب کا چرچا بنگال میں نہ ہو پا رہا تھا، اور اس صدی کی تاریخ اور حالات سے جہاں تک پتہ چلا کہ بنگلہ زبان وادب کا چرچا صرف ارکان میں ہو رہا تھا، چنانچہ اس حوالے سے جناب نورالاسلام مانیک رقمطراز ہیں کہ:

---

(1) نورالاسلام مانیک، عظیم شاعر الاول، ص:۱۔

’’مگر پوری ستارھویں صدی عیسوی میں ہمارا ملک بنگال مطلق العنانی کا شکار تھا، اس وجہ سے یہاں زبان وادب اورفکروفن کا چرچا بالکل نہ ہوسکا تھا، اوراسی صدی میں بنگلہ زبان وادب کا جتنا چرچا ہوا وہ صرف روشنگ (ارکان) میں ہوا تھا، اور اس صدی کے جتنے ادبی سروسامان ہم تک پہنچے وہ سب سرزمین ارکان کا عطیہ اور یہاں کے مسلمانوں کا مرہون منت ہے۔(۱)

آگے چل کر جناب نورالاسلام صاحب پھر رقم طراز ہیں کہ:

’’مگر بڑی تعجب کی بات ہے کہ بنگلہ زبان وادب کا باوجودیکہ ارکان میں چرچا ہوا مگر وہاں کی دوسری بڑی اقلیت بدھوں کی تہذیب وثقافت، رسم ورواج کے اثرات سے بالکل محفوظ رہا، آخر تک بنگلہ زبان وادب میں اسلام ہی کا رنگ چھایا رہا، اور ہراعتبار سے مسلمانوں کی تہذیب وثقافت، دین ومذہب کا آئینہ داررہا‘‘(۲)

سرزمین ارکان کی تاریخ سے یہ بھی پتہ چلا کہ نرمیخلا (سلیمان شاہ) ہی نے بنگا سے واپس ہوتے وقت بنگلا زبان وادب اپنے ساتھ ارکان لے گیا تھا، اس نے بنگال سے اپنی واپسی کے وقت وہاں سے بڑے بڑے شعراء اورانشاء پرداز اور پنڈت حضرات کو اپنے ساتھ ارکان لے گیا تھا، ساتھ ہی ساتھ سلیمان شاہ نے غوری سلطان جلال الدین شاہ کے دربار کے ہرایک انداز واطوار کو اخذ کیا تھا، ان کی چاہت تھی کہ وہ بھی غوری سلطان کی طرح اپنے دربار کو عالموں، پنڈتوں، شاعروں، گیانیوں سے سجائے، آخر تک وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہو گئے تھے، اوراپنے دربار کو ادباء، شعراء اور پنڈتوں سے مالامال کرلیا تھا، چنانچہ یہاں سے ارکان میں بنگلہ زبان وادب کا دورشروع ہوا تھا۔

یہاں ایک بات یادرکھنے کی ہے کہ ارکان میں مسلم حکمرانی کے دوران بنگال کے دیگر علاقوں سے زیادہ چاٹگامی شعراء ارکان پہنچے تھے، اس کی چند وجوہات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ایک صدی تک

(۱) نورالاسلام مانیک،عظیم شاعرالاول،ص:۳۰۔
(۲) نورالاسلام بانیک،عظیم شاعرالاول،ص:۳۰۔

چاٹگام ارکانی مسلم مملکت کا ایک روشن حصہ رہا تھا، اورارکان کے راج دربار کے بڑے بڑے وزراء اور ارباب بست وکشاد بھی اکثر چاٹگامی مسلمان ہی تھے، جن میں مگن ٹاکور، سیدموسی، اشرف خان وغیرہ قابل ذکر شخصیات ہیں، ویسے ایک طرف خود چاٹگام ارکانی مسلم مملکت کے ایک حصہ ہونے اور دوسری طرف چاٹگامی مسلمانوں کی کثرت شرکت سلطنت کے بڑے بڑے عہدوں میں ہونے کی وجہ سے چاٹگامی نژادشاعروں کی قیمت میں یہاں اضافہ ہوگیا تھا، اور ظاہر ہے کہ سلطنت کے بڑے بڑے عہدوں میں چاٹگامی مسلمانوں کی شرکت نے یہاں بنگلہ زبان وادب کی ترقی اورتطویر کا راستہ صاف کر دیا تھا، چنانچہ اس حوالے سے ڈاکٹر عبدالکریم صاحب رقمطراز ہیں کہ:

’’چاٹگام اورارکان مل کر روشنگ راج بنا، درحقیقت بنگال کے ایک حصہ کے لوگ وں نے اس وقت اپنے ملک کے دارالسلطنت میں بیٹھ کر بنگلا زبان وادب کا چرچا کیا تھا، دوقومیت یعنی مگھ اور مسلمان دونوں اس ملک کے باشندے تھے، اور چاٹگامی شعراء بھی ظاہر ہے کہ اس ملک کے باشندے تھے، مطلب یہ ہے کہ ملک کے شعراء ہی نے ملک کے دارالسلطنت میں بیٹھ کر اپنی زبان وادب کا چرچا کیا تھا‘‘(۱)

ادھرامرتولال بالا اپنی کتاب، الاول کے کلام میں ہندومسلم ثقافت میں شوکمارشن کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

’’چاٹگام میں حسین شاہی گورنرفراغل خان اوراس کے بیٹا نصرت خان نے غوری دربار کی طرح ان کے دربار کو بھی شعروادب اورفکروفن سے آراستہ کرنے کی کوشش کی تھی، مگراس وقت یہاں قحط الرجال کا دورتھا، البتہ بعد میں ارکانی راجدان میں قابل ذکر ادب وثقافت کا جودوردورہ ہوا تھا، یہ ان دونوں کی پچھلی جدوجہد کا نتیجہ تھا، بہرحال جوکچھ بھی کیوں نہ ہو کہ بنگالی شعراء کی جدوجہد کا نتیجہ سب سے پہلے ارکان کے دارالسلطنت سے نکلا تھا‘‘(۲)

(۱) ڈاکٹر عبدالکریم، عبدالکریم ساھتیہ بیشارد، حیات وکارنامے، ص:۲۲۱۔
(۲) امرتولال بالا، الاول کے کلام میں ہندومسلم ثقافت، ص:۵۷۔

دراصل ارکان کے دارالسلطنت میں بنگالی زبان وادب کی پشت و پناہی کی گئی تھی، بنگلہ زبان وادب کی یہاں اتنی قدر کی گئی کہ جتنی اس کے لئے ضرورت تھی، جس سے ایک خوبصورت اور باوزن ادبی اور ثقافتی ماحول وجود میں آیا، یوں ایک اچھی نسل کا نشوونما یہاں ممکن ہوں سکا تھا۔

ساھتیہ بیشارد کا عظیم کارنامہ

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ تہذیب وثقافت کی مدبھری آواز کو کوئی بھی دبا نہیں سکتا، وہ چند دن کسی مصیبت کی ذمی بنی بھی تو وقت آتے ہی پھر سے فضاؤں میں گونجنے لگتی ہے، سرزمین ارکان میں مسلم حکومتوں کے تہ بتہ زبان وادب، تہذیب وثقافت کا جو ایک سنہرا دور چلا، باوجودیکہ زمانے کی تند وتیز ہواؤں نے اسے اپنے آغوش میں لے رکھا تھا، مگر ایک دن ایسا بھی آیا کہ بعض سراغ رسانوں کے ہاتھوں اس دور کا زیادہ نہ ہوتو کچھ پتہ ضرور چل گیا، سرزمین ارکان سے مسلم حکومت کے زوال کے بعد برمی اوباشوں اور غاصبوں کے مسلسل حملوں اور بالآخر اس پاک زمین پر ان وحشیوں کے قبضہ کے بعد اسلامی تہذیب وثقافت، زبان وادب کا وہ روشن دور جس نے نہ صرف ارکان بلکہ بنگال و برما کو بھی روشن اور تاباں کردیا تھا کی ساری روایات تقریباً ختم ہوگئی تھی، مگر بیسویں صدی میں بعض ایسے ادباء اور سراغ رساں مورخین میدان میں آ نکلے، جنہوں نے اس تاباں روایات اور روشن داستان کی سراغ رسانی کرنے کی کوشش کی، ان سراغ رسانوں میں مولوی عبدالکریم ساھتیہ بیشار پٹیوی سرفہرست ہیں، انہوں نے نہ صرف سرزمین ارکان کی تاریخ کے بعض اندھیرے گوشوں کا کھوج لگایا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ انہوں نے سرزمین ارکان اور اس کی تاریخ پر بڑا احسان بھی کیا ہے، جہاں تک میں جانتا ہوں کہ انہوں نے ہی ان نایاب گوشوں کی تلاش کرنے کی ابتداء کی تھی، اور ان کے بعد اس حوالے سے کام کرنے والوں کی ایک مجلس تیار ہوگئی تھی، ان کی اس روشن خدمت کے بعد بنگال میں چند سراغ رساں مورخ نکل آئے جنہوں نے خود موصوف کے کارناموں کے بعض اندھیرے پہلوؤں پر روشنی ڈالی تھی۔

عبدالکریم ساھتیہ بیشارد روشن خیال، دل درمند اور فکر ارجمند کے مالک انسان ہونے کے ساتھ ساتھ ایک باحوصلہ نقاد اور عالی ضمیر ادیب اور دور اندیش سراغ رساں بھی تھے، جنہوں نے بنگلا زبان وادب کے بعض اندھیرے اور انجان پہلوؤں پر روشنی ڈالی تھی، آپ کے ہی احسان بنگلا زبان وادب کے حاملین کو نہ صرف اعتراف ہے بلکہ آپ کی خدمات کو اعتراف نہ کرنے والوں کو احسان فراموش بھی

کہتے ہیں، عبد الکریم صاحب نے بڑی جانفشانی اور تگ و دو سے پرانی بنگالی زبان اور ادب کے ان بیش بہا خزانوں کو جنہیں عام زبان میں ''فوتی'' کہا جاتا ہے اور جو عام بنگالی مسلمانوں کے گھر گھر میں کس مپرسی کی حالت میں پڑی ہوئی تھی کو کوچ نکالا تھا، اس سلسلہ میں آپ سرزمین بنگال کے اس سرے سے لے کر اس سرے تک کا سفر کیا، بنگالیوں کے در در میں پھیرا، اور جہاں کہیں بھی ایک پرانی ''فوتی'' کی خبر ملی جلد وہاں پہونچ گیا تھا، ان کی یہ خدمت ضرور قابل دید بھی ہے اور قابل داد بھی، ان کی یہ انمٹ خدمت جب تک بنگلہ زبان و ادب اس جہاں میں رہے گا تب تک روشن اور تاباں رہے گی، ان کی یہی انمٹ کوشش و خدمات نے ان کی زندگی کو بھی روشن کیا اور ان کے نام میں چار چاند بھی لگائے۔

مورخین کے مطابق عبد الکریم صاحب کا یقین تھا کہ بنگالیوں کے گھر گھر میں بنگلہ زبان و ادب کے گنجہائے گرانمایہ کس مپرسی کے حالات میں چھپے ہوئے ہیں، اگر انہیں نکال کر اشاعت کیا جائے تو بنگلا زبان و ادب پر بڑا احسان ہوگا، جس سے بنگلہ زبان و ادب میں بہت بڑا قابل دید اضافہ بھی ہوگا، جس سے اس زبان کی قیمت اور وزن بڑھ جائے گا، وہ یہ بھی یقین رکھتے تھے کہ بنگلا زبان و ادب کے شعراء جنہوں نے فوتی کے طرز و طریقہ اور انداز و اطوار سے زبان و ادب کی خدمت کی تھی، وہ سارے کے سارے لعل و گہر سے بھی قیمتی تھے، اگر ان کی زندگی اور ان کے کارنامے اس وقت منصۂ شہود پر نہ لائے جائیں، تو ان کی یاد تک باقی نہیں رہے گی، اور رفتار وقت کے ساتھ ساتھ ان کے نام بھی دنیا سے ختم ہو جائیں گے، وہ کہتے تھے کہ:

''ان لعل و گہر سے بھی زیادہ قیمتی شعراء اور ان کے کارناموں سے جس طرح آج لوگ ناواقف ہیں، اسی رفتار وقت کے ساتھ ان کے نام تک سے لوگ نادان ہو جائیں گے، یوں آنے والی نسل اپنے آباؤ اجداد کی خدمات سے ناواقف ہو جائے گی''۔

اس لئے انہوں نے ان شعراء کی زندگی اور خدمات و کارناموں کو کھوج نکالنے کی راہ میں اپنی زندگی وقف کر رکھی تھی، اس سلسلے میں گاؤں گاؤں اور گھر گھر پھرے تھے، اور ان شعراؤں کے مخطوط دواوین کی ایک بیش قیمت لائبریری تیار کر لی تھی۔

ایک روز کا واقعہ ہے کہ آپ اپنے گھر میں ان مخطوط نسخوں پر نظر ڈال رہے تھے، کہ اچانک ایک مخطوطہ پر نظر پڑی، آپ نے جلد اسے نکالا اور مطالعہ میں مشغول ہوگیا، دراصل یہ ایک ایسا منظوطہ تھا کہ جس نے آپ کو حیران کر کے رکھ دیا تھا، ان کا سارا جسم تھر تھرا اٹھا تھا، ان کے خیالات کی نئ دنیا آباد ہوگئی تھی، معلوم ہو رہا تھا کہ نسخہ کے ہر ایک سطر میں اور سطروں کے ہر ایک لفظوں میں نئ نئ زندگی بھری ہوئی ہے، ان کا دماغ سوچ رہا تھا کہ ایسے قیمتی اور لعل و گہر سے بھرے پڑے کلام تو زندگی میں کبھی نہیں دیکھا گیا، ساری زندگی تو اس راہ میں صرف کر دی گئی، مگر ایسے گنجہائے گرانمایہ اور کہیں نہیں پائے گئے، ویسے ان کے جذبات امنڈ پڑے، ان کے سامنے حیرت کا عالم چھا گیا تھا، اور یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ آیا ایسے ایسے شعراء بھی بنگلہ زبان و ادب میں پیدا ہو سکتے ہیں؟ جو ایک دنیا کو دھنگ کر سکتے ہوں، اندھیاری کو روشنی سے اور روشنی کو عطر مجموعہ سے بھر سکتے ہوں، دراصل اس شاعر کے کلام کے ہر ایک سطروں میں جادو بھرا تھا، ہر ایک الفاظ میں درحقیقت انسان کے جذبات و خیالات، شعور و احساسات کو جگانے والے منتر تھے، جس نے کریم صاحب کے پورے جسم کو تھر تھرا دیا تھا، اب انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اس عظیم شاعر کے نامعلوم خدمات کو روز روشن کی طرح عیاں کر دیں گے، ان کے ہر ایک کلام کے ہر ایک سطروں اور سطروں کے ایک ایک الفاظ پر نظر ڈالیں گے۔

مگر وہ کون شاعر تھا کہ جس نے کریم صاحب کی زندگی کے تمام تر خیالات کو بدل کر رکھ دیا ہو؟ جس کے مدبھرے کلام نے ان کے جسم میں جادو کا کام کیا ہو؟ جس کے کلام کے داخلی اور خارجی موسیقی نے ان کو محو حیرت میں ڈال کر مخمور و مسحور کر دیا ہو؟۔

اب ان کے یہاں ایک سوال پیش آیا کہ وہ شاعر تو بنگلا زبان کا شاعر ہے، آیا وہ بنگال کا کوئی شاعر ہے یا خارج بنگال کا؟، اور ساتھ ہی ساتھ یہ سوال بھی ان کے دہلیزِ دل پر دستک دے رہا تھا کہ آیا بنگال کے باہر بھی بنگلا زبان والا ایسا شاعر پیدا ہو سکتا ہے؟ آیا کبھی بنگال کے باہر بھی کہیں ایسی بنگالی زبان اور ایسے بنگلا ادب کا چرچا ہوا تھا؟ اگر وہ بنگالی نہیں تھا تو کیا بنگالی لوگ ایسے شاعر سے واقف ہیں؟ غرض اس شاعر کے متعلق کریم صاحب کی واقفیت بڑھتی گئی تو ان کو یہ فیصلہ لینا پڑا کہ وہ نہ کوئی حالیہ بنگال کا شاعر تھا اور نہ اس نے بنگال والوں کو اپنے ایسے بیش قیمت کلام سنایا تھا، یہ شاعر تھا ایک

ایسی سرزمین کا جہاں کسی زمانے میں بنگلا زبان وادب، شعروشاعری کا چرچا تھا، جہاں ایک زمانے میں اسلام اور اہل اسلام کی عزت وشوکت تھی، جہاں کے لوگوں نے بنگلا زبان وادب کو اپنے دل و جان سے بھی زیادہ پیار کیا تھا، اور وہ تھا ہمارا ممدوح اور محبوب شاعر حضرت صوفی الاول رحمہ اللہ علیہ۔

آگے چل کر عبدالکریم ساھتیہ بیشارد نے دیکھا کہ سرزمین ارکان جسے کسی زمانے میں روشنگ بھی کہا جاتا تھا، اس میں بنگلہ زبان وادب کا کسی زمانے میں خوب چرچا رہا تھا، الاول کے زمانے میں یہاں بنگلہ زبان وادب کا ایسا دوردورہ تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ملک بنگال کا ہی ایک صوبہ رہا ہو، یہاں ایسے ایسے شعراء پیدا ہوئے تھے کہ کسی زمانے میں خود بنگال بھی زبان وادب کے حوالے سے اس ملک کا خوشہ چیں ہوگیا تھا، اسی زمانے میں ارکان بنگلا زبان وادب کا مرکز بن چکا تھا، یہاں کے شعراء کی زبان ایسی بلند، خیالات ایسے روشن اور جذبات ایسے پاک وصاف تھے جس سے کوئی بھی یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ درحقیقت اس زمانے میں یہاں اسلام اور مسلمانوں کی شوکت تھی، اور اسلام کے پاکیزہ جذبات وخیالات کے چاپ نے زبان وادب کو اوج کمال پر پہنچادیا تھا، یہاں ایسے ایسے شعراء پیدا ہوئے کہ جنہوں نے زبان وادب کو آسماں پر پہنچادیا تھا۔

عبدالکریم صاحب نے دیکھا کہ سرزمین ارکان کے وہ شعراء جنہوں نے بنگلا زبان وادب کو آسمان سے ہم کلام کردیا تھا، ان کی ساری خدمات ''فوتی'' کی شکل میں مخطوط پڑے ہوئے ہیں، اب ان کے لئے ضروری ہے کہ ایسے شعراء کے سارے مخطوط نسخوں کو دنیا کے سانے لایا جائے، اور دنیا کو دکھادیا جائے کہ سرزمین ارکان ایسی ایک سرزمین ہے جہاں بنگلہ زبان وادب اور شعروشاعری کے انمول ہیرے پیدا ہوئے تھے، ان کی زبان سے ایسے ایسے موتیاں نکلے جو اس وقت بھی انمول تھے اور اب بھی انمول ہیں، اور خدا کرے تو اگلے دن بھی انمول رہیں گے، انہوں نے یہ بھی سوچا کہ ایسے ایسے ستاروں کو دنیا کی نظروں سے اوجھل رکھنا یہ ستاروں کی ناقدردانی کی دلیل ہوگی، اور اب ضروری یہی ہے کہ ان ستاروں کو دنیا کی نظروں میں لایا جائے، اگر لوگ انہیں خرید نے سے قاصر بھی رہیں تو بھی دیکھ دیکھ کر نظر ٹھنڈی کرسکے۔

دوسری طرف عبدالکریم صاحب کو یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی تھی کہ ارکان کے راج دربار میں جتنے شعراء

رہا کرتے تھے وہ دنیا کے عام درباری شعراء کی طرح نہیں تھے، ان کے مقاصد میں سیم وزر نہیں تھا، بلکہ ان کا مقصد صرف اور صرف دنیا والوں کو راہ دکھانا تھا، بادشاہ سمیت لوگوں کو گمراہی کی تنگ وادی سے نکال کر روشنی کی ایک وسیع وعریض دنیا میں لاناتھا، لوگوں کو جہالت ونادانی کی اندھیاری سے نکال کر علم و حکمت، فکروفن کے روشن میدان میں لاناتھا، ان شعراء میں حضرت صوفی الاول کے نام گرامی نہ صرف سرفہرست ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ دولت قاضی کے بعض بنیادی کارناموں سے صرف نظر کرکے کہا جائے تو الاول ہی نے اپنی کاوشوں کے ذریعے ارکان میں اس قسم کی جدوجہد کی بنیاد رکھی تھی۔

اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ دولت قاضی اور الاول کے ہمدوش نہ سہی مگر ارکان میں ان کے علاوہ بھی بڑے بڑے شعراء اور انشاء پرداز پیدا ہوئے تھے، جن میں سے بعض شعراء کے تذکرے تو ڈاکٹر عبدالکریم ساھتیہ پیشارد وغیرہ کی کاوشوں میں ہوپائے، لیکن سچ تو یہ ہے کہ اہل ارکان نے اپنے بزرگوں کے تذکرے اور کارناموں کو زندہ نہیں رکھ سکا، جسے ارکان والوں کی تہی دامنی کہا جائے تو بے جانہیں ہوگا۔

ارکان اور چاٹگام میں اسلامی ثقافت وتمدن

تاریخ کی ورق گردانی سے اس بات کا بخوبی پتہ چلتا ہے کہ آٹھویں صدی عیسوی میں عرب لوگ تجارت کے حوالے سے ارکان اور چاٹگام آئے تھے، اس کے بعد اسلام کے ظہور اور بہتوں علماء، فضلاء، عارفین، صلحاء، دعاۃ ومرشدین دعوت دین اور اشاعت اسلام کی نیت سے ارکان اور چاٹگام آئے تھے، ان دعاۃ ومرشدین کی دعوت وتربیت کے نتیجے میں بہت تھوڑی مدت میں یہاں اسلام کا بول بالا ہوا، یہاں کی غیر مہذب قوم اسلام کے حلقہ میں داخل ہوگئی، ویسے یہاں اسلامی تہذیب، ثقافت اور تمدن کا دور دورہ شروع ہوگیا(۱) تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ اسی زمانے سے اس علاقہ کا رابطہ عرب ملکوں سے رہا، آٹھویں صدی عیسوی میں یہاں آبسنے والے ان عرب جن میں بہتوں تجار، کپتان، صوفی اور درویش تھے، پھر گیارہویں صدی عیسوی میں آبسنے والے ترکی، پٹھان، مغل اور غوری مسلمانوں کے ساتھ ارکان اور چاٹگام کے ہندؤوں کی شادیاں ہوئیں تو یہاں اسلام کی بڑی زور سے اشاعت ہوئی تھی۔

یہاں ایک بات قابل ذکر ہے کہ قدیم زمانہ سے لے کر چاٹگام، ارکان کا ایک غیر منقسم حصہ رہا تھا، تاریخ سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ ۲٦٦٦ قبل مسیح سے لے کر ۱۷۸۴ء تک سرزمین ارکان ایک آزاد اور خودمختار ریاست تھی، جس میں قابل ذکر چندرا خاندان، لنگریٹ خاندان اور مروکو خاندان کا راج رہا تھا (۲) یہ ایک عیاں حقیقت ہے کہ چاٹگام زمانوں تک ارکانی مروکو سلطنت کا ایک حصہ رہا(۳) اور ارکانی راجا حسین شاہ کے عہد حکومت میں چاٹگام اور ارکان میں بہتوں غوری یعنی بنگالی مسلمان آئے تھے، اس زمانہ میں

(۱) ڈاکٹر انعام الحق اور عبدالکریم ساھتیہ بیشارد، ارکان کے راج دربار میں بنگلا ساھتیہ ص:۳۔

(۲) امرتو لال بالا بحوالہ عاشق چودھری، الاول کے کلام میں ہندو مسلم ثقافت ص:۵٦۔

(۳) امرتو لال بالا، الاول کے کلام میں ہندو مسلم ثقافت ص:۵٤۔

اور اس زمانے میں بہتوں تجار، علماء، صلحاء، درویش، صوفیا دعاۃ ومرشدین چاٹگام کی راہ سے ارکان پہنچے، بطور خاص ان حضرات کی تربیت کے نتیجے میں یہاں اسلامی سماج قائم ہوگیا تھا(۱)۔

اگرچہ حسین شاہ کے عہد حکومت میں چاٹگام کے گورنر فراغل خان اور ان کے بعد ان کے بیٹا نے غوری راج دربار کی طرح اپنے دربار کو بھی علماء، صلحاء، پنڈتوں اور شعراء سے آراستہ کرنے کی کوشش کی تھی، مگر وہ ایک طرح ناکام ہوگئے تھے، تاہم بعد میں ارکان میں بنگلا ساھتیہ کا جو دور دورہ ہوا، اس میں ان دونوں کی روشن خدمات کا ہاتھ بھی رہا تھا(۲)۔

دسویں صدی عیسوی کے درمیانی مدت میں چاٹگام کا علاقہ اسلامی اور عربی تہذیب وثقافت بلکہ دین اسلام کے ماتحت ہوگیا تھا، اور دریائے میگنا اور ناف کے درمیانی علاقے میں ایک اسلامی حکومت قائم ہوگئی تھی، اور یہاں کے بادشاہ کو سلطان کہا جاتا تھا(۳) ویسے ارکان اور چاٹگام کے درمیان سیاسی، سماجی، ثقافتی، دینی اتحاد قائم ہو چکا تھا، اور فاتح ارکان سپہ سالار جنرل ولی خان نے جب برمی اوباشوں پر فتح حاصل کرکے یہاں اسلامی حکوت کی بنیاد رکھی تو ارکان میں اسلام کا جھنڈا بلند ہوا تھا، بعدازاں جنرل سندی خان کی قیادت وسیادت میں آنے والی مسلم افواج نے ولی خانی حکومت کا تختہ الٹ دیا تو ارکانی راجا نرمیخلا (سلیمان شاہ) تخت وتاج کا مالک بن گیا تھا، اب سلیمان خانی عہد حکومت اور ان کے بعد آنے والے مسلم حکمرانوں کے زمانے میں باوجودیکہ یہاں اسلام کا بول بالا رہا، مگر تاریخ کی روشنی سے کچھ ایسی ایسی جھلکیاں بھی ملتی ہیں کہ اگر جنرل ولی خانی حکومت بحال رہتی تو اسلام اور مسلمانوں کے لئے بہت اچھا رہا ہوتا، مروکو سلطنت کو بغور مطالعہ کے بعد ہم یہ کہنے پر مجبور ہوجاتے ہیں کہ باوجودیکہ مروکو سلطنت سے ایک مسلم سلطنت کی بنیاد پڑی تھی مگر اسے مکمل طور پر اسلامی حکومت کہنا آسان نہیں تھا، لیکن ولی خان کی حکومت ایک ایسی حکومت تھی، جسے اسلامی حکومت کہے بغیر اور کوئی چارہ نہیں رہتا، اس موقع پر ایک

(۱) امرتو لال بالا، الاول کے کلام میں ہندو مسلم ثقافت ص:۵٤۔

(۲) ڈاکٹر انعام الحق اور عبدالکریم ساھتیہ بیشارد، ارکان کے راج دربار میں بنگلا ساھتیہ ص:۳۔

(۳) ڈاکٹر انعام الحق اور عبدالکریم ساھتیہ بیشارد، ارکان کے راج دربار میں بنگلا ساھتیہ ص:۳۔

غیر مسلم مورخ کے بیان سے ہم جھلکیاں لیتے ہیں تو ہمارے لئے بہت اچھا رہتا ہے:

''ولی خانی حکومت کے راج دربار میں فارسی زبان چالو ہوگئی تھی، اور پوری سلطنت میں قضاۃ مقرر ہو گئے تھے، اور ارکان میں ان کی حکومت ہی سب سے پہلے کی اسلامی حکومت تھی''(۱)۔

بہر حال ایک طرف عربوں کی آمد، دعاۃ ومرشدین کی دعوت، تو دوسری طرف ولی خانی اور بعد میں مروکو سلطنت کے قیام کی وجہ سے ارکان اسلامی تہذیب وثقافت کا گہوارہ بن گیا تھا، یہاں ایک اسلامی سماج تیار ہو گیا تھا، اس حوالے سے امرتولال بالا کا بیان ہے کہ:

ہمیں یہ اعتراف ضرور کرنا پڑے گا کہ قدیم زمانے سے چاٹگام اور ارکان میں اسلام کا چاپ رہا تھا(۲)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ ارکان کی سیاسی اور سماجی زندگی کی تاریخ سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ مروکو سلطنت کے راج دربار میں اسلامی تہذیب وثقافت روشن ہوگئی تھی، سیاسی، ثقافتی، انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اسلامی نظام چالو ہو گیا تھا، حتی کہ راج دربار کے اداب واطوار، طرز زندگی اور طریقۂ بود و ماند بھی اسلامی ہو چکا تھا(۳)

(۱) امرتولال بالا، الاول کے کلام میں ہندو مسلم ثقافت، ص:۵۹۔
(۲) امرتولال بالا، الاول کے کلام میں ہندو مسلم ثقافت، ص:۶۰۔
(۳) امرتولال بالا، الاول کے کلام میں ہندو مسلم ثقافت، ص:۶۷۔

دوسرا باب

الاول کی پیدائش

ارکان کے عظیم شاعر الاول ۱۶۰۵ء میں فتح آباد میں پیدا ہوئے، فتح آباد اور الاول کے جنم استھان کے متعلق بڑا اختلاف پایا جاتا ہے، بعض سوانح نگاروں کا دعوی ہے کہ الاول کا جنم استھا فتح آباد، چاٹگام ہے، جب کہ ان کے مخالف سوانح نگاروں کا دعوی ہے کہ الاول کا جنم استھان فتح آباد جو ہے وہ فرید پور میں ہے، فرید پور کا ضلع آج کے بنگلا دیش کے اندر تو ہے لیکن جو کسی زمانے میں ایک علیحدہ ریاست بھی تھا، اور جلال پور اس ریاست کا قلعہ نما شہر تھا، ارکان کے دوسرے تیسرے شعراء کی طرح شاعر نے اگر چہ مختصر ہی سہی اپنا تعارف یوں بیان کیا ہے کہ:

''ریاست فتح آباد غور کا مرکزی علاقہ ہے، جہاں جلال پور ایک خوبصورت مقام ہے، جہاں سینکڑوں گیانی، پنڈت، علماء اور فضلاء رہتے ہیں، کیا بتاؤں کہ یہاں کیسی کیسی صلاحیت اور استعداد کے مالک انسان رہتے ہیں؟ مجلس قطب یہاں کا راجا ہے، اور میں اس راجا کے ایک عظیم وزیر کا بیٹا ہوں، ایک روز میں اپنے والد کے ساتھ کسی کام کو گیا تو وہاں فرنگی پرتگیزوں کے ساتھ ہمارا مقابلہ ہوا، بڑی خون ریز لڑائی کے نتیجے میں میرے والد شہید ہوئے''(۱)۔

الاول کے اس بیان سے صاف ظاہر ہو گیا ہے کہ فتح آباد غور کا ایک مرکزی علاقہ ہے، اور شہر جلال پور ایک

(۱) دیکھئے: پدا پتی، از الاول۔

خوب صورت مقام تھا، یہاں بہتوں گیانی، پنڈت، علماء، صلحاء، فضلا اور عارفین رہا کرتے تھے، اور یہاں کی خوبیوں کی گفتگو ختم کی جانے والی نہیں تھی، یہاں کا راجا مجلس قطب اور شاعر ایک وزیر کا لال تھا۔ الاول نے اپنے دیوان میں غور کے تذکرے کے ساتھ ملک بنگال کا تذکرہ بھی کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ریاست بنگال کا پرانہ نام غور تھا، اور مغلوں کی آمد کے بعد اس ملک کے نام کو غور سے بدل کر بنگال بنایا گیا تھا، اور جس سے ظاہر ہے کہ مغلوں کی آمد سے پہلے صوبۂ بنگال کو غور کہا جاتا تھا۔

جس طرح میں نے پچھلے سطور میں بیان کیا ہے کہ الاول کے جنم استھان کے متعلق مختلف اور متضاد آراء ملتی ہیں، جن میں سے قابل ذکر چند آراء درج ذیل ہیں: نورالاسلام مانیک کا بیان ہے کہ:

’’الاول کے جسم استھان کے متعلق پنڈتوں کے درمیان رسہ کشیاں تھیں، بعض حضرات الاول کے جنم استھان چاٹگام بناتے ہیں، مگر آج کل وہ اختلاف ختم ہو گیا ہے، کیوں کہ الاول کے کلام اور بنگال کی پرانی تاریخ سے صاف پتہ چلا ہے کہ الاول موضع فرید کے جلال پور شہر میں پیدا ہوئے تھے‘‘(۱)۔

امرتو لال بالا کا بیان ہے کہ:

’’دیکھا گیا ہے کہ بہتوں پنڈتوں نے شاعر کے جنم استھان کے متعلق مختلف اور متضاد دعوی کیا ہے، غور، فرید پور اور چاٹگام کے باشندے شاعر کو اپنے اپنے شہری ہونے کا دعوی کیا ہے، چاٹگام اور فرید پور والوں کی رسہ کشی کی وجہ سے شاعر کی زندگی اور جنم استھان کی نشاندہی مشکل ہو چکی ہے‘‘(۲)۔

جامنی کانتی شین کا خیال ہے کہ:

’’الاول کے جسم استھان کے متعلق مدتوں سے مختلف اور متضاد گفتگو ہو رہی ہے، ان رسہ کشوں کو چاہئے تھا کہ الاول کے دواوین اور دواوین کے کلام میں نظر ڈالتے، ہندو بھر شر گیو دینش بابو کے مطابق شاعر کا جنم استھان فرید پور ہے، اور مولوی عبد

(۱) نورالاسلام مانیک، عظیم شاعر الاول، ص:۱۵۔

(۲) امرتو لال بالا، الاول کے کلام میں ہندو مسلم ثقافت، ص: ۳۵۳۔

الکریم کے مطابق چاٹگام ہی شاعر کا جنم استھان ہے، اور نوگندرارام بوشو کے مطابق شاعر کا جنم استھان مغربی بنگال میں ہے‘‘(۱)۔

ڈاکٹر کالی کارنجن کانونگو کا بیان ہے کہ:

’’بعض لوگوں کے دعوی کے مطابق شاعر کا جنم استھان فرید پور جو ابھی موضع فرید پور میں ہے، اسے ہم مانتے نہیں، کیوں کہ پداپتی ’’فوتی‘‘ کی زبان میں چاٹگامی زبان کا چاپ ہے‘‘(۲)۔

ڈاکٹر محمد انعام الحق کا بیان ہے کہ:

’’۱۶۰۷ء کے قریبی زمانے میں ضلع چاٹگام کا مشہور تھانہ ہاٹھزاری کا جبرا گاؤں میں الاول پیدا ہوئے، شاعر مقیم کے منظوم کردہ شجرہ سے پتہ چلا کہ الاول کے آباواجداد غوری تھے، الاول نے ارکان میں بیشتر زندگی گزاری، اور اپنی آخری عمر کے چند سال اپنے پیدائشی گاؤں جبرا میں گزاری، جہاں ان کے نام پر بنا ہوا ایک پرانا تالاب ہے، اور تالاب کے قریب ان کے نام پر بنی ہوئی ایک مسجد جوان کی یادگار ہے‘‘(۳)

ڈاکٹر محمد حمید اللہ کا بیان ہے کہ:

’’فتح آباد جو آج کے فرید پور کا ایک پرگنہ تھا، یہ فتح آباد پرگنہ ہی شاعر کا جنم استھان ہے‘‘(۴)

ڈاکٹر شوکمار شن کا خیال ہے کہ:

’’الاول کی زندگی بڑی حیرت انگیز ہے، جمال پوران کے پیدائشی وطن جو فتح آباد کا ایک پرگنہ ہے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شاعر کا جنم استھان چاٹگام ہے، مگر شاعر نے خود اپنے دیوان میں بتایا ہے کہ ملک فتح آباد ان کا پیدائشی وطن ہے، اور جو غور کا راجدھان ہے، اور جو دریائے گنگا کے کنارے پر واقع ہے، اسی وجہ سے ان کا جنم

(۱) ماہنامہ محمدی، نویں شمارہ۔

(۲) بنگلا اکیڈمی پتریکا، بیساکھ اور آساڑھ، ۱۲۶۷ بنگلا۔

(۳) مسلم بنگلا ساھتیہ، ڈاکٹر انعام الحق، ص: ۲۴۱-۲۴۲۔

(۴) ڈاکٹر شہید اللہ، مقدمۂ پداپتی، ص: ۵۔

استھان مغربی بنگال یا وسطی بنگال میں ہونا قرین قیاس ہے‘‘(۱)۔

ڈاکٹرا وجیت کمار بندو پردائی کا بیان ہے کہ:

’’غور،فرید پوراور چاٹگام کے باشندوں نے شاعر کو اپنی اپنی طرف کھینچا ہے، ویسے اس موضوع پر سچی اور واقعی بات کی نشاندہی مشکل ہے ، بہارستان کا دعوی سچ ہے تو شاعر کا جنم استھان فرید پور ہے‘‘(۲)

ڈاکٹر احمد شریف کا خیال ہے کہ:

’’شاعر نے اپنے کلام میں بار بار اپنے کو جلال پوری، غوری، اور گنگا کنارے والا بتایا ہے، جس سے صاف ظاہر ہے کہ شاعر فتح آبادی اور فرید پوری ہے، اور جہاں کا راجا مجلس قطب تھا‘‘(۳)

---

(۱) ڈاکٹر شوکمار شن، آپراد، پہلا شمارہ، ص: ۳۴۳۔

(۲) ڈاکٹر اوجیت کمار بندو پردائی، پاٹ ٹیکا، ص: ۳۴۷۔

(۳) ڈاکٹر احمد شریف، مقدمہ تحفۃ النصائح، ص: ۹۔

الاول کالڑکپن

شاعر ارکان الاول کے والد شہید، نواب مجلس قطب فتح آبادی کے وزیر اعظم یا وزیر تھے، مغلوں کی آمد کے بہتوں سال پہلے آپ کے آباء واجداد موضع فتح آباد میں آئے ، اور یہ بھی پتہ چلا ہے کہ آپ کے آباء واجداد فتح آباد میں دین ودعوت کی نسبت سے آئے تھے، سرزمین بنگال کے بہتوں مرشدین اور مبلغین کی طرح حضرت الاول کے آباء واجداد دراصل یہاں کے مرشدین اور مبلغین میں شمار ہوتے تھے، آپ کے آباء واجداد ان بزرگوں میں سے تھے جنھوں نے نہ صرف بنگال بلکہ جنوب شرق ایشیا میں دین ودعوت کی اشاعت کا کام انجام دیا تھا، یہ لوگ تو دین ودعوت کی نسبت سے آئے تو ٹھیک تھے، لیکن ہمیشہ کے لئے یہاں کی زمین اور یہاں کے انسانوں سے جدا نہ ہوئے تھے۔

مورخین اور تذکرہ نگاروں کی تحریر سے جہاں تک پتہ چلا کہ آپ کے آباء واجداد میں سے بعض تو دین و دعوت کے کام میں ہمیشہ کے لئے مشغول رہے اور ان میں سے بعض حضرات سرکاری اور دفتری کام میں بھی شامل تھے، یوں آپ کے والد مرحوم بھی مجلس قطب کے وزیر اعظم بن گئے تھے۔

الاول نے اپنے کلام میں اپنے والد شہید کے متعلق فرمایا ہے کہ: ’’میرے والد مجلس قطب کے وزیر اعظم تھے‘‘ مگر آپ نے کہیں بھی اپنے والد شہید کا نام نہیں بتایا، یوں آپ کے والد شہید کے نام سے دنیا انجان رہ گئی ہے۔

جہاں تک معلوم ہوا کہ سلطنت فتح آباد میں جلال پور سب سے بڑا شہر تھا، جہاں ہزاروں افواج کی چھاونی تھی ، گویا یہ شہر فوجوں کا سمندر معلوم ہوتا تھا، لیکن یہاں تیغ وتفنگ کے سائے میں دعوت دین کا کام بھی ہوتا تھا، دین و دعوت، تعلیم وتربیت کی ایک دنیا یہاں آباد تھی ، جہاں علم وعرفان کی سینکڑوں ندیاں بہتی تھیں ، اور کہیں کہیں ان ندیوں کی ملاوٹ سے علم وعرفان کا مطلاطم سندر بھی نظر آتا تھا، سلطنت فتح آباد کے کونے کونے سے طالبان علوم نبوت سمیت سمیٹ کر یہاں آتے اور علم وعرفان کے بہتے سمندر سے اپنی پیاس بجھاتے چلے جاتے تھے۔

الاول اپنے طالبعلمی کے زمانے میں نہ صرف جلال پور بلکہ پورے فتح آباد میں مشہور ومعروف

طالبعلم تھے، آپ کی ذہانت اور فطانت کی شہرت چار دانگ عالم میں عام تھی، چونکہ الاول کے والد کی آرزو تھی کہ بیٹا علم وعرفان کے لق ودق صحرا میں گھوڑا دوڑائے اور میدان علم وحکمت کا شہوار بنے، جس سے اس دنیا میں بھی اس کی شہرت ہو اور آخرت میں بھی ایک کامیاب بندہ نکلے، بالآخر والد کی نیت وآرزو پوری ہوئی اور امید بھر آئی۔

پتہ چلا ہے کہ حضرت الاول کے آباء واجداد کی زبان فارسی تھی، تو ظاہر ہے کہ فارسی آپ کی مادری زبان تھی، تاہم لڑکپن میں آپ نے فارسی کے ساتھ ساتھ والد شہید کی کوشش وکاوش کے نتیجے میں عربی زبان وادب میں بھی اچھی خاصی مہارت حاصل کر لی تھی۔

فارسی آپ کی مادری زبان تو عربی آپ کی علمی اور دینی زبان رہی، غرض والد مرحوم کی کوشش سے ان دونوں زبان وادب میں آپ نے اچھی خاصی مہارت حاصل کر لی تھی، اور آگے چل کر ان دونوں زبان وادب کے ساتھ بنگلہ، پالی اور سنسکرت زبان وادب کے ایک ادیب اور انشا پرداز مشہور ہو گئے تھے، صرف یہی نہیں بلکہ آپ زبان وادب کی نسبت سے آسمان زبان وادب کا ایک جگمگاتے ستارہ بن گئے تھے، جس کی روشن اور تاباں دلیل آپ کی وہ شاعری ہے، جس نے اپنی تابانی سے بنگلا ادب کے سارے ستاروں کو مدھم بنا دیا ہے۔

یہاں ایک بات جو قابل ذکر ہے وہ یہ ہے کہ آپ ان تینوں زبانوں کے تہ بتہ مشرق وسطی اور برصغیر ہندوستان کے بڑے بڑے شعراء کی طرح سنگیت اور موسیقی میں بھی زبردست مہارت حاصل کر لی تھی، آپ موسیقی کے نہ صرف ایک عظیم استاد تھے بلکہ آپ اس فن کے ایک عظیم فنکار کی حیثیت سے مشہور ومعروف بھی تھے، چونکہ اس وقت جلال پور سنگیت اور موسیقی کا گہوارہ تھا، تو یہاں کے اساتذہ اور ماہرین کی تربیت نے آپ کی فطری صلاحیت کو ابھارا اور جلا بخشا، یوں آپ کی فطری صلاحیت میں نکھار آیا تھا، ایک طرف آپ کی زبان کی حلاوت پھر اس میں فصاحت وبلاغت کی ندرت، تو دوسری طرف آپ کی حسین شاعری کی داخلی اور خارجی موسیقی کی لذت نے آسمان ادب میں ایسا کام کیا، جسے بیان کرنے کے لئے نقد وتبصرہ کی ایک دنیا آباد کرنی ہوگی، غرض آپ نے لڑکپن ہی میں عربی، فارسی، بنگالی، پالی اور سنسکرت زبان وادب کے تہ بتہ موسیقی اور سنگیت میں بھی زبردست مہارت حاصل کر لی تھی۔

فوجی تربیت

حضرت الاول کی زندگی کے اور ایک پہلو جس نے مجھے ششدر بنا دیا ہے، وہ ہے آپ کی فوجی مہارت، کہ آپ نے اپنی تعلیم وتربیت کے دوران فوجی یا عسکری تربیت بھی حاصل کر لی تھی، جس نے آپ کی شخصیت، اور زندگی میں ندرت بخشی، یہ وہ تربیت تھی کہ جس نے آپ کو جہاد فی سبیل اللہ کے لئے ابھارا اور میدان جہاد میں اترنے میں مدد کی تھی، یوں الاول صرف قال کا شہسوار نہ تھے بلکہ میر حال بھی تھے۔ شہزادہ شجاع نے جب ارکان میں پناہ لی تو اس وقت حضرت الاول بھی وہاں موجود تھے، جہاں تک پتہ چلا کہ الاول شہزادہ کے حامی تھے، باوجود یکہ ارکانی راجا اور شہزادے کے مابین ہونے والے معرکے میں الاول گرفتار کر لئے گئے تھے، مگر آخر کار آپ کو رہائی ملی تھی، تذکرہ نگاروں کی تحریر سے پتہ چلا کے الاول ایک عظیم فارس اور تیر انداز تھے، آپ اس فن کے بھی بڑے ماہر تھے، بچپن ہی میں لوگ آپ کی شہسواری اور تیر اندازی سے ششدر تھے، علم وفن، فکر ونظر، شعر وشاعری، زبان وادب کی طرح آپ کی تیر اندازی بھی چار دانگ عالم میں شہرت کی حامل تھی، حتی کہ دور دراز سے لوگ آپ کو دیکھنے آتے تھے، لوگ آپ کی تیر اندازی کی مہارت کو دیکھ دیکھ کر ایسی دعائیں دیتے تھے کہ خدا کرے کہ یہ لڑکا آگے چل کر قوم وملت اور وطن عزیز کے ایک عظیم محافظ بنے، اور بعض حضرات تو آپ کو لڑکپن ہی میں ملک کا بادشاہ یا ایک عظیم محافظ دیکھ رہے تھے، اور دعائیں دیتے تھے کہ خدا کرے کہ اس لڑکے کی وجہ سے ملک وملت کا نام بلند ہو۔

الاول نے اپنے لڑکپن کے زمانے بڑی خوش اسلوبی سے گزارے، اس کے بعد زندگی کے دوسرے میدان کی طرف گامزن ہو رہے تھے، اور قدم بڑھا رہے تھے ایسی ایک پر کٹھن دنیا کی طرف جہاں صرف امتحان دینے کا کام تھا، امتحان کے بغیر اسی دنیا میں کوئی کام مشکل سے ملتا تھا۔

درحقیقت یہ دنیا تو آزمائش اور امتحان ہی کی دنیا ہے، یہ ایک ایسی دنیا ہے کہ جس کے مکر وخداع اور دجل وفریب سے مشکل سے کوئی عفریت بھی بچ سکتی ہے، یہ ایک ایسی دنیا ہے کہ جس میں دنیا دار سے زیادہ دینداروں کو پر کٹھن امتحان دینا ہوتا ہے، غنی ہو یا فقیر، شہنشاہ ہو یا گداگر، محمود ہو یا آیاز غرض کوئی بھی انسان امتحان کے مشاکل ومعضلات سے بچ نہیں سکتا، امتحان دیے بغیر کوئی بھی انسان کامیاب نہیں ہو سکتا۔

مگھ اور پرتگیز لٹیروں کے ساتھ

سرزمین ارکان کی ایک اقلیت جس کی تاریخی نام ''مگھ'' اور مصنوعی نام ''رکھائنگ'' ہے، حضرت الاول کے زمانے میں اس کی ایک بھاری اکثریت کا پیشہ رہزنی اور ڈاکہ زنی تھا، ویسے دہشت گردی اور لوٹ کھسوٹ اس کی زندگی کا من پسند مشغلہ تھا، یہ لوگ ڈاکہ زنی میں ایسے ماہر تھے کہ دنیا کی دوسری تیسری ڈاکو اقوام ان کے نام سنتے ہی چونک پڑتی تھیں، اور تو اور ڈاکہ زنی اور لوٹ کھسوٹ کو یہ لوگ ایک برا کام یا ایک غیر انسانی فعل نہیں سمجھتے بلکہ یہ تجارت، زراعت وغیرہ پیشہ کی طرح ایک مہذب پیشہ سمجھتے تھے۔

دے نیو انگلش ڈکشنری نے لفظ، مگھ، موگن، موگو کو پندرھویں اور سولھویں صدی میں زندگی گزارنے والے بعض ارکانی باشندے بیان کرتا ہے، تو ظاہر ہے کہ یہ ارکان کے وہ باشندے ہیں جو حال میں اپنی تاریخی نام کو تبدیل کر کے رکھائنگ کہلانے لگے ہیں۔

اب تک مگھ قومیت کی جو تحقیقی تاریخ ہمارے سامنے آئی ہے وہ یہ ہے کہ عیسوی عہد کی ابتدا میں موریہ شہنشاہ اور بدھ مت کے محسن اشوک اعظم کی حکومت کے زوال کے بعد ہندوستان میں بدھ مت کی بالا دستی کم ہونی شروع ہوگئی تھی، بعد کی آٹھ صدیوں میں وہاں ہندومت اور بدھ مت کے درمیان کشمکش ہوتی رہی، بطور خاص بہار میں نسل پرست ہندوؤں اور حریف مہایانا بدھ فرقوں کے ہاتھوں تھراوڈا بدھ فرقہ اس بری طرح ستایا گیا کہ وہ مشرق کی طرف فرار ہونے پر مجبور ہوگئے، تاریخ بتاتی ہے کہ یہ لوگ وہاں سے بھاگ کر بنگال آئے، بعد ازاں ان کے بعض قافلے سرزمین ارکان میں گھس گئے تھے، دراں حالیکہ ارکان میں ہندومت کے پیرو چندرا خاندان کا راج اور شہر ویسالی اس سلطنت کا دارالحکومت تھا۔

بعض مورخین کا بیان ہے کہ یہ لوگ سرزمین ارکان میں چوری چھپے گھسے تھے، چونکہ یہاں ایک طرف چندرا خاندان ہندومت کا پیرو اور اس کی سلطنت بھی ہندومت پر مبنی سلطنت تھی تو دوسری طرف یہ مگھ لوگ اجنبی اور فسادی تھے، تو قرین قیاس یہ ہے کہ یہ لوگ یہاں سرکاری طور پر پناہ گزین نہ بن پائے تھے۔

جب کہ بعض مورخین کا یہ بھی خیال ہے کہ یہ لوگ ارکان میں پناہ لینے نہیں آئے بلکہ وہاں اپنے دشمن مذہب کی سلطنت کو تاراج کرنے آئے تھے، چنانچہ یہ لوگ ابتدا میں وہاں چندرا راج پر رہ رہ کر ڈاکہ

بھی ڈالتے تھے، اس لئے چندرا خاندان نے انہیں اپنی سلطنت کا باغی قرار دے رکھا تھا۔

۹۵۲ء کو چندرا خاندان کا آخری تاجدار چولائنگ چندرا کے عہد حکومت میں ان بہار سے آئے ہوئے مگھوں نے حملہ آور وحشی منگول (جو بھی تھراوڈا مذہب کے پیروکار مگھوں کے ہم مذہب تھے) سے مل کر ارکان اور ارکانی حکومت پر حملہ کر دیا، تو ظاہر ہے کہ مگھوں کا ان منگولوں کا ساتھ دینا ارکان اور ارکانی سلطنت پر بہت ہی بھاری گزرا، جس کی وجہ سے ارکان سے چندرا حکومت ختم ہوگئی، اس کے بعد کی تاریخ ارکان کی ایک اندھیری تاریخ ہے، چنانچہ منگولوں اور مگھوں کے ملی بھگت والے اس حملہ سے لے کر اگلی مسلسل پانچ صدیوں تک کو مورخین تاریخ ارکان کا ایک تاریک دور کہتے ہیں، دراصل ارکان میں مگھ نامی کوئی قوم اس مذکورہ واقعہ سے پہلے نہیں تھی، اس واقعہ کے بعد وحشی منگولوں اور مگدھی بدھوں کے میل ملاپ کے نتیجے میں ارکان میں ایک ''مگھ'' نامی ایک قوم وجود میں آگئی۔

پھر بعد کے زمانوں سے صرف نظر کر کے ہم دیکھتے ہیں کہ مگھوں کا وحشیانہ سلوک اور بربریت کا اعلان ارکانی راجا مین بین (۱۵۳۱ء۔۱۵۵۱ء) کے عہد حکومت میں ہوا، مین بین نے ارکان کو ایک آزاد مملکت ہونے کا اعلان کیا، اور ساتھ ہی ساتھ اپنی قوت وسطوت کو بڑھانے کی فکر میں پرتگیز بحری قزاقوں سے ایک معاہدہ بھی کر لیا تھا، جس میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ پرتگیزوں کو چاٹگام میں بسنے اور وہاں رہتے ہوئے عالمی تجارت کرنے کی سہولت اس وقت میسر ہوگی جب وہ ارکانی مگھوں کو بحریہ کی تربیت دے کر سلطنت ارکان کے لئے ایک ناممکن التسخیر قوت بنا دیں گے، ویسے پرتگیزوں کی رضامندی کے نتیجے میں مگھوں کو ایک بحری قوت میسر ہوگئی، یعنی مین بین نے پرتگیزوں کے تعاون سے ارکانی مگھوں کی ایک زبردست بحری قوت تیار کر لی تھی۔

بحری قوت کے حصول کے بعد مگھوں کی جرات مزید بڑھ گئی تھی، پرتگیزی تربیت نے ان کی فطری ڈاکہ زنی اور دہشت گردی میں اور بھی نکھار لایا اور اس میں جلا بخشا تھا، چنانچہ انہوں نے نہ صرف خلیج بنگال کو اپنے قبضہ میں لے لیا بلکہ پورے بنگال کے سارے باشندوں کی نیندیں حرام کر دی تھیں، ان کے متعلق مورخ بن لین سوٹن (۱۵۹۵ء) کا بیان ہے کہ:

''یہ لٹیرے بڑے وحشی اور جنگلی تھے، جہالت اور اندھیاری میں بھٹکنے والے، انصاف عدالت کی کوئی بھی قیمت نہیں سمجھتے تھے، انسانی سماج سے کوسوں دوران کی

زندگی تھی‘‘(۱)

ویسے بنگالیوں کی زبان وادب اور شعروشاعری میں ’’مگھ‘‘ کا مطلب ایک جاہل، بربر، وحشی، دہشت گرد اور جنگلی قوم ہے، جو آج کل ارکان اور بنگال کے بعض علاقہ میں رہائش پذیر ہے، جو نہ انسانیت کا پاس رکھتی اور نہ آئین وقوانین ان کے سامنے کوئی اخلاقی چیز ہے، بس یہ آئین وقوانین کے مذاق اڑاتی پھرتی ہے۔

ویسے بنگالیوں کی زبان وادب میں لفظ مگھ ایک خطرناک گالی بھی ہے، عمومی طور پر یہ گالی اس آدمی کے سر تھوپی جاتی ہے جو آئین اور قانون کا پاس نہیں رکھتا اور انسان وانسانیت کے ساتھ ظلم کرتا پھرتا ہے، تو ظاہر ہے کہ آج کی دنیا کے مگھ لوگ اپنی تاریخی چیز کو مسترد کرتے ہوئے اپنے ماضی سے سراسر رو گرانی کرتے ہیں، تا کہ یہ گالی ان کے سر پر نہ آن پڑے، اور اپنے تاریخی نام سے انکار کرتے ہوئے خود کو رکھائنگ کھلانے لگے ہیں، وہ اس لئے بھی ہے کہ دراصل انہیں اپنے آباء واجداد کے ماضی کی بد کارگردگی اور ظالمانہ حرکات وسکنات سے شرم آتی ہے۔

آج کی دنیا جن لوگوں کو مگھ کے نام سے جانتی ہے ان کے متعلق یہ سمجھتی ہے کہ یہ لوگ بلاشرکت غیر مگدھی نسل سے ہیں، لیکن حقیقت ایسی نہیں ہے، بلکہ واضح تاریخ سے جہاں تک پتہ چلا کہ آج کے مگھ لوگ برمی وحشیوں اور مگدھی گھس بیٹھوں اور منگول وحشی حملہ آوروں کی ملاوٹ کا دوسرا نام ہے، جو مذہبی اعتبار سے بدھ مت کے پیروکار ہیں۔

یاد رہے کہ ایک عرصہ تک ارکانی مگھ اور پرتگیز بحری قزاقوں نے جزیرۂ سندیپ (حالیہ چاٹگام کا جزیرہ) کو اپنا سب سے بڑا بحری مرکز بنالیا تھا، جو یہاں سے باہر ہو کر دریائے میگنا کے دھارے چلتے ہوئے مرشد آباد تک کو تاراج کر کے بآسانی واپس چلے آتے تھے، ویسے آج بھی بنگالی لوگ مگھوں کے نام سے چونک پڑتے ہیں، یہ وحشی لٹیرے جہاں بھی جاتے بستیوں کی بستیوں کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنادیتے تھے (ان کی یہ تاریخی خصلت آج بھی حالیہ ارکان میں دیکھی جاسکتی ہے) عورت، مرد، بچے، بچیاں، کمزور، ضعیف غرض جن کو بھی سامنے پاتے انہیں یا تو قتل کردیتے یا گرفتار کر کے لے جاتے تھے، عصمت دری اور نازیبا حرکات

(1) پروفیسر حبیب اللہ، روہنگیا ذاتیر ایتی ہاش، ص: ۳۰۶، بحوالۂ بن لین سوٹن۔

گویا ان کی طبیعت بن چکی تھیں، قیدیوں کے جسم کو گرم لوہے کی سلاخوں سے سوراخ کر دیتے اور اس میں نکیل کی رسی لگا کر کھینچتے گھسیٹتے تھے، ویسے جو لوگ بچ جاتے ان کو ارکان بھیج دیا جاتا اور ارکانی راجا ان کے ذریعے وہاں کی بنجر زمینیں آباد کرتا یا جس کسی کو بھی چاہتا غلام بنا کر پرتگیزوں کے ہاتھوں فروخت کر دیتا تھا۔

اسی طرح کوئی ڈیڑھ سو سال تک بنگال میں ان لٹیروں کا قتل وخون، لوٹ کھسوٹ، ظلم وغارت گری کا بازار گرم تھا، بنگالیوں کے یہاں ان سے لڑنے کی کوئی بھی طاقت نہیں تھی، جس کے نتیجے میں بہت کم مدت میں بنگال کے پورے ساحلی علاقے انسانی آبادی سے محروم ہو کر بنجر بن گئے تھے، اور چاٹگام پر اسلامی فتح تک یہاں کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آسکی تھی۔

پرتگیز لٹیرے تو ظاہر ہے کہ پرتگال کے باشندے تھے، تاریخ بتاتی ہے کہ عالمی شہرت یافتہ کپتان واسکوڈیگاما نے ۱۴۹۸ء کو ہندوستان کی راہ دریافت کی تو اس کے پیچھے وہاں کے لوگوں نے جنوب شرق ایشیا کو آنا جانا شروع کر دیا، ویسے پرتگال سے تین طبقہ کے لوگ یہاں آتے تھے، تاجر، بحریہ کے ماہرین اور نصرانیت کے دعاۃ، ابتدا میں انہیں یہاں کے باشندے اچھے انسان تصور کرتے تھے، مگر وقت کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنا اصلی چہرہ دکھانا شروع کر دیا تھا، پرتگیز بحری قزاق دراصل مگھوں سے بھی خطرناک تھے، ظاہر ہے کہ وہ مگھوں کے استاد تھے، ان کا کام صرف ڈکیتی، رہزنی، دہشت گردی اور قزاقی تھا، بنگال کے کونے کونے تک کو انہوں نے نہیں چھوڑا، جہاں بھی گئے ان لوگوں نے پوری آبادی کو ویران بنادیا، یہ لوگ اس علاقے کے دھن، دولت سے عیاشی اور مستانی کرتے اور بہت ساری قیمتی چیزیں اور دولت وثروت پرتگال پہنچاتے تھے، اور سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ یہ لوگ بنگال کے لوگوں کو پکڑ پکڑ کر ارکان لے جاتے اور انہیں فروخت کر کے پیسے کماتے تھے۔

یاد رہے کہ مروکو سلطنت ارکان میں جب سے قائم ہوئی تب سے ارکانی حکومت بنگال کی غوری حکومت کو جزیہ ادا کرتی رہی تھی، مگر راجا مین بین نے جب ارکان کو ایک آزاد مملکت ہونے کا اعلان کر دیا تو ارکان سے جزیہ بنگال کو جانا بند ہو گیا تھا، بعد ازاں غوری سلطنت کے زوال کے بعد ارکانی راجا اور بھی بے لگام ہو گیا تھا، بعد ازاں ارکانی مگھ اور پرتگیز لٹیروں کی ملاوٹ وسنگم سے ایک ظالم طاقت وجود میں آئی تو چاٹگام کی اسلامی فتح سے قبل تک اس طاقت کو روکنے والا یہاں کوئی نہیں تھا، ایک انسان یا

ایک جماعت بنگال میں نہیں تھی جو اس ارکانی سلطنت کی ظالمانہ حرکات وسکنات کی روک تھام کرے، جب کہ ارکانی سلطنت نے مغلوں کی روک تھام کے لئے ان پرتگیزوں کی حمایت کو ضروری سمجھا تھا، ویسے سرزمین ارکان میں ان مغربی قزاقوں کو وسیع سے وسیع تر اختیارات حاصل ہو گئے تھے، حتی کہ ارکانی سلطنت نے ان فرنگیوں کو ملک کے بحری اختیارات سونپ دیے تھے، پھر اس دہشت گرد سلطنت نے ان قزاقوں سے مل کر ایک بحری قوت بنالی تھی، چنانچہ ارکانی سلطنت کی پشت پناہی میں پرتگیزوں نے بنگال کو دل کھول کر لوٹا تھا۔

یہاں ایک بات قابل ذکر ہے کہ فرنگیوں کی آمد سے قبل ارکان کے مگھ غلام کی تجارت سے واقف نہیں تھے، فرنگیوں ہی نے انہیں ایسی نازیبا اور انسانیت سوز تجارت سے واقف کرایا، ان دونوں قومیت کی ملاوٹ سے ایک ایسا انسانی تاجر گروہ تیار ہو گیا تھا، جس کی تفصیلات کے لئے ایک موسوعہ کی ضرورت ہوگی، اور انہوں ایسے ایسے شرمناک اعمال انجام دیئے، جس کے تصور سے رونگھٹے کھڑے ہو جاتے اور خیال کرنے سے دل دہل جاتا ہے۔

۱۶۱۲ء کو بنگال کے معروف صوبہ دار اسلام خان (جس نے جہانگیر نگر ڈھاکہ کی بنیاد رکھی تھی) کو شہنشاہ ہندوستان جہانگیر نے بنگال کے تمام اختیارات سونپتے ہوئے بنگال بھیجا، ان کو یہاں بھیجے جانے کا ایک اہم مقصد صرف صوبۂ بنگال کو ان قزاقوں کی بربریت سے نجات دلانا تھا، باوجودیکہ اسلام خان ایک لوہاری ہاتھ کا مالک صوبہ دار تھا، لیکن اس کی طرف سے بڑی جدوجہد اور پیہم کوشش کے باوجود اس نے بنگالیوں کو ان قزاقوں سے نجات نہیں دلا سکا۔

الاول کے والد کی شہادت

ایک روز الاول کے والد محترم کسی سرکاری ذمہ داری نبھانے کی غرض سے ساحلی علاقہ کی طرف جارہے تھے، یہ بات الاول کے کان پڑی تو والد کا پیچھا نہ چھوڑا، چونکہ اس زمانے میں فرنگی اور مگھ لٹیروں کی غارت گری اور قتل خون کی وجہ سے پورے ساحلی علاقہ غیر مامون تھا، اسی لئے والد نے ان کو ساتھ لے جانے کی اجازت نہیں دے رہے تھے، لیکن الاول کوئی بات سننے اور کسی بھی قیمت پر والد کے پیچھے چھوڑنے کو تیار نہ تھے، آخر کار والد صاحب راضی ہو گئے، یوں مور مثالی کشتی پر سوار ہو کر ساحلی علاقہ کو چلے جارہے تھے۔

واپسی میں شام ہوگئی اور آفتاب عالمتاب اپنی پوری جلوہ سامانیوں کے ساتھ اندھیاری میں غائب ہوگیا، ادھر رات کی اندھیری آسمان کو اندھیر کرنے جارہی تھی، ادھر اچانک چند کشتیاں اس مور مثالی کشتی کی طرف بڑھ رہی تھیں، کشتیاں آنکھوں کے سامنے آئیں تو الاول کے والد صاحب سمجھ گئے کہ فرنگی اور مگھ لٹیرے ان کی کشتی پر ڈاکہ ڈالنے آرہے ہیں، کشتیاں قریب آئیں تو لٹیرے شور مچا اٹھے، ان کے ہاتھ میں تیر وتفنگ کے علاوہ گولہ بارود، کارتوس اور آتشی بندوق بھی تھے۔

الاول کے والد صاحب نے حالات کی نزاکت کو سمجھ گیا، سمجھ گیا کہ موت کی اندھیری ان کی چاروں طرف چھائی جارہی ہے، اب تو مصیبت آہی گئی، ایسی مصیبت جس میں اللہ کے نام کے سوا اور کوئی چیز کام نہیں آتی اور اس ذات قہر وجبروت کی امداد واعانت کے علاوہ اور کسی چیز کی توقع فضول ہو جاتی ہے، اب ان قزاقوں کی ''پکڑو پکڑو'' کی آواز نے مور مثالی کشتی کے سارے سواروں کے دلوں کو دہلا دیا، سارے سواروں کی آوازیں مدھم، زبانیں گنگ اور سانسیں بند ہونے جارہی تھیں، سارے خوف کے مارے تھرتھرانے لگے تھے، لیکن اس مصیبت اور آزمایش کی حالت میں بھی الاول کے والد حوصلے اور جرات دکھا رہے تھے، انہوں نے جلد فیصلہ کر لیا کہ اب خوف وہراس سے کوئی فائدہ نہیں ہوسکتا، انہوں نے بڑی جرات اور حوصلہ مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سارے ساتھیوں کو لڑنے کے لئے تیار کیا، یوں بھی ان کی جرات وبہادری، شہسواری اور جفاکشی کی تعریف چاردانگ عالم میں مشہور تھی، تو کسی بھی قیمت پر ان قزاقوں سے لڑنے کو تیار ہو گئے تھے، انہوں نے آگے بڑھ کر ساتھیوں سے

مخاطب ہوا کہ:

''ساتھیو! مصیبت اور آزمائش کے وقت بزدل لوگ خائف ہوجاتے ہیں، اور اس کا یہ خوف و ہراس دراصل اس کو ہلاک کرنے کے لئے کافی ہوتا ہے، اللہ والے ہر حالت میں اس کی امداد و نصرت کا سہارا لیتے ہیں، اس لئے ڈرومت! اللہ کا نام لے کر میدان کارزار میں اتر جاؤ، اور ہمت کے ساتھ یاد رکھو کہ اللہ تعالی ہر وقت مومن کا ساتھ ہے ، اور عزم کرلو کہ اب ہمارے لئے لڑنے کے سوا اور کوئی راستہ باقی نہیں رہا ہے، اب ہمارے لئے صرف ایک راستہ باقی ہے وہ ہے جہاد فی سبیل اللہ، اب یا تو ہمیں اس راہ پہ شہید ہونا ہے یا فتح وکامرانی سے ہمکنار ہونا ہے، اور سنو! کہ میرے جسم میں جب تک جان باقی رہے گی تب تک ہم ان ظالموں سے لڑتے رہیں گے، اور یہ بھی سنو کہ ہم کسی بھی قیمت پر ہتھیار ڈالنے کو تیار نہیں ہوں گئے، تم یہ بھی سن رکھو کہ مومن مصیبت اور آزمائش کے وقت صرف اللہ تعالٰی کا نام لیتا ہے، اس کی نصرت و امداد کا خواستگار ہوتا ہے، اللہ تعالی کے خوف کے سوا مومن کے اندر کسی کا خوف داخل نہیں ہوسکتا''(۱)۔

اس مختصر سی تقریر کے بعد انہوں نے سارے ساتھیوں کو لڑنے پر آمادہ کرلیا، اور ہر ایک حکم کی تعمیل کے لئے تیار ہو گئے، اب حالات کی نزاکت کو سمجھ کر الاول کے والد نے حکم جاری کیا کہ ان لٹیروں کے ساتھ لڑو، مرنا بھی ہے تو بزدل بن کر مت مرو، شہید ہوجاؤ یا غازی بنو۔

آخر کار قزاقوں سے لڑائی شروع ہوگئی، معرکہ سخت ترین ہوا، ان اللہ والوں نے جان کی ایسی بازی لگائی کہ لٹیروں کے ناپاک خون سے دریا کا پانی تک سرخ ہوگیا، ان لٹیروں کو اپنے ناجائز حملہ کی ایسی قیمت ادا کرنی پڑی کہ جس کا تصور انہوں نے شاید کبھی کیا ہوگا، باوجودیکہ ان اللہ کے نیک بندوں نے ان قزاقوں سے جان توڑ کر لڑائی لڑی، لیکن ایک پہلے سے مستعد اور سروسامان سے لدے ہوئے دشمن سے فتح یاب نہیں ہوسکے، بالآخر الاول کے والد صاحب نے بہتوں لیٹروں کو جہنم رسید کرتے ہوئے جام شہادت نوش فرمایا، ان کی شہادت کے ساتھ لٹیروں نے مزید بہتوں کو بھی شہید کیا، اور بہتوں کو گرفتار کرکے جہاز کے پچھلے حصے میں ڈال دیا، ان گرفتار ہونے والوں میں ہمارے ممدوح شاعر حضرت الاول بھی تھے۔

---

(۱) نورالاسلام مانیک، عظیم شاعر الاول، ص:۲۵۔

الاول ارکان کی راہ پر

فرنگی اور مگھ لٹیروں نے ہاتھ پاؤں کو زنجیروں میں جکڑ کر الاول سمیت بہتوں کو جہاز کے پچھلے حصے میں ڈال دیا، رات گزر گئی تو صبح آفتاب عالمتاب اپنی پوری جلوہ سامانیوں کے ساتھ مشرق سے طلوع ہوا تو ان قزاقوں نے قیدیوں کو جہاز کے پچھلے حصے سے نکالا، کسی کے ہاتھ کو چیدا اور کسی کے ناک میں نکیل کی رسیاں ڈالیں، پھر ایک فرنگی قزاق اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کے کہا کہ:

''یہ لڑکا (الاول) بڑا خوبصورت ہے، اسے بڑی قیمت میں فروخت کیا جاسکتا ہے، جی ہاں یہ لڑکا کوئی شہزادہ معلوم ہوتا ہے، مگر اس چھوٹے لڑکے نے ہمارے بہت سارے دوستوں کو قتل کیا اور کسی کو دریا میں لات مار مار کر پھینکا ہے''۔

اس کے ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے دوسرے لٹیرے نے کہا کہ:

''تم نے بالکل سچ کہا ہے، دراصل ایسے جری اور بہادر لڑکا میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا، اگر اسے میں نے عقب سے حملہ کرکے زخمی نہ کیا ہوتا تو یہ ہمارے اور بھی بہت سے ساتھیوں کو ہلاک کردیا ہوتا''۔

اس کے جواب میں پہلے والے فرنگی چلا اٹھا، اور کہنے لگا کہ:

''اچھا یہ تم ہی ہو کہ اسے زخم سے چور کردیا ہو، اگر اسے زخم سے چور نہ کیا گیا ہوتا تو اس کی قیمت بہت بڑھی ہوئی ہوتی، جس سے ہمارا بہت بڑا فائدہ ہوا ہوتا، تم بڑے بدمعاش ہو، تمہاری وجہ سے ہماری تجارت خسارے میں پڑ گئی ہے''۔

اس کی تیز و تند آواز کے جواب میں ایک تیسرے نے بولا کہ:

''جی ہاں! قیمت تو بہت زیادہ مل جاتی، لیکن تم مر چکے ہوتے، کیونکہ اگر اس نے پیچھے سے حملہ کرکے اسے زخمی نہ کیا ہوتا تو ہم سب دریا کے سہارے اب تک خلیج بنگال کو پہنچ چکے ہوتے، اس لئے ہمارے ساتھی نے بہت اچھا کام کیا کہ اس جری اور بہادر لڑکے کو زخمی کردیا اور ہمیں موت کی اندھیاری سے بچالیا ہے''۔

لیکن قزاقوں کے سرداران تینوں کی گفتگو خاموشی سے سن رہا تھا، اب اس نے بڑے غصیلے انداز میں گرجتے ہوئے بولا کہ:

''شیطانو! خاموش ہوجاؤ اور کشتی زور سے چلایا کرو، ابھی دن ختم ہوا تو چاندنی نکل آئے گی ، ہمیں دوسرے دن کی ابتدا تک دبانگا چھاؤنی کو پہنچنا ہے، پھر وہاں سے اگلے سنیچر تک ارکان کے بازار ضرور پہونچنا ہوگا، اگر ہم جلد ارکان نہ پہنچ پائیں گے تو یہ سارے قیدی دبلے اور ہلکے ہوجائیں گے، جس کی وجہ سے ان کی قیمت کم ہوجائے گی، مطلب یہ ہے کہ اگلے سنیچر تک اگر ہم ارکان نہ پہنچ پائیں گے تو دوسرے سنیچر کا انتظار کرنا پڑے گا، جس سے ہماری بڑی پریشانی ہوگی، اور ظاہر کہ نقصان میں اضافہ ہوگا، میرے لاڈلے شیطانو! تم جلدی کرو! ہر ایک اپنے اپنے پتوار مضبوطی سے تھامو''۔

فرنگی اور مگھ لٹیروں کی زبانی ارکان کا نام سنا تو الاول نے اپنا آنسو بہادیا، اور سمجھ گئے کہ اللہ تعالی ان کے مقدر میں کیا کچھ رکھا ہے، کیوں کہ انہوں نے لوگوں کی زبانی یہ بات سن رکھی تھی کہ ارکان میں ایک بہت بڑا بازار ہے، جہاں غلاموں کی خرید فروخت ہوتی ہے، اور یہاں سے دنیا کے گوشے گوشے تک غلام پہنچائے جاتے ہیں، یہاں ہر وقت مہاجن حضرات منتظر رہتے ہیں، اور یہ لوگ بنگال سے غلام پہنچتے ہی خرید خرید کر دنیا کے کونے کونے تک پہنچا دیتے اور پیسے کماتے ہیں۔ بہر حال اس حوالے سے جناب نورالاسلام مانیک رقم طراز ہیں کہ:

''حضرت الاول نے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سن رکھا تھا کہ فرنگی اور مگھ لٹیرے غلاموں کے ہاتھ چید چید کر اس میں رسیاں ڈال دیتے اور پردیسی مہاجنوں کے ہاتھوں فروخت کردیتے ہیں، اور پردیسی مہاجن انہیں جہاز کے نچلے اور اندھیرے حصے میں ڈال دیتے اور پردیس کی بندرگاہوں تک پہنچنے سے قبل انہیں یہاں سے نہیں نکالتے ہیں، اس دوران انہیں نہ کوئی کھانا دیا جاتا اور نہ پیاس بجھانے کے لئے پانی، یہاں نہ کسی کو سونے دیا جاتا اور نہ بیٹھنے کے لئے جگہ، ویسے نہ جانے کتنے بنگالی مسلمان کھائے پئے بغیر زندگی سے ہاتھ دھوڈالے ہوں گے، اور سب سے بڑی مصیبت تو یہ تھی کہ پردیس کی بندرگاہوں تک پہنچنے سے قبل یہاں کی کسی مردہ لاش کو بھی

نہ نکالا جاتا، یہاں جو مرجاتا وہ دوسروں کی موت کا سبب بن جاتا، یوں گلے سڑے مردوں کی بدبو سے کتنے انسانوں کی جانیں گئی ہوں گی، اس کا حساب نہیں''(۱)

غرض ان غلام فروختوں کے اندر محبت والفت، ایثار وہمدردی، درددودھڑکن یعنی انسانیت نام کی کوئی چیز نہیں تھی، انسانیت سے کوسوں دور ان کی زندگی تھی، وہ خود ایسی زندگی سے فخر کرتے تھے، ان کا مقصد صرف اور صرف غلام خرید فروخت کے ذریعے پیسہ کمانا تھا، عیش وعشرت، جاہ طلبی اور ارام کوشی ان کا اصلی مقصد ہوتا تھا، یہ دنیادار اور مادہ پرست انسان کسی کی بات سننا پسند نہیں کرتے تھے، وہ صرف مادہ ہی سمجھتے تھے، اور مادیت کے پیچھے بھاگنے کو اپنی سب سے بڑی کامیابی سمجھتے تھے، ویسے سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں غلام ایک سال میں یورپ اور امریکہ اور دنیا کے دوسرے تیسرے ممالک کو پہنچ جاتے تھے۔ مورخین کے مطابق یورپی آقا ان غلاموں کے ساتھ حیوانوں سے بھی بدتر سلوک کیا کرتے تھے، ان غلاموں کا جرم یہ تھا کہ وہ غلام تھے، انہیں بیماری میں کوئی علاج نہیں کیا جاتا، اور ایسی ایسی ذمہ داریاں انہیں سونپی جاتیں جنہیں نبھانا ان کی بس کیا بات نہیں ہوتی تھی، اگر کسی بیماری کی شدت کی وجہ سے اپنی ذمہ داریاں نہ نبھا سکتے تو آقا انہیں ایسی ایسی سزائیں دیتے کہ جن کے تصور سے دل دہل جاتا اور آنکھیں اشکبار ہوجاتی ہیں، اس حالت میں یورپ کے وہ انسان نما حیوان اپنے غلاموں کو لوہوں کے گرم سلاخوں کے ذریعہ ہوش واپس لانے کی ناکام کوشش کرتے تھے، ایک طرف بیماری کی شدت تو دو سری طرف مختلف اقسام کی سزاؤں کی تاب نہ لاکر اس حالت میں جان بحق ہوجاتے تھے، الغرض ان ساری چیزوں کے تصور نے الاول کی آنکھوں سے گزارش کی کہ وہ کم سے کم دو گھڑی کے لئے آنسو بہا کے اپنے دل کو سنبھالا دے، اب ان کے لئے صرف دعا کے علاوہ اور کوئی چیز باقی نہیں رہی۔

ظاہر ہے کہ ابھی الاول اپنے بچپن کی دیوار سے بلند نہ تھے، ایک طرف مصیبت اور مستقبل کی سوچ تو دوسری طرف اپنے شہید والدہ کی یادیں ستارہی تھیں، علاوہ ازیں اپنے دوستوں، یاروں اور مددگاروں کے سینکڑوں چہرے ان کے سامنے حاضری دے رہے تھے، یوں ان کی یادوں میں الاول آنسو بہا رہے تھے، اور سوچ رہے تھے کہ ان سے ملاقات کبھی بھی نہیں ہوسکتی۔

(۱) نورالاسلام مانیک، عظیم شاعر الاول، ص: ۲۸۔

پھران یادوں کی دنیا میں ماں کی الفت ومحبت، پیار وشفقت نے ان کے دل کو زخم سے چور کر رہا تھا، خیر والد تو شہید ہو گئے، لیکن ماں تو تڑپ تڑپ کر جان کھپا رہی ہوگی، اب ماں کی یاد آئی تو آنسوؤں کے انتھک سلسلے گرنے شروع ہو گئے، زخم سے چور الاول یادوں اور تذکاروں کی دنیا میں کبھی کبھی بے ہوش ہونے لگے، کبھی ہوش آتی تو اسے پوچھنے والا تک کوئی نہ تھا۔

الاول ارکان کے بازار میں

الاول کو تقریباً بیہوشی کی حالت میں ارکان کے بازار میں لے جایا گیا، بازار کے شور وغل وآواز وغوغا نے الاول کے اندر والے شعور واحساسات کو جگایا، ویسے ہوش آیا تو دیکھا کہ ان کے پورے جسم لوہے کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے اور وہ درجنوں قیدیوں کے درمیان ہیں، یہ سارے انسان قیدی تو تھے ہی مگر ہر ایک زخم سے چور اور بھوک وپیاس سے نڈھال، کسی کے کان میں زخم تو کس کی آنکھ میں، کسی کے سر میں زخم ہے تو کسی کے پیٹ میں، کوئی پورا بیہوش ہے تو کوئی نیم بے ہوش، کسی کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہا ہے تو کسی کے سر سے خون بہہ رہا ہے۔

تھوڑی ہی دیر میں ایک ناشائستہ قسم کا مگھ سامنے آکر مگھی زبان میں کہا کہ ان قیدیوں کے سامنے تھوڑے سڑے ہوئے چاول دیا جائے، ویسے ایک گھنوار نے ان قیدیوں کے سامنے تھوڑے سڑے ہوئے چاول ڈال دیا، ویسے سارے قیدیوں نے ان سڑے ہوئے چاولوں کو من وسلوی کی طرح کھالیا، لیکن الاول چاہتے ہوئے بھی کھا نہ سکے، ظاہر ہے کہ یہ قیدی ایک طویل عرصے سے بھوکے پیاسے تھے، چنانچہ وہ کھانے پر ایسے ٹوٹ پڑے کہ شاید وہ زندگی کا آخری یا پہلا کھانا کھا رہے ہوں۔

الاول نے خدا کا نام لے کر مٹی پر ٹیک لگا کر بیٹھنے کی کوشش کی تو ڈاکوؤں کا سردار مارے خوشی کے چلا اٹھا اور شور مچاتے ہوئے بولا کہ شیطانو! خوش خبری سنو کہ اس لونڈے کا ہوش واپس آیا ہے، اس کے اس شور وغل نے اس کے سارے ساتھیوں کو مدہوش ومتوالا کر دیا تھا، اور سارے کے سارے مگھ چلا اٹھے اور بولے کہ یہ لونڈا بڑا خوبصورت ہے، اس کی بھاری قیمت ہونی چاہئے۔

ادھر کرسیوں پر چند مہاجن بیٹھے ہوئے تھے، ابھی نیلامی کا کام شروع ہوا تو ہر ایک مہاجن غلام خرید رہا تھا، اور ہر ایک پردیسی مہاجن اپنے اپنے غلاموں کی ہتھلیوں کو چیدتے ہوئے اس پر رسی ڈال کر لے جا رہا تھا، یوں ان قیدیوں کی چیخ وپکار اور نالہ وبکا سے آسمان وزمین نہیں بلکہ جمادات ونباتات بھی رو رہی تھیں، شاید چشم فلک نے ایسے مظالم اور کہیں دیکھے ہوں گے، یوں آن کے آن میں یہاں چند زخمی

قیدیوں کے علاوہ سارے فروخت ہو گئے تھے۔

بالآخر ایک مہاجن الاول کی طرف متوجہ ہوا، اس نے الاول کے پورے جسم کو تاک تاک کے دیکھنے کے بعد قیمت دریافت کی تو:

مگھی سردار: کیا یہ لڑکا آپ کو پسند ہے؟

مہاجن: نہیں اتنے زیادہ پسند نہیں ہے، کیوں کہ وہ شدید زخمی ہے، تاہم مجھے ایک لونڈا کی سخت ضرورت ہے، چونکہ اس لونڈا کی عمر بہت کم ہے تو ہوسکتا ہے کہ قلیل مدت میں اس کا زخم مندمل ہوجائے گا، بایں ہمہ میرا پسند تو قیمت پر مدار ہے، بولئے کہ اس کی قیمت کیا ہے؟

مگھی سردار: اس لونڈا کی قیمت بیس روپئے ہیں۔

مہاجن: نے مذاق اڑائے ہوئے کہا کہ ایسے زخمی لونڈا کی قیمت بیس روپئے؟؟

مگھی سردار: ہاں بیس روپئے سے کسی بھی طرح کم میں نہیں ہوگا۔

مہاجن: نے اپنی غصیلی طبیعت کو سنبھالتے ہوئے کہا کہ میرے پاس صرف بارہ روپئے ہیں، منظور ہے تو دے سکتے ہو! اور یاد رکھو کہ ہم روشنگ راج دربار کے لوگ ہیں، کسی باہر کے مہامن نہیں، ہمیں گھوڑے کے اصطبل کے لئے مزید چند غلاموں کی ضرورت ہے۔

مگھی سردار: نے اب سوچا کہ یہ تو روشنگ راج دربار کے لوگ ہیں، بات لمبی ہوگی تو نہ پیسہ ملے گا اور نہ لونڈا، جتنے وہ دے رہے ہیں اتنے پر بس کرنا بہتر ہوگا، یہ سوچ کر

مگھی سردار: نے کہا کہ حضور کیا چند روپئے اور بڑھا سکتے ہیں؟

مہاجن: نے ذرہ منہ بناتے ہوئے بولا کہ بارہ روپئے میں ہوسکتا ہے تو بہتر ورنہ ہم سے کچھ نہیں بنے گا۔

ویسے مگھی سردار نے روشنگ راج دربار کے اس مہاجن کے ہاتھوں الاول کو فروخت کر دیا، الاول یوں تو زخم سے چور اور بھوک و پیاس سے نڈھال تھے، پھر بھی ذرا لڑکھڑاتے ہوئے اٹھے اور تھوڑی دور چلنے کے بعد پھر گر پڑے، تاہم راج دربار کا مہاجن کسی قدر رحم دل آدمی تھا، یوں اس مہربان نے الاول کو پیار سے سنبھالا دیا اور دارالسلطنت کی طرف چل پڑا۔

الاول ارکان کے راج دربار میں

الاول کا آقا ارکانی مہاجن ایک دولت مند آدمی تھا، جس کے پاس گھوڑے کا ایک بڑا اصطبل تھا، اس نے یہاں لا کر الاول کو اس اصطبل کا رکھوالا بنا دیا، یوں اس اصطبل خانے کی دیکھ بھال میں الاول کی زندگی کے سنہرے اوقات کٹتے جا رہے تھے، چوں کہ الاول ایک ایمان دار انسان تھے، یوں انہوں نے ہر ایک امر کو ان کا اپنے مقدر کا فیصلہ جان کر خوشی خوشی سے منظور کر لیا تھا۔

بایں ہمہ مقدر کو ملعون ٹھہراتے ہوئے الاول بیٹھے ہوئے بھی نہ تھے، انہوں نے رات و دن کے بڑے حصے کو اصطبل خانے کی دیکھ بھال میں گزارنے کے ساتھ اپنی کچھ درمیانی فرصت کو اپنی زندگی اور اپنے روشن مستقبل کی فکر میں لگا دیا، کیوں کہ الاول خوب جانتے تھے کہ مصیبت اور دکھ اہل ایمان کے لئے امتحان ہوا کرتا ہے، اس سے وہ انسان جیت کر نکل سکتا ہے کہ جس نے اسے خوشی خوشی سے منظور تو کر لیا لیکن ہار ماننے کو تیار نہیں ہوا، الاول مزید جانتے تھے کہ آزمائش کے ذریعے اہل ایمان کی جیت ہوتی اور اہل طاغوت کی ہار، اللہ تعالی کی طرف سے آنے والے امتحانات اور آزمائشوں میں بہر صورت اہل ایمان کی جیت ہوا کرتی ہے اور باطل کی ہار یقینی ہے، اللہ تعالی نے انسان کو عقل و فکر، دل و وجدان کے ساتھ ساتھ شعور و احساس بھی بخشا ہے، اہل ایمان ان ساری چیزوں کو استعمال میں لا کر اللہ تعالی کی مہربانی کے سہارے روشن اور بامراد، باثمر اور با مقصد زندگی کے حصول کے لئے کوشاں ہوتا ہے، ویسے الاول نے دل ہی دل میں کہا کہ:

> ”اللہ نے عقل دی، ہاتھ پاؤں دئے، ایک روشن دل دیا اور خوبصورت جسم بخشا ہے، کیوں نہیں میں خدا کی ان بخششوں کے سہارے اپنی زندگی کو روشن اور تاباں کر سکتا، ظاہر ہے کہ سخت ترین مشقت اور جانفشانی کئے بغیر کوئی بھی انسان زندگی کے اس طویل اور وسیع میدان میں اتر تو سکتا لیکن کامیاب نہیں ہوسکتا ہے، اتر تو سکتا ہے لیکن معرکۂ کرب و بلا میں اس کی جیت نہیں ہوسکتی، اور میدان عمل میں ایک عقل مند انسان کے سر پر جو بھی ذمے داریاں اور فرائض عائد ہوتے ہیں،

> انہیں دھوکہ دہی کے ذریعے وہ کبھی بھی کامیاب نہیں ہوسکتا، کامیابی کے لئے اسے میدان عمل وتطبیق میں ایمان داری اور امانت شعاری کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے''۔

حضرت الاول نے سخت ترین مشقت اور جانفشانی کو اپنی ترقی اور روشن مستقبل کا وسیلہ وزینہ اور اپنی تاباں زندگی کے لئے ایک گنج گرانمایہ مان لیا، اورعزم کرلیا کہ کسی بھی قیمت میں غفلت اور خودفریبی کی خطرناک عفریت کو اپنے قریب بھی نہیں پھٹکنے دیں گے، یوں الاول مشقت اور جانفشانی کے میدان میں کود پڑے، اور چند دن کے اندر اپنی ذمے داری کے احساسات، وفاشعاری، اور کام سے لگن کے سہارے چاردانگ عالم میں مشہور ہوگئے تھے، ویسے ان کی زندگی روشن ہونے لگی اور مقدر کے ستارے طلوع ہونے لگے تھے۔

اتنے دنوں تک الاول اصطبل خانے کا ایک عام نوکر تھے، اب آپ کو سردار بنادیا گیا، سردار ہونے بعد مشقت بھرے کاموں سے کسی قدر فارغ بھی ہوگئے، بالآخر اصطبل خانے سے رہائی بھی ملی اور اس سے گلوخلاصی کے بعد آپ ارکانی فوج میں بھرتی ہوگئے تھے۔

فوج میں بھرتی ہونے کے بعد الاول کے ذمے اتنے کام نہ تھے جتنے پہلے تھے، بس صبح وشام فوجی تربیتی پروگرام میں شرکت کرنی تھی، اور اس کے علاوہ پورے دن کام کاج سے تقریبا فارغ رہتے تھے، اب الاول کے لئے ایک سنہرا موقع ہاتھ آیا، یوں آپ وقت اور فرصت کو غنیمت جان کر پڑھائی اور مطالعہ میں مشغول ہوگئے، آپ اپنے ایک ایک منٹ کو علم کے میدان میں صرف کرنے لگے تھے۔

اس طرح آپ نے بڑی قلیل مدت میں علم وفن کی ایک اچھی خاصی لائبریری اپنے دماغ میں اتارلی، آپ نے اپنی فرصت کو بجا طور پر کام میں لاتے ہوئے مختلف علوم وفنون کی کتابوں کو کنگھال ڈالا، ادب وشاعری کے علاوہ مختلف فنون کی کتابوں کی ورق گردانی کی، ساتھ ہی ساتھ مختلف اقوام کی زبان و ادب میں بھی خاصی مہارت حاصل کرلی، چونکہ اسی زمانہ میں روشنگ کے راج دربار میں مختلف قوموں کے ادباء، شعراء اور انشاء پرداز کام کیا کرتے تھے، تو ان سے آپ نے خوب خوب استفادہ کیا، یوں بہت قلیل مدت میں عربی، فارسی، سنسکرت اور پالی زبانوں میں اچھی خاصی مہارت حاصل کرلی، اور ساتھ ہی ساتھ انگریزی اور ترکی زبانوں کو بھی حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔

ویسے ابھی چندسال بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ الاول کے علمی ذوق وشوق اور فنی مہارت ولیاقت اور

ادبی استعداد کی شہرت پورے روشنگ راج میں عام ہوگئی تھی، لوگ دور دراز سے آپ کے پاس آنے لگے اور علم وفن اور فکر وتدبر کے حوالے سے آپ کے کارآمد مشورے سے مستفید ہونے لگے تھے، آپ کی اپنائی ہوئی راہ کو اپنانے اور آپ کی دکھائی ہوئی راہ کو اپنے اپنے روشن مستقبل کا واحد وسیلہ سمجھنے لگے تھے، اس طرح الاول چندسال کے اندر پوری سلطنت کے ایک عظیم علمی مربی، فنی مرشد اور فکر ونظر کے ایک عظیم شیخ مان لئے گئے تھے، اب آپ کی شخصیت کی شہرت ارکان سے تجاوز کرتے ہوئے دور دراز کے ملکوں تک پھیلنے لگی تھی۔

یہ تاجدار ارکان تھادومنترا کا عہد حکومت تھا، جس کا وزیراعظم ارکان کے ایک عظیم خادم ومربی حضرت قرشی ماگن ٹاکور تھے، جو ایک شریف زادہ ہونے کے ساتھ ایک عظیم پنڈت اور گیانی، ادیب و شاعر تھے، پھر ایک سلطنت کے وزیراعظم ہونے کے ساتھ بڑے علم دوست اور علماء وصلحا کے قدردان انسان بھی تھے، ان کے زمانے میں ارکان علم وعرفان کا گویا انوکھا گہوارہ بنا ہوا تھا۔

اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ علم وعرفان کی قیمت عالم اور عارف ہی سمجھ سکتے ہیں، بہرحال الاول کی ادبی اور فنی شہرت کے آوازہ سن کر وزیراعظم ماگن ٹاکور نے آپ کو بلاوا بھیجا، اور آپ کی آمد پر بڑی مسرت اور خوشی کا اظہار کیا تھا، حاضری کے دوران ان دونوں گیانیوں کے درمیان بہت سارے موضوعات پر گفتگو ہوئی، جس کے بعد ماگن الاول کی دماغی صلاحیت واستعداد اور ان کی نظر وفکر پر فدا ہوگئے تھے۔

بعدازاں ماگن نے الاول کی حال پرسی کی تو انہوں نے اپنی زندگی کی ساری داستان کرب وبلا ان کے سامنے کھول کھول کر بیان کی، جس سے ماگن نہ صرف متاثر ہوئے بلکہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے آنسو بھی بہا دیئے تھے، اس کے بعد ماگن نے کہا کہ جناب آج سے مجھے آپ اپنا ایک دوست سمجھیں گے تو یہ میری زندگی کی ایک بڑی کامیابی ہوگی، اور میں آپ کی بامقصد زندگی کی راہ میں قربان جانے کو تیار رہوں گا، آپ جبھی میری امداد، میرا تعاون ونصرت کی ضرورت محسوس کریں گے، میں آپ کو مثبت جواب دینے کی کوشش کروں گا، اور وعدہ کرتا ہوں کہ اس میں کسی قسم کی غفلت اور بے اعتنائی نہیں ہوگی، اگر چاہے خدا کرے۔

ماگن ٹاکور کی اس مخلصانہ نوازش کے جوب میں حضرت الاول نے فرمایا کہ:

> ''حضرت! آپ دیکھتے ہیں کہ اس ملک میں میرا کوئی رشتہ دار نہیں ہے، اب میں ایک

فوجی ہوں، اور جتنے بھی پیسے یہاں سے تنخواہ میں ملتے ہیں، بس یہی میرے گزارا کے لئے کافی ہیں، لیکن آج بڑی مدت کے بعد والدین کی الفت ومحبت کا جھونکا جو آپ کی طرف سے ملا ہے، یہ زندگی بھر یاد رہے گا، جس سے محسوس ہوتا ہے کہ اس ملک میں آپ کے سایۂ شفقت وکرم اور آپ کے آغوش الفت ومحبت نہ صرف میری اگلی روشن زندگی کے لئے ضرورت ہے بلکہ آپ کی کرم فرمائی میرے تاباں مستقبل کا ایک گنج گرانمایہ ہوگی، جس سے محظوظ ہو پانے کو میں ہر حال میں فخر محسوس کروں گا''۔(۱)

الاول کی ان گزارشات سے قدرے جذبات میں ڈوبے ماگن ٹاکور نے کہا کہ:

''فرنگی اور مگھ لٹیروں کے ہاتھوں آپ نے جو اپنے والد ماجد کو کھو دیا، ظاہر ہے کہ جو پھر سے ملنے والی چیز نہیں ہے، تاہم میرے پاس اس زخم کا مرہم تو ضرور ہو سکتا ہے، علاوہ ازیں مجھے اگر آپ کی خدمت کرنے کی توفیق ہو جائے گی تو میں اسے اپنی زندگی کا گنج گرانمایہ مانوں گا''۔(۲)

ماگن کی اس محبت بھری باتوں سے الاول قابو سے باہر ہو گئے تھے، اور دو قطرہ آنسو بہاتے ہوئے فرمایا کہ:

''جناب من! میں آپ کی اس محبت بھری باتوں کو کبھی بھی بھول نہیں سکتا، سچ تو یہ ہے کہ یہ بھلائی جانے والی چیز ہی نہیں ہے، اللہ تبارک وتعالی آپ کو مزید محبت، شفقت وعاطفت کی توفیق سے نوازے''۔(۳)

ماگن ٹاکو بڑے عالم، گیانی انسان تھے، الاول کے ذوق سلیم اور مزید طلب علم کی فریفتگی کو جان کر وہ بڑے خوش ہو کے کہا کہ:

آپ میرے کسی بھی خالی اوقات کو اپنے لئے غنیمت سمجھا کریں، اور مجھ سے درس لیا کریں، یوں اسی روز سے خالی اوقات میں ماگن نے الاول کو درس دینا شروع کر دیا، اس سلسلہ میں کبھی الاول ماگن کی

---

(۱) نورالاسلام مانیک، عظیم شاعر الاول، ص:۳۶۔

(۲) نورالاسلام مانیک، عظیم شاعر الاول، ص:۳۶۔

(۳) نورالاسلام مانیک، عظیم شاعر الاول، ص:۳۶۔

رہائش گاہ جاتے اور کبھی ماگن الاول کے یہاں آیا کرتے تھے، جس سے الاول کا بڑا علمی فائدہ ہوا، اس دوران کبھی کبھار ان دونوں گیانی شخصیتوں کے درمیان آپس میں علمی اور فنی موضوعات پر گفتگو بھی ہوا کرتی تھی، بہرحال الاول نے ماگن سے مختلف فنون کے درس لئے تھے، جن میں ادب و ثقافت، تاریخ وعلم تصوف اور شاعری وسنگیت قابل ذکر ہیں۔

الاول اور سنگیت وموسیقی

حضرت الاول کے تمام دواوین کو دوحصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، ہم پہلے حصے کے نظموں کو ان کے دواوین پدا پتی، سیف الملوک بدیع الجمال، تحفۃ النصائح اور سکندر نامہ وغیرہ میں دیکھتے ہیں، جب کہ دوسرے حصے کے وہ نظمیں ہیں جنہیں انہوں نے سنگیت کے درس دینے کے لئے وقتاً فوقتاً نظم کیا تھا، ان کے کلام کے اس دوسرے حصے کو سنگیت کی عام زبان میں راگ تال جاتا ہے۔

چونکہ الاول شروع ہی سے تزکیہ واحسان/تصوف سے متاثر تھے، تو ان کے کلام کے پہلے حصے میں صوفیاء کے تصرفات کی وہ ساری جھلکیاں نظر آتی ہیں، جو ہم بسا اوقات عجمی صوفیاء اور درویشوں کے کلاموں اور دواوین میں دیکھتے ہیں، الاول نے اپنے راگ تال والے نظموں میں عشق ووارفتگی اور الفت ومحبت کو بڑی اہمیت دی ہے، ان کی نظر میں عشق ووارفتگی خدائے لم یزل کی ایک ایسی نعمت ہے جو ہر انسان کو نہیں ملتی، ان کے نزدیک یہ بھی ہے کہ انسان کے لئے سب سے بڑی نعمت عشق ووارفتگی ہے، جس کے ناطے انسان ترقی کے مدارج طے کرتے ہوئے فنا کے درجہ تک پہنچ جاتا ہے، ان کا یہ بھی خیال ہے کہ عشق ووارفتگی ہی کے ذریعہ انسان فنا کے درجہ تک پہونچ سکتا اور جو ہی دراصل مقام بقاء ہے، اور جو انسان مقام بقاء تک پہنچ پاتا ہے وہ ''امر'' یعنی زندہ جاوید ہوجاتا ہے، شاعر کی ان باتوں سے وحدۃ الوجود والی آراء پیدا ہوجاتی ہیں، جنہیں ہم اکثر عجمی صوفیاء کے کلام، دواوین، خیالات اور کتابوں میں دیکھتے ہیں۔

الاول کے مطبوعہ دواوین کے علاوہ بھی غیر مطبوعہ دواوین کے چند قلمی نسخے دریافت ہوچکے ہیں، جنہیں یہاں کی عام زبان میں راگ تال کہا جاتا ہے، انہوں نے اپنے ان کلام میں اپنی شاعری کی جاذبیت وکشش کے ساتھ موسیقی کی لذت وحلاوت اور عشق ووارفتگی کا ثبوت پیش کیا ہے، ان میں ان کے ذوق سلیم اور سلامت طبع کے علاوہ ان کے علوم وفنون کی بلندی تک رسائی کا پتہ ملتا ہے۔

الاول کے یہ سارے کلام اس زمانے کے ہیں جس زمانے میں آپ ارکان میں سنگیت کے طالب علموں کو سنگیت کا درس دیتے تھے، شاید انہوں نے اس قسم کے بہتوں کلام نظم کئے ہوں گے، لیکن

ابتک صرف راگ والا ایک دیوان اور تال والے تین دواوین دریافت ہوچکے ہیں (۱) ان سارے دواوین سے ان کی شاعری کی بلندی اور خیالات کی وسعت اور راگ وراگنی کی مہارت کا ثبوت ملتا ہے، جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر ایک عظیم موسیقار اور باوقار فنکار تھے۔ (۲)

یوں تو الاول بچپن میں اپنے جنم استھان میں ہی سنگیت اور موسیقی کی دنیا میں قدم رکھ چکے تھے، لیکن ارکان پہنچنے کے بعد انہوں نے اس فن میں مزید تعلیم حاصل کی تھی، یہاں بعد میں انہوں نے سنگیت وموسیقی کی تحریک چلائی، جس کی وجہ سے آہستہ آہستہ پوری سرزمین میں ان کی شہرت عام گئی تھی۔

ایک روز وزیر اعظم ماگن ٹاکور نے راج دربار میں بادشاہ کے سامنے حضرت الاول کی شخصیت وسنگیت اور ان کی موسیقی میں استادانہ شان کی گفتگو چھیڑی تو بادشاہ نے ان کی موسیقی اور سنگیت سننے کی آرزو ظاہر کی، اور جلد ایک بلاوا بلانے بھیج دیا گیا تھا۔

بلانے والے سفیر نے الاول کو بڑی عزت واحترام کے ساتھ دربار سلطان میں لے گیا، الاول نے بڑے درد اور مدبھری آواز میں چند نغمے سنائے، ایک طرف ان کی موسیقی کی زیر وبم کا جادو تو دوسری طرف ان کی سریلی آواز نے نہ صرف راجا، بلکہ پورے دربار کو مخمور اور مسحور کردیا تھا، راجا مارے خوشی کے مدہوش ہوگیا تھا، اور درباریوں نے بھی داد تحسین کا ایک طویل سلسلہ شروع کردیا تھا۔

یہ ایک ایسا زمانہ تھا کہ جس میں یہاں کے بادشاہ سمیت مسلمانوں کے دل ودماغ میں سنگیت اور موسیقی کا راج تھا، اس زمانے میں مسلمانوں کی بعض بستیوں میں موسیقی کے فنکار اور سنگیت کے اساتذہ رہا کرتے تھے، پوری سرزمین میں موسیقی اور سنگیت کا اچھا خاصا دھوم تھا، شادیوں، عقیقوں اور خوشیوں کے مواقع میں سنگیت کے اساتذہ اور موسیقار آیا کرتے تھے، غرض سرزمین ارکان میں موسیقی کا خوب چرچا تھا، اب خود راجا کی زبانی الاول کی داد تحسین کی گفتگو عام ہوئی تو لوگ ہر کجا الاول نامی شمع کے پروانے ہوگئے تھے، موسیقی اور سنگیت سے دلچسپی رکھنے والے بغیر الاول کے گویا ماہی بے آب بن گئے تھے، اب لوگوں نے ان سے یہ عرض کرنا شروع کردیا کہ جناب من! آپ ہمیں بھی سنگیت

---

(1) تفصیل کے لئے دیکھئے ڈاکٹر احمد شریف کے زیر اہتمام نکلنے والے راگ تال سنگیت، بنگلا اکیڈیمی، ڈھاکہ، جولائی: ۱۹۶۷ء۔

(۲) فوتی کا تعارف، ڈھاکہ یونیورسیٹی، ص: ۳۱۷۔

وموسیقی کی تعلیم دیں گے تو یہ آپ کا بہت بڑا کرم اور احسان ہوگا، چونکہ اب الاول اس فن کا ایک بے تاج بادشاہ بن چکے تھے، تو ان کے سامنے یہاں کے شاعر وموسیقار سورج کے سامنے ستارے بن گئے تھے (دراصل آپ کے سنگیت اور موسیقی پر گفتگو کے لئے ایک طویل مقالہ کی ضرورت ہے، جو اس عجالے میں گنجائش نہیں ہے) آپ اپنے تلامذہ کو عام اساتذہ کی طرح سنگیت اور موسیقی کی تعلیم نہیں دیتے تھے، تعلیم کے دوران آپ سنگیت اور موسیقی کی ایک ایک راگ وراگنی پر بحث کرتے اور اسے تربیت وریاض کے ذریعے خوب ذہن نشین کراتے تھے، الاول تلانده کے ذہن ودماغ میں اسے بٹھانے کی بڑی مہارت بھی رکھتے تھے، اور تلامذہ کو سنگیت اور موسیقی کی تعلیم دینے کے لئے نغمے بھی لکھتے تھے، جنہیں آج کی دنیا راگ تال کے نام سے جانتی پہچانتی ہے۔

عرض پورے ملک میں آپ کی غزل وسنگیت اور موسیقی کا دھوم مچا ہوا تھا، حتی کہ ارکان کی افواج میں نہیں بلکہ بچے بچوں کی زبانوں میں ان کے نغمے سنائے دینے لگے تھے، لوگ آپ کی نغمہ سرائی اور غزل سنجی پر فدا و دیوانے ہوگئے تھے، اور سب کو معلوم ہو گیا تھا کہ الاول ایک بڑے موسیقار اور عظیم غزل سرا شاعر ہیں۔

تیسرا باب

علاول کی زندہ کاوش پدا پتی

الاول کے اندر شاعری کی جو خوبیاں اور رعنائیاں چھپی ہوتھیں ماگن ٹاکور اس سے واقف تھے، اور اس کے علاوہ الاول کی بعض غزل اور بعض نظموں کے مطالعہ سے ان کو یقین ہو گیا تھا کہ الاول ایک بلند پایہ کے شاعر ہیں۔

ایک روز راج دربار میں بہتوں ادباء، شعراء اور فنکار اور موسیقار موجود تھے، الاول بھی وہاں تشریف فرما تھے، مختلف اور متنوع علمی وادبی موضوعات پر گفتگو چھیڑی تو علماء وادباء اپنے اپنے عالمانہ وادیبانہ خیالات وآراء ظاہر کررہے تھے، ساتھ ہی ساتھ شعراء اپنے اپنے کلاموں سے انجمن کو محو ومگن بنا رہے تھے، دوران گفتگو ہندوستان کے عظیم صوفی شاعر مالک محمد جوشی کی "پدا پت" کی بات چھڑ گئی تھی، پدا پت کے متعلق چھیڑی ہوئی گفتگو سے ماگن ٹاکور کے اندرونی احساس میں آگ سی لگ گئی تھی، تھوڑی دیر بعد انہوں نے مارے خوشی کے طربناک ہوکر کہا کہ:

> "عظیم ہندوستان کے عظیم شاعر مالک محمد جوشی کے ہندی زبان میں لکھا ہوا دیوان" پیدا پت
> "یہ ایک عظیم المرتبت دیوان ہے، جس کی نظیر دنیا کی کسی شاعری میں ملنی مشکل ہے، اگر اسے بنگلہ زبان میں ترجمہ کیا جائے تو نہ صرف بنگلہ زبان کے ادب وشاعری میں ایک اہم اضافہ ہوگا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ یہ بنگلا زبان وادب پر ایک بڑا احسان بھی ہوگا (۱)

باجودیکہ ماگن ٹاکور خود بھی ایک عظیم المرتبت شاعر اور غزل سرا تھے، لیکن وزارت کی ذمے داریاں اور وہ بھی وزارت عظمی جیسے ایک اہم فریضہ کو نبھانا ایک مشکل کام تھا، تو اس حالت میں پدا پت جیسے ادبی اور

(۱) نورالاسلام مانیک، عظیم شاعر الاول، ص: ۴۰۔

فنی زبان میں لکھے گئے دیوان کا ترجمہ ان کی بس کی بات نہ تھی، تو وجہ یہی تھی کہ وہ اس کے ترجمہ کرنے سے معذور تھے، اب سوال آیا ہوا تھا کہ وہ کون ہے جو مالک محمد جوشی جیسے فنکار اور عظیم المرتبت شاعر کے دیوان کو بنگلہ زبان میں ترجمہ کر کے عہدہ برآ ہو سکے؟ ایسی حالت میں ماگن ٹاکور الاول کی طرف متوجہ ہو کے کہا کہ:

''جناب الاول صاحب! آپ نے تو قبل ازیں بہتوں اچھے اچھے کلام لکھ چھوڑے، اور اچھی اچھی غزل تحریر کی، میرے نزدیک شعر وشاعری میں آپ جیسے ذوق سلیم کے مالک انسان کم سے کم اس ملک میں اور کوئی نہیں ہے، علاوہ ازیں آپ ہندی زبان میں بھی ایک ماہر انسان ہیں، میرے خیال میں مالک محمد جوشی کی کتاب ''پداپت'' کا ترجمہ کرنا صرف آپ کی بس کی بات ہے، اگر آپ اس طرف اپنی توجہ مبذل کرنے کی تکلیف گوارہ کریں گے تو میرا یقین ہے کہ آپ بہت کم مدت میں کامیابی سے ہمکنار ہو جائیں گے''(۱)

ماگن ٹاکور کی اس نیک آرزو کے جواب دیتے ہوئے الاول نے فرمایا کہ:

''حضرت! پداپت میں نے چند مرتبہ پڑھی، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ ایک غیر معمولی دیوان ہے، باوجودیکہ شاعر نے ایک داستان کے روپ میں یہ دیوان تحریر کیا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ ان کے قلم سے علم وعرفان کا بہتا ہوا دھارا چل پڑا ہے، تاہم یہ الگ بات ہے کہ اس پیش قیمت دیوان کے مطالعے کے دوران میری بھی تمنا یہی تھی کہ اسے بنگلا زبان میں ترجمہ کیا جائے، تمنا تو تھی اور ہے مگر میری صحت اس جیسے ایک بڑے کام کے لئے تیار نہیں تھی، یوں میری ہمت نے بار بار جواب دے بیٹھا تھا، باوجودیکہ میں نے اب سے پہلے بہتوں کلام لکھے، لیکن مالک محمد جوشی کے غیر معمولی دیوان کا ترجمہ میرے بس کی بات نہیں ہے، علاوہ ازیں میں ترجمہ کے میدان سے بھی ناواقف ہوں، اس لئے بھی میں ایسی ایک عظیم ذمہ داری اٹھانے سے قاصر ہوں''(۲)

ماگن نے پھر کہا کہ جناب من! ہمت سے کام لیجئے، اللہ رب العالمین کے نام لے کر شروع کر دیجئے،

---

(۱) نورالاسلام مانیک، عظیم شاعر الاول، ص: ۴۰۔

(۲) نورالاسلام مانیک، عظیم شاعر الاول، ص: ۴۱۔

انشاء اللہ آپ ضرور کامیاب نکلیں گے، امید ہے کہ آپ کی کشتی جلد ساحل پر جا لگے گی۔

الاول نے بالآخر ماگن کی عرض کو ٹال نہ سکا، ویسے ۱۶۴۶ء کو آپ نے بنگلہ زبان میں پداپت کے ترجمے کا کام بنام ''پداپتی'' سے شروع کر دیا، آپ نے ترجمہ کردہ چند صفحات ماگن کو پڑھ سنایا تو وہ بڑے خوش ہو کے کہا کہ:

''پداپت کو میں نے بہتوں مرتبہ پڑھا، لیکن ترجمے میں جو لذت وحلاوت محسوس ہو رہی ہے وہ اصل کتاب میں بھی محسوس نہیں ہو پائی تھی، اس کتاب میں اتنی زیادہ خوبیاں، رعنائیاں اور لذتیں ہیں کہ سچ تو یہ ہے کہ جن سے اس سے پہلے میں محظوظ نہیں ہو پایا تھا، الاول صاحب! آپ نے بہت بڑا کمال کر دیا، اور مجھ جیسے پر بڑا احسان بھی کیا ہے، اللہ تعالی سے دعا ہے کہ وہ آپ کو مزید توفیق سے نوازے''(۱)

دراصل الاول کی زبان میں جادو بھرا ہوا تھا، پر موسیقی کی حلاوت ولذت اور زبان وبیان کی ندرت و لطافت نے ترجمہ کو ترجمہ نہ رکھا بلکہ اسے ایک الگ تلک دیوان بنا دیا ہے، مالک محمد جوشی نے جن جن مقامات کی گفتگو اپنے دیوان ''پداپت'' میں چھیڑی ہے، الاول نے اپنی مصوری کے فن سے انہیں آنکھوں کے سامنے پھر دیا ہے، جنہیں پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ یہاں جن جن مقامات کی تصویر کشی کی گئی ہے وہ مقامات پڑھنے والوں کی آنکھوں کے سامنے عیاں پھر رہے ہیں۔

شک نہیں ہے کہ الاول سنسکرت اور پالی کے علاوہ بھی عربی اور فارسی زبان میں یدطول رکھتے تھے، مگر انہوں نے اپنی شاعری میں عربی اور فارسی زبان کے الفاظ کو بے ضرورت داخل نہیں کیا ہے، یعنی آپ نے عربی اور فارسی الفاظ کو اس وقت استعمال کیا ہے جب وہ اپنی زبان ''بنگلا'' میں کسی الفاظ کے کھوج نکالنے میں شدید سے شدید تر قاصر رہے ہوں، تاہم سچ تو یہ ہے کہ یہاں بعض ضروری عربی اور فارسی الفاظ کے استعمال سے بنگلا زبان میں کوئی بھی خرابی آنے کے بجائے زبان کو مزید ندرت، لطافت اور سحر آفرینی سے بھر دیا ہے، اس حوالے سے امرتو لال بالا صاحب رقمطراز ہیں کہ:

''الاول عربی اور فارسی زبان کے ماہر انسان تھے، لیکن انہوں نے بے ضرورت

---

(۱) نورالاسلام مانیک، عظیم شاعر الاول، ص: ۴۱۔

عربی اور فارسی الفاظ کو بنگلہ زبان کے اندر داخل کر کے زبان و بیان کو بوجھل نہیں کیا، تاہم بعض مواقع میں عربی اور فارسی الفاظ کے داخل کئے جانے کی وجہ سے ان کی زبان میں خرابی آنے کے بجائے خوبی اور رعنائی بڑھ گئی ہے، علاوہ اس کے کہ دیکھا جاتا ہے کہ عربی اور فارسی الفاظ جو یہاں پائے جاتے ہیں (جو اسلامی تہذیب و ثقافت کے آئینہ دار ہیں) الاول کی یہ پداپتی خود ان کے اسلامی رجحانات وتخیلات کی مرہون منت اور صوفیانہ فکر وفلسفہ کا نتیجہ ہے‘‘۔(۱)

ایک روز الاول نے اور کچھ ترجمہ شدہ کلام ماگن کو پڑھ سنایا، ماگن نے کھڑا ہو کر آپ کو اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا کہ:

’’آپ نے آج جو مجھے پڑھ سنایا ہے اس کی خوبی اور رعنائی، لطافت وندرت کی نظیر شاید ہی کہیں ملتی ہوگی، پداپتی لکھ کر آپ نے خود اپنی زندگی پر بھاری احسان کیا ہے، میرا یقین ہے کہ آپ کی اس زندہ کاوش نے آپ کو ایک سرمدی انسان بنا دیا ہے، خدا کرے تو آپ انسانوں کے درمیان تا قیامت زندہ جاوید رہیں گے‘‘۔

یوں ماگن کی ہمت افزائی نے الاول کو اور بھی صاحب ہمت وحوصلہ بنا دیا، اب آپ نے اپنے من دھن، قدرت وقوت کو ترجمہ یا ترجمانی کے کام میں لگا دیا، ویسے آپ نے اپنی زندگی کے ایک ایک منٹ کی قدردانی کرتے ہوئے بالآخر ۱۶۵۲ء کے کسی مہینے میں اس بیش قیمت ترجمہ یا ترجمانی کے کام کو مکمل کر لیا، بعد ازاں الاول کی یہ زندہ جاوید کاوش طبع ہو چکی تو ہر سمت سے الاول الاول کی آوازیں آنی شروع ہو چکی تھیں، جو بھی اسے ایک مرتبہ پڑھا یا سنا انہی داد تحسین یا خراج عقیدت پیش کئے بغیر نہیں رہ سکا، ویسے ہر جانب سے خراج محبت وعقیدت کے گلدستے آنے شروع ہو گئے تھے۔

جہاں تک ہم دیکھتے ہیں کہ الاول کی دوسری تیسری کاوشوں میں یہ سب سے اہم اور زندہ کاوش ہے، جس کے متعلق امرتولال بالا صاحب رقمطراز ہیں کہ:

’’ارکان کے راج دربار میں دولت ماضی کے انتقال کے بعد سید الاول تشریف

(۱) امرتولال بالا، الاول کے کلام میں ہندو مسلم ثقافت، ص: ۷۷۔

لائے، پداپتی شاعر الاول کا سب بڑا کارنامہ ہے، اسی دیوان میں ان کی شاعری کا گل کھلا ہے، اسی لئے ہم اسے شاعر کا گل سرسبد کہتے ہیں، جسے انگریزی میں MASTER PEASE کہا جاتا ہے، اور اسے ۱۶۴۶ء تا ۱۶۶۲ کی درمیانی مدت میں ارکانی سلطنت کے وزیر اعظم مرحوم قرشی ماگن ٹاکور کی فرمائش پر لکھا گیا تھا، یہ عظیم ہندی شاعر ملک محمد جوشی کے دیوان کا آزاد ترجمہ ہے‘‘۔(۱)

ایک روز راج دربار میں الاول بلائے گئے، شاعر یہاں پہنچے تو دربار کے سارے علماء اور ادباء نے آپ کی آمد پر خوشی ومسرت کا اظہار کیا، اور ہر طرف سے داد تحسین کے گلدستے پیش ہونے لگے تھے، الاول نے ان سارے گلدستے ہاتھ لیتے ہوئے فرمایا:

’’اس زندہ کاوش کی نسبت سے آنے والے گلدستوں کا مستحق فقیر نہیں ہے، فقیر نے جس زندہ دل گیانی اور دردمند پنڈٹ کی ہمت افزائی سے یہ کام مکمل کیا ہے، دراصل ان گلدستوں کے حقدار وہی ہیں، فقیر کا مطلب ہے کہ اگر آپ حضرات اس کاوش کی نسبت سے خراج تحسین پیش کرنا چاہتے ہیں تو سرزمین ارکان کے اس گیانی انسان کو پیش کریں، جس کا نام وزیر اعظم ماگن ٹاکور ہے‘‘۔

الاول کی اس محبت بھری گفتگو سنتے ہوئے ماگن ٹاکور کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، اور کہا کہ:

’’دراصل گیانی اور پنڈتوں کے انداز کلام اور طرز بیان ہی ایسا ہوتا ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ میں نے شاعر کو ہر وقت اپنا نیک مشورہ دیا، اور ہر حالت میں ان کے حق میں دعائیں دی تھیں، اللہ تعالی کا شکر ہے کہ جسے شاعر کے اس زندہ کاوش کو تابندہ بنایا اور شاعر کو اپنی کوشش میں کامیابی سے ہمکنار کیا ہے‘‘۔

اسی روز الاول کو روشنگ (ارکان) کا قومی شاعر تسلیم کر لیا گیا، اس روز الاول جیسے ایک مصیبت زدہ انسان کی تقدیر جاگی اور ان کے مقدر کا ستارہ چمک اٹھا، اور آپ نے دربار خداوندی میں اظہار تشکر کرتے ہوئے فرمایا کہ:

(۱) امرتولال بالا، الاول کے کلام میں ہندو مسلم ثقافت، ص: ۷۷۔

''جس خدائے برتر نے مجھے اس زندہ کاوش تحریر کرنے کی توفیق سے نوازا، سچ تو یہ ہے کہ یہ فقیر بےنوا اس خدا کے شکر بجالانے سے قاصر ہے، پھر بھی اللہ تعالی کے حضور یہ دعا ہے کہ وہ اپنے رحم وکرم سے مجھے علم وفن، ملک وملت کی مزید خدمات کی توفیق سے نوازے، آمین یارب العالمین''۔

شاعر نے اپنی اس زندہ کاوش ''پدا پتی'' میں رسول انسانیت، پیمبر خیر و برکت صلی اللہ علیہ وسلم کی دل کھول کر تعریفیں کی ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زندہ اخلاق اور تابند شمائل کے متعلق کچھ چیزیں تحریر کیں، اس حوالے سے امر تولال بالا صاحب رقمطراز ہیں کہ:

''پدا پتی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم کے اخلاق وشمائل کے متعلق بیان ہے، جس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ شاعر قرآن وسنت اور سیرت وسوانح کے بڑے عالم تھے، جو مالک محمد جوشی کے دیوان میں نہیں ہے''۔(۱)

مالک محمد جوشی نے جس جگہ اپنے ہم عصر ہندوستانی شہنشاہ شیر شاہ سوری کی مدح سرائی کی ہے، وہاں الاول نے اپنے ہم عصر ارکانی بادشاہ اور وزیر اعظم ماگن ٹاکور کی مدح سرائی کی ہے، الاول نے ارکانی راجا تھادومترا کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ:

''بادشاہ تھادومترا ایک دینی اور مذہبی انسان ہے''(۲)

اوران دونوں کی تعریف کے ساتھ ارکان کے دار السلطنت کے متعلق جو بیان دیا اس سے اندازہ کیا جاتا ہے کہ الاول کے زمانے میں دار السلطنت روہانگ/ روشنگ برصغیر ہندوستان اور یورپ کے علاوہ بھی دنیا کے مختلف باشندوں اور متنوع تہذیبوں وثقافتوں کی حامل اقوام کا گہوارہ بنا ہوا تھا، اور دنیا کے کونے کونے سے مختلف قسم کے لوگ سمیٹ سمیٹ کر یہاں تشریف لائے ہوئے تھے، اور اسی زمانے میں یہ شہر ایک مہذب شہر میں تبدیل ہو گیا تھا۔(۳)

---

(۱) امر تولال بالا، الاول کے کلام میں ہندو مسلم ثقافت، ص: ۹۴۔

(۲) امر تولال بالا، الاول کے کلام میں ہندو مسلم ثقافت، ص: ۹۸۔

(۳) امر تولال بالا، الاول کے کلام میں ہندو مسلم ثقافت، ص: ۹۵۔

پدا پتی کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شاعر الاول اپنے مرشد برحق عظیم ارکانی صوفی حضرت شیخ فرید الدین رحمۃ اللہ علیہ کو دل وجان سے محبت کرتے تھے، چنانچہ آپ پدا پتی میں رقمطراز ہیں کہ:

''آپ حضرات میری یہ بات ماننے کو تیار نہیں ہیں تو شیخ فرید الدین کی کتاب ''منطق الطائر'' کا مطالعہ کریں، اور یاد رہے کہ شیخ فرید الدین ایک بڑے پائے کے مرشد برحق اور آشنائے رازہائے سربستہ بزرگ تھے''۔(۱)

---

(۱) ملاحظہ ہو: الاول کی پدا پتی، ص: ۱۲۲۔

تکملۂ شتی مینالور چندرانی

الاول سرزمین ارکان کے قومی شاعر تسلیم کئے جانے بعد انہوں نے یکے بعد دیگرے دواوین لکھنے شروع کر دیئے تھے، اس سلسلے میں بات یہ ہے کہ آپ کے پہلے کے مرحوم ارکانی شاعر قاضی دولت نے جو دیوان ''شتی مینالور چندرانی'' لشکروزیر اشرف خان کی فرمائش پر لکھا تھا، اب اس کا تکملہ الاول نے لکھنا شروع کر دیا، دراصل یہ دیوان ارکانی شاعر قاضی دولت کا ہے، ان کو اپنی زندگی نے وفا نہ کی تو یہ دیوان ادھورا رہ گیا تھا، یوں الاول نے اس کی تکمیل کا بیڑا اٹھایا۔

چونکہ شاعر قاضی دولت ایک عظیم پنڈت اور گیانی شاعر تھے، ان کی کتاب کا تکملہ لکھنا کوئی مذاق کی بات نہ تھی، قاضی دولت کے انتقال کے بعد ارکان کے وفاقی وزیر سلیمان نے اس کتاب کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے بارہا کوشش کی مگر دولت قاضی کے قدوقامت کے مطابق یا کم سے کم اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی صلاحیت ولیاقت رکھنے والے شاعر نہ ملنے کی وجہ سے یہ کام نامکمل رہ گیا تھا۔

ایک روز راج دربار میں قاضی دولت اور ان کی نامکمل کتاب کی بات چھڑ گئی تو حاضرین یہ بتا رہے تھے کہ الاول قومی شاعر ہیں، ادب وشاعری میں قاضی دولت سے کسی بھی معنی میں کم نہیں ہیں، انہوں نے ''پداپتی'' لکھ کر اس بات کا ثبوت پیش کر دیا ہے کہ شتی مینالور چندرانی کا تکملہ لکھنا ان کے بس کی بات ہے، یوں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اس کام کی تکمیل ان کے بغیر ممکن نہیں ہے، ہمارے یہ قومی شاعر ذرا بھی توجہ فرمائیں گے تو تھوڑی مدت میں شتی مینا کی تکمیل ہو جائے گی، اگر چاہے خدا کرے۔

درباریوں کی خواہش کے مطابق وفاقی وزیر سلیمان نے الاول کے پاس بلاوا بھیجا، خبر پاتے ہی الاول دربار میں تشریف لائے، آپ کی آمد کے متصل بعد سلیمان نے کہا کہ:

> ''بھائی الاول صاحب! آپ نے پداپتی جیسی انمول کتاب لکھ کر جس صلاحیت و استعداد، جس ذوق ادبیت اور فنی مہارت کا ثبوت پیش کیا ہے، اس کی نظیر کم سے کم ارکان میں ملنی مشکل ہے، سردست میری گزارش یہ ہے کہ قاضی دولت صاحب کے انتقال بعد سے میرے دل میں یہ بات کانٹے کی طرح چبتی رہی تھی کہ کسی بھی

> طریقے سے ان کے دیوان کو مکمل کیا جائے، لیکن ہر ممکن کوششوں کے باوجود ایک بھی انسان اس کام کے لئے نہ مل سکا، اب میری امید نہیں بلکہ یقین ہے کہ اس کام کی تکمیل صرف اور صرف آپ ہی کر سکتے ہیں، اگر آپ اس کتاب کی تکمیل کر دیتے ہیں تو ایک طرف میری دیرینہ آرزو پوری ہو جائے گی، تو دوسری طرف صرف سرزمین ارکان کے نہیں بلکہ پورے بنگال کے لوگ آپ کو کبھی فراموش نہیں کر پائیں گے''۔

اس کے بعد وفاقی وزیر سلیمان نے قاضی دولت کی کتاب شتی مینالور چندرانی سے کچھ چیزیں پڑھ سنائیں اور بعض غیر مکمل نظموں ونغموں کی نشاندہی بھی کی، اور باقی غیر مکمل حصے کی کہانی اور داستان بھی بیان کی۔

الاول نے وزیر کی ساری باتیں کان کھول کر بڑی توجہ سے سنیں، اور داستان سن کر بڑے خوش ہو کے فرمایا:

> ''ماشاء اللہ شتی مینالور چندرانی کی کہانی تو بڑی خوبصورت کہانی ہے، میں اس کام کی تکمیل کی ذمہ داری اٹھا سکتا ہوں، جس میں کسی قسم کی کوتاہی اور پہلو تہی نہیں ہوگی، بشرطیکہ شتی مینا کی بیان کردہ کہانی میں میری طرف سے کچھ اضافہ کی اجازت ملنی ہو گی، اگر منظور ہے تو میری امید ہے کہ یہ کہانی اور یہ کتاب بڑی خوبصورت ہوگی''۔

اب وفاقی وزیر سلیمان نے الاول سے مخاطب ہو کر کہا کہ:

> ''جناب من! آپ اپنی مرضی کے مطابق کام کر سکتے ہیں، مجھے بس کتاب کی تکمیل چاہئے، آپ کسی بھی قیمت میں اس کتاب کا تکملہ لکھ دیجئے! میری امید ہے کہ آپ اس کتاب کو ضرور تکمیل تک پہنچا سکیں گے، اگر چاہے خدا کرے''۔

اسی روز سے الاول اس کام میں مشغول ہو گئے، اور بہت کم مدت میں شتی مینالور چندرانی کا تکملہ لکھ ڈالا، بعد ازاں راج دربار میں اس کتاب کے حوالے سے ایک تقریب منعقد گئی تھی، جہاں ملک کے بڑے بڑے ادباء، شعراء، انشاء پرداز، پنڈٹ اور ارباب علم ودانش حاضر ہوئے تھے، مجلس میں الاول نے اپنی کاوش سے کچھ چیزیں پڑھ سنائیں، اور ساتھ ساتھ چند نغمے اصل مصنف قاضی دولت کے حصے سے بھی سنائے، حاضرین مارے خوشی کے جھوم اٹھے اور ہر طرف سے خراج تحسین کے گلدستے پیش ہونے لگے تھے۔

اس کتاب کے حوالے سے یہاں سب سے بڑی بات یہ تھی کہ لوگوں نے یہ تک محسوس نہ کر سکا کہ آیا اس کتاب کا کون سا حصہ الاول کا ہے اور کون سا حصہ قاضی دولت کا، یعنی الاول نے اس تکملہ کو شاعر دولت قاضی کے طرز وانداز اور ڈھنگ وادا میں لکھنے کی کوشش کی، اور اس میں آپ بڑے کامیاب بھی نکلے۔

ستی مینا کے حوالے سے شاعر الاول کی داستان اور حالات لکھنے کے بعد ضروری معلوم ہوتی ہے کہ یہاں ارکان کے عظیم شاعر قاضی دولت کے مختصر حالات پیش کر دیئے جائیں، امید ہے کہ اس سے قارئین کرام کا بڑا فائدہ ہوگا۔

قاضی دولت

ارکانی شاعر قاضی دولت کے حالات عبدالکریم ساھتیہ بیشارد اور محمد انعام الحق نے انکشافات کرنے کی حد درجہ کوشش کی، ان دونوں مصنفیں کے مطابق دولت قاضی چاٹگام کے مشہور علاقہ روزان میں پیدا ہوئے، آپ بہت کم عمر میں شاعر بنے، اپنے پیدائشی علاقے میں ان کی قدردانی نہیں ہوئی تو ارکان کے دارالسلطنت مروہانگ چلے گئے، جہاں لشکر وزیر اشرف خان کے دربار میں ان کی بڑی دھوم دھام سے پذیرائی ہوئی، انہوں نے اپنی فطری قابلیت اور خداداد صلاحیت کو دارالسلطنت مروہانگ میں جا ابھارا، ان کی صلاحیت اور استعداد کو دیکھ کر لشکر وزیر اشرف خان نے ستی مینا لور چندرانی لکھنے کی فرمائش کی (۱) یاد رہے کہ شاعر جس وقت ارکان کے دارالسلطنت تشریف لے جا رہے تھے اس وقت چاٹگام کا پورا علاقہ ارکان کا حصہ تھا (۲) اور یہ بھی یاد رہے کہ شاعر دولت قاضی ارکان کے باہر کہیں بھی تشریف نہیں لے گئے تھے، انہوں نے ارکان کی سرزمین سے محبت کی اور آخر کار اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

شاعر مرحوم دولت قاضی اپنے زمانے میں ارکان کے قاضی القضاۃ تھے، اور یاد رہے کہ برطانوی دور حکومت کے اواخر تک یہاں جو قاضی یا قاضی القضاۃ ہوتے تھے ان کے خاندان کے لوگ اس قاضی کی طرف منسوب ہونے کو پسند کرتے تھے، اور اپنے ناموں کے ساتھ "قاضی" کا لفظ ملحق کر لیتے تھے، لیکن ظاہر ہے کہ قاضی دولت کسی پچھلے قاضی کی طرف منسوب قاضی نہیں تھے، بلکہ آپ بذات خود ارکان کے قاضی القضاۃ تھے۔

عبدالکریم ساھتیہ بیشارد نے قاضی دولت کی طرف منسوب کوئی پچیس دواوین کے نسخے دریافت کئے، لیکن ان کے اکثر دواوین نامکمل ہیں، شاعر نے اپنی زندگی میں ان دواوین کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کی، لیکن آخر کار مکمل نہیں ہو سکے، جیسا کہ معلوم ہے کہ خود ان کی گرانمایہ کتاب ستی مینا لور چندرانی بھی نامکمل رہ گئی تھی، ان کی زندگی نے وفا نہ کی تو اس کا تکملہ الاول کو لکھنا پڑا تھا۔

---

(۱) ڈاکٹر عبدالکریم، عبدالکریم ساھتیہ بیشارد، حیات وکارنامے، ص: ۲۴۲۔

(2) ISLAMIC HERITAGE IN BANGLADESH, BY DR. NAJUMUDDIN AHMED,P.39.

یہاں ایک بات قابل ذکر ہے کہ قاضی دولت نے اپنے دواوین میں صرف اپنے نام کے علاوہ اپنی زندگی کا اجمال یا تفصیل نہیں لکھا، تاہم ان کی تحریر کی بعض جگہوں میں صرف اپنے دور کے دوارکانی بادشاہ اور وزیر اشرف خان کے تذکرے ملتے ہیں، شاعر نے اپنی مشہور کتاب ستی مینا لور چندرانی میں ان بادشاہوں اور مذکورہ وزیر کی مدح سرئی کی ہے۔

لشکر وزیر اشرف خان صاحب شمالی چاٹگام کے مشہور قصبہ ہاٹہزاری کے ساریہ گاؤں میں پیدا ہوئے، اس گاؤں میں اب بھی آپ کے پختہ مکان کے کھنڈرات موجود ہیں، اور یہاں آپ کے نام پر ایک تالاب بھی ہے، علاوہ ازیں چاٹگام کے بعض گاؤں میں آپ کے نام کے کچھ نشانات بھی پائے ہیں، اس طرح روزان کے مشہور گاؤں قدل پور میں آپ کے نام کا ایک بڑا تالاب ہے، جسے لوگ لشکر وزیر کا تالاب کہتے ہیں۔

لشکر وزیر اشرف خان صاحب بڑے صاحب علم اور صاحب کردار انسان تھے، عربی، فارسی، گجراتی ، ہندی، پالی اور سنسکرت زبانوں میں بڑی مہارت رکھتے تھے، اور ان ساری زبانوں میں ہونے والے شعروشاعری سے نہ صرف محظوظ ہوتے بلکہ اس پر تنقید وتبصرہ بھی کیا کرتے تھے۔

مرحوم اشرف خان سرزمین ارکان کے ایک عظیم اور نامور بزرگ انسان تھے، جیسا کہ پچھلی سطور میں عرض کی گئی ہے کہ آپ ارکانی بادشاہ سری سودھمہ (۱۶۲۲ء۔۱۶۳۸ء) کے دور حکومت میں سلطنت ارکان کے سالار جنگ یا سپہ سالار رہ چکے تھے، تاریخ میں آپ کے تذکرے اور آپ کی خدمات کا منہ بولتا ثبوت ملتا ہے، قاضی دولت کی کتاب ستی مینا لور چندرانی میں آپ کے بلند اخلاق وصفات اور اچھے اچھے کارناموں کی تفصیلات موجود ہیں، آپ بڑے انسان دوست بزرگ تھے، بڑوں کی تعظیم ،چھوٹوں سے پیار، علماء وصلحاء سے محبت اور لگاؤ گویا آپ کی طبیعت ثانیہ تھا، آپ نے سلطنت ارکان کے اس سرے سے لے کر اس سرے تک مدرسے، مساجد، خانقاہیں، تالاب اور مسافر خانے بنوا بنوا کر ملک کے لوگوں کے دل موہ لئے تھے، آپ ۱۶۲۲ء سے لے ۱۶۴۸ء تک اس منصب جلیلہ پر فائز رہ چکے تھے، قاضی دولت آپ کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

''لشکر وزیر اشرف خان حنفی مذہب اور چشتی مشرب کا ایک عظیم انسان ہیں، آپ علماء اور صلحاء کو بڑی محبت کرتے ہیں، بڑے دلدار اور سخی انسان ہیں، لوگوں کے

ساتھ کسی بھی قسم کے مظالم سے کوسوں دور رہتے ہیں، خانقاہیں، مساجد، مدرسے اور تالاب وغیرہ بنوا بنوا کر لوگوں کے دل موہ لیتے ہیں، خاصی شیرین زبان آدمی ہیں، چھوٹوں سے پیار، بڑوں کی تعظیم وتکریم، علماء اور صلحاء سے لگاؤ اور ان کی قدر دانی جیسی صفات آپ کے دل میں چھپی ہوئی ہیں''۔(۱)

لشکر وزیر اشرف خان کے متعلق ڈاکٹر احمد شریف لکھتے ہیں کہ:

''لشکر وزیر اشرف خان صاحب چاٹگامی نژاد ایک زندہ دل مسلمان تھے، بمقام ساریہ (ہاٹہزاری، چاٹگام) میں آپ اور آپ کے خاندان کی پختہ عمارتوں کے کھنڈرات ابھی تک پائے جاتے ہیں، اس گاؤں میں آپ کا بنوایا ہوا ایک بڑا اور پرانہ تالاب موجود ہے، علاوہ ازیں موضع قدل پور (ہاٹہزاری) میں بھی ان کا بنوایا ہوا ایک پرانہ تالاب ہے، جو ان کی طرف منسوب ہے''۔(۲)

ارکانی مورخ جناب مرحوم وکیل خلیل الرحمن صاحب ستی مینا صفحہ ۲ تا ۵ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

''لشکر وزیر اشرف خان راجہ سند سودھمہ (۱۶۵۲ء) کے عہد حکومت میں سپہ سالار تھے، جس کو راجانے تلوار، ہاتھی، گھوڑے وغیرے عطا کئے تھے، اس نے ایک مسجد (خلیل صاحب کے مطابق) بنوائی تھی، جس کا خطیب سید قاضی عالم شاہ تھے، جن کے فیض روحانی سے عربی، رومی، مغل اور پٹھان قومیں ارکان میں مستفیض ہوئیں''۔(۳)

دراصل ستی مینا لور چندرانی یہ ایک ترجمہ ہے، جب کہ اصل کتاب گوہری اور ٹیٹھ زبان میں لکھی گئی ہے، لشکر وزیر اشرف خان نے اسے بنگلا میں منتقل کرنے کی عرض قاضی دولت سے کی تو قاضی صاحب نے اسے لکھنا شروع کیا تھا۔

اس حوالے سے یہاں ایک بات عرض ہے کہ دراصل لشکر وزیر اشرف خان نے قاضی صاحب کو دیسی

(۱) عبدالحق چودھری، بحوالہ دولت قاضی۔

(۱) ڈاکٹر احمد شریف، بنگالی اور بنگلا ساھتیہ دوسری جلد، ص: ۴۴۴۔۴۴۵۔

() اڈووکیٹ خلیل الرحمن، تاریخ اسلام برما وارکان، ص: ۴۸۔

زبان میں منتقل کرنے کی عرض کی تھی، اب سوال آتا ہے کہ اس وقت ارکان کی دیسی زبان کون سی تھی، بنگلہ یا اور کوئی زبان؟؟ جواب یہ ہے کہ اس وقت چاٹگام بھی ارکان کا ایک عظیم حصہ تھا، تو ظاہر ہے کہ چاٹگامی اور حالیہ ارکانی مسلمانوں کی زبان ایک ہی ہے، ملک میں مسلمانوں کی اکثریت تھی، تو شاعر نے ان مسلمانوں کی زبان بنگلا (دراصل چاٹگامی زبان بھی ایک علاقائی بنگلا زبان ہے) میں تحریر کی تھی۔

پتہ چلا کہ لشکر وزیر اشرف خان باقاعدہ ایک وزیر بننے سے پہلے مشہور ارکانی راجا سری سودھمہ کے سپہ سالار تھے، یہ بات بعض مغربی مصنفین کی کتابوں میں بھی ملتی ہے، باوجودیکہ سارے مغربی مورخین نے نہ لشکر وزیر اشرف خان کا نام لیا اور نہ اس زمانے کے بادشاہ کا اسلامی نام لکھا، تاہم ان مورخین میں سے صرف من ریک نے اس وقت کے ارکانی بادشاہ کا نام سکندر شاہ ثانی لکھا ہے۔(۱)

سکندر شاہ ثانی اپنے والد کے انتقال کے بعد تخت و تاج کا مالک ہوا، مگر اس نے تاج سلطنت سر پر لیتے وقت کوئی تقریب نہیں کی تھی، اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اس وقت کے شاہی نجومیوں نے بتایا تھا کہ کوئی بھی نیا بادشاہ اگلے دو سال کے اندر انتقال کر جائے گا، تو بادشاہ سکندر نے اس دو سال کی مدت کے لئے اپنی بادشاہت کی تقریب نہیں منائی تھی، لیکن پورے بارہ سال بیت جانے کے باوجود اس کا انتقال نہ ہوا تو پورے بارہ سال گزر جانے کے بعد وزراء اور درباریوں نے عرض کی کہ بادشاہ اپنی بادشاہت کی تقریب منائیں، مگر بادشاہ نے اس معاملے کو اپنے شیخ و مرشد کی چاہت کا حوالہ کیا تھا، میں نے ہزار کوشش کی کہ بادشاہ کے مرشد کا نام مل جائے، لیکن اب تک کامیاب نہیں ہو سکا، مگر اتنا ضرور پتہ چلا ہے کہ وہ ایک مسلمان تھے، جنھوں نے دو مرتبہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ کے روضۂ اقدس کی زیارت کی تھی (۲) ڈاکٹر عبدالکریم صاحب کا خیال ہے کہ یہ الاول کے زمانے کے عظیم وزیر بڑے ماگن ٹاکور کے والد بزرگور تھے، جو خود بھی کسی زمانے کے لشکر وزیر (سپہ سالار) رہ چکے تھے، یاد رہے کہ مغربی مورخ من ریک (Mam Rague) جو بذات خود سکندر شاہ ثانی کے بارسالہ تقریب میں شریک تھے، جو ۱۶۳۵ء میں منعقد کی گئی تھی، جس نے اس تقریب کے تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

(۱) Travels of fray Sabastien Manrique vol. 1,P.352

(۲) عبدالکریم ساھتیہ بیشارد، حیات و کارنامے، عبدالکریم، ص:۲۴۱۔

> ''میں بذات خود اس تقریب میں شریک تھا، یہاں ارکانی فوجوں کو بھی دعوت دی گئی تھی، جس میں سب سے پہلے لشکر وزیر اشرف خان نے مسلم افواج کی سربراہی کی تھی''۔(۱)

قاضی صاحب نے سری سودھمہ اور اس کے سپہ سالار لشکر وزیر شرف خان کا دل کھول کر تذکرہ کیا ہے، ارکان کے اس عظیم شاعر نے ۱۶۳۸ء کے لگ بھگ انتقال کیا، انتقال کے وقت ان کی عمر صرف ۳۸ سال تھی تو ظاہر ہے کہ وہ ۱۶۰۰ء میں پیدا ہوئے تھے، شاعر کی مفصل حیات، حالات و واقعات کے انکشاف کے لئے بہتوں پنڈتوں اور سوانح نگاروں نے بڑی کوشش کی، لیکن سوانح نگار حضرات بڑی کوشش کے باوجود تقریبا ناکام رہ گئے ہیں۔

خیر جو کچھ بھی کیوں نہ ہو، شاعر دولت قاضی اپنی بیش قیمت کتاب شتی مینا کی تحریر کے دوران صرف ۳۸ سال کی عمر میں اچانک انتقال کر گئے، اور آپ کی اس انمول کتاب کا تکملہ سید الاول نے ۱۶۵۹ء میں لکھا تھا۔

دیوان شتی مینا تین حصوں پر مشتمل ہے:

(۱) پہلا حصہ: تعارف نامہ پر مشتمل ہے، جس میں لور چندرانی کا تعارف کرایا گیا اور ساتھ ہی ساتھ عاشق الشوق کی پریم کہانی بیان کی گئی ہے۔

(۲) دوسرا حصہ: ہجر و وصل کی داستان ہے، یعنی اس میں شاعر نے لور چندرانی کی شادی پر جنگ و جدل کے تفصیلی حالات درج کئے ہیں، جہاں تک معلوم ہوا ہے کہ شاعر کا اس ہجر نامے کی تحریر کے دوران اچانک انتقال ہو گیا۔

(۳) تیسرا حصہ: عاشق و معشوق کی طویل جدائی کے بعد وصال کی داستان ہے، یہ حصہ حضرت شاہ الاول صاحب کی تحریر ہے۔(۲)

(۱) Travels of fray Sabastien Manrique vol. 1, P.375

(۲) امرتولال بالا، الاول کے کلام میں ہندو مسلم ثقافت، ص:۲۶۹۔

سلیف الملوک بدیع الجمال

سیف الملوک بدیع الجمال یہ الاول کی تیسری زندہ کاوش ہے، لیکن بعض مورخین اسے ان کی دوسری کاوش بھی کہتے ہیں، باوجودیکہ اس میں مورخین کا اختلاف ہے، مگر یہ تیسری کاوش ہونے کی طرف مورخین کی اکثریت کا رجحان ہے۔

قریشی ماگن ٹاکور جس نے پدماوتی لکھوا کر الاول کو ایک زندہ شاعر بنا دیا تھا، اب انہی ٹاکور نے اور ایک کام کی طرف توجہ دلا کر سیف الملوک بدیع الجمال بھی لکھوایا تھا، وفاقی وزیر سلیمان اور ماگن ٹاکور دونوں حضرت خواجہ معصوم علیہ الرحمہ کے مرید تھے، ایک روز وزیر سلیمان نے اپنے مرشد حضرت معصوم کو کھانے کی دعوت پر بلایا، مرشد برحق کے ساتھ صاحبزادہ گرامی شیخ مصطفے بھی تشریف لائے تھے، کھانا بڑا شاندار تھا، حضرت شیخ اور سارے مرید بشمول مہمان کھانے سے فارغ ہو چکے تھے، حضرت شیخ قیلولہ کے لئے گھر کے اندرونی حصے میں تشریف فرما تھے، آپ قیلولہ فرما رہے تھے، اور قریب میں بیٹھ کر آپ کے صاحبزادہ شیخ مصطفی فارسی زبان میں ایک دیوان حضرت شیخ کو پڑھ سنا رہے تھے، دیوان کیا تھا؟ زبان وادب، بلاغت وفصاحت کا ایک حسین مجموعہ تھا۔

دراصل یہ ایک کہانی پر مشتمل دیوان تھا، کہانی کا روپ کچھ ایسا تھا کہ:

> ''مملکت مصر میں ایک راجا جس کا نام سلیمان تھا، راجا کا اکلوتا بیٹا سیف الملوک ابھی جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا ہوا تھا، اب کسی ایک صاحب نے شہزادہ کے ہاتھ پر شہر بستان (ایران) کی پری پیکر شہزادی بدیع الجمال کی تصویر تھمادی، شہزادہ پری پیکر شہزادی کی تصویر دیکھ کر مارے عشق کے دیوانہ ہوگیا، اور کسی بھی قیمت میں اسے پانا چاہتا تھا، تصویر کے معاینہ کے بعد سے شہزادہ کی آنکھوں سے نیند اڑ گئی، نہ کھانے کی خواہش تھی اور نہ پینے کی یاد رہی، اور نہ موت کا خوف تھا اور نہ جینے کی تمنا تھی۔
>
> ادھر شہزادے کا یہ حال تھا، ادھر بادشاہ اور رانی بڑی پریشانی میں مبتلا ہو گئے تھے، ان دونوں کی یہی چاہت تھی کہ کسی بھی طریقہ اور کسی بھی قیمت میں شہزادہ کو اس

> پری پیکر کے خیال سے آزاد کیا جائے، ہر چند کوشش اور جدوجہد کے باوجود راجا اور رانی ناکام ہو گئے، حتی کہ وقت کے ساتھ شہزادہ موت کی اندھیری وادی کی طرف قدم بڑھا رہا تھا، یعنی سیف الملوک کسی بھی قیمت میں بدیع الجمال کے خیال سے واپس نہیں آرہا تھا۔
>
> ایسے حالات میں راجا اور رانی اپنے بیٹے کو ایران جانے اور بدیع الجمال سے شادی رچانے کی اجازت دیتے ہیں، اب سات جہازوں اور ایک بڑا لشکر اور اپنے دوست کو ساتھ لئے شہزادہ ایران کے مقصد سے روانہ ہو جاتا ہے، مصیبتوں اور ابتلاؤں کے سات سمندر پار کر کے شہزادہ ایران پہنچ جاتا ہے، اور بڑی بڑی آزمائشوں اور ابتلاؤں کے اس پار بالآخر شہزادی سے شادی رچا لیتا ہے، واپسی کے دوران شہزادہ اپنے دوست اور رفیقۂ حیات بدیع الجمال سمیت جزیرہ سرندیپ میں اترا تو یہاں کی شہزادی ملکہ بانو سے اس کی دوسری شادی ہو جاتی ہے''۔

یہ تھا کہانی کا اصل روپ، جو صاحبزادہ مصطفے اپنے والد بزرگوار کے پاس بیٹھ کر ترنم سے سنا رہے تھے، دراں حالیکہ یہاں حضرت شیخ کے پاس الاول اور ماگن ٹاکور بھی تشریف فرما تھے، صاحبزادہ مصطفے کی مدبھری آواز میں فارسی زبان کی یہ کہانی سننے کے بعد ماگن نے الاول کی طرف متوجہ ہو کر کہا کہ:

> ''جانِ من! چونکہ یہ کہانی کافی خوبصورت ہے، اور ظاہر ہے کہ ارکان کے باشندے فارسی زبان پڑھ کر اس سے مستفید نہیں ہو سکتے، اگر اس دیوان کو بنگلا زبان میں منتقل کر دیا جائے تو اس سے یہاں کے لوگ مستفید ہو سکیں گے، کیوں نہ آپ اس کو بنگلا زبان میں منتقل کرنے کی کوشش کریں؟ اگر آپ اس دیوان کو بنگلا میں منتقل کر دیں گے تو ایک طرف آپ کی صلاحیت اور شہرت میں اضافہ ہوگا تو دوسری طرف تا قیامت آپ کی یہ زندہ جاوید کاوش باقی رہے گی، میری امید ہے کہ اگر آپ چاہتے ہیں تو اس کام میں بھی کامیاب نکل سکتے ہیں''۔

الاول ماگن کی باتیں اور عرض نامہ سن کر بڑے خوش ہو کے فرمایا کہ:

> ''جناب من! گزارش ہے کہ فقیر کو آپ کے حکم سے ٹکرانے اور معذرت کرنے کی

ہمت نہیں،فقیر صرف آپ کے حکم کی تعمیل کر کے خوش ہوسکتا ہے بس''۔

یوں الاول نے ماگن کی عرض پر کمر کس لی،اور ماگن کی آرزو اور حکم کو تعمیل کرتے ہوئے سیف الملوک بدیع الجمال کا ترجمہ شروع کر دیا،لیکن افسوس کا مقام یہ ہے کہ ابھی اس کتاب کے کچھ حصوں کا ترجمہ ہوا کہ اچانک ماگن ٹاکوراس دنیائے فانی سے رخصت لے چلے،اناللہ واناالیہ راجعون۔

چونکہ الاول ماگن ٹاکور کو اپنا ایک استاد، ایک شفیق مربی سے بڑھ کر ایک شفیق باپ مانتے تھے، در حقیقت یہ وہ ماگن تھے کہ جنہوں نے الاول کو زندہ جاوید بنایا تھا،اس لئے سرزمین ارکان میں الاول کے نزدیک ماگن ٹاکور سے زیادہ معزز اور کوئی نہ تھا،اب ماگن کی اچانک موت نے الاول کی زندگی میں ایک طوفان لا چکا تھا،تاہم الاول نے اس طوفان کی ہولنا کی سے بچنے کی بڑی کوشش کی،آخر تک وہ ناکام ہو گئے تھے،چنانچہ اس حوالے سے ڈاکٹر انعام الحق اور عبدالکریم ساھتیہ بیشارد لکھتے ہیں کہ:

''الاول نے قاضی دولت کی کتاب شتی مینالور چندرانی کے تکملہ مکمل کرنے کے بعد ارکانی وزیر ماگن ٹاکور کی فرمائش پر سیف الملوک بدیع الجمال کا ترجمہ شروع کر دیا تھا،مگر دوران تحریر ماگن ٹاکور کا انتقال ہو گیا،ان کے انتقال کے کچھ عرصہ بعد ۱۶۶۱ء میں شہزادہ شجاع نے جنگ میں مغلوب ہو کر ارکان میں پناہ لی، پھر تھوڑی مدت کے بعد اسے مع اہل وعیال،دوستوں احباب اور حامیوں وساتھیوں سمیت قتل ارکان میں قتل کر دیا گیا، الاول بھی اس معاملے میں مرزا نامی ایک یزید مثال آدمی کے مکر و خداع کے زد میں آ گئے تھے، چنانچہ شہزادہ کے حامی ہونے کے الزام پر الاول گرفتار کر لئے گئے تھے، ویسے انہوں نے پچاس روز قید وبند کی زندگی گزاری،تو ایک طرف ماگن کا انتقال تو دوسری طرف قید و بند کی تنہائی کے ساتھ مختلف اور متنوع پریشانی اور آلام،جس نے شاعر کے دل و وجدان،ضمیر وخاطر اور جسم وجان کو نڈھال بنا دیا تھا، اب شاعر کی صحت بھی جواب دے رہی تھی،شاعر نے اپنی ایسی پریشانی کی وادی سے خود کو نکالنے کی بڑی حد تک کوشش کی،لیکن ناکام ہو گئے تھے''۔(۱)

(۱)ڈاکٹر انعام الحق وعبدالکریم ساھتیہ بیشارد،ارکان کے راج دربار میں بنگلا ساھتیہ،کلکتہ،۱۹۳۵،ص:۵۰۔

اب الاول کی دونوں آنکھوں میں پریشانی اور اندھیری چھا چکی تھی، ہر کجا ان کے سامنے دور دور تک اندھیرا ہی اندھیرا چھایا ہوا تھا، اس اندھیری وادی میں پریشانی اور آلام کے بھوت نے شاعر کو ایسا دبوچا کہ ان کی جان تک جانے کی نوبت آئی تھی، اس بھوت سے خلاصی کی ہر چند کوشش کے باوجود خلاصی ممکن نہیں ہوسکی، یوں سیف الملوک بدیع الجمال جیسی ایک زندہ کاوش ناتمام رہ گئی تھی۔

الاول نے اس مصیبت میں زندگی کے آٹھ سال گزار دیئے،اور اس دوران سیف الملک بدیع الجمال کی طرف متوجہ ہونے کی نوبت تک نہ آئی، بالآخر ۱۶۶۹ء کے اوائل میں خوشی اور بہار کی ایک ہوا چلی ،اور سرزمین ارکان کے ایک بڑے انسان جسے دنیا وزیر سید موسی کے نام سے جانتی ہے، وہ الاول کی طرف متوجہ ہوا،جس نے اس گرانمایہ کتاب کی تکمیل کرنے کی فرمائش کی، اس حوالے سے عبدالکریم ساھتیہ بیشارد اور ڈاکٹر انعام الحق صاحبان رقمطراز ہیں کہ:

''اس مصیبت کے حالات میں ارکان کے اور ایک عظیم انسان وزیر سید موسی نے الاول کو سہارا دیا، چنانچہ اس کی فرمائش پر شاعر نے ۱۶۶۹ء میں اس گرانمایہ دیوان کی تکمیل کر دی، یوں یہ شاہکار تصنیف منظر عام پر آئی''۔(۱)

اور الاول خود اپنی اس زندہ کاوش میں اپنے ان حالات کے تذکرہ کے دوران لکھتے ہیں کہ:

''ویسے نو سال گزر گئے تھے اور دیوان ناتمام رہ گیا تھا،آخر کار سید موسی نامی ایک عظیم انسان جو بڑے خوبصورت اور اعلی صفات کا مالک ہے نے اس کام کی تکمیل کرنے کی راہ صاف کر دی''۔(۲)

(۱)ڈاکٹر انعام الحق وساھتیہ بیشارد ارکان کے راج دربار میں بنگلا ساھتیہ،کلکتہ،۱۹۳۵،ص:۵۰۔

(۲)ابوطالب کے زیر اہتمام نکلنے والی کتاب ''سیف الملوک بدیع الجمال'' از الاول، بنگلا اکیڈیمی ڈھاکہ،ص:۲۸۶۔

چوتھا باب

شہزادہ شجاع ارکان میں

مشہور تاجدار ہندوستان شاہ جہاں کی آخری عمر ۱۶۵۷ء میں ان کے چاروں بیٹے (دارا شکوہ، مراد، اورنگ زیب عالمگیر، شجاع) کے درمیان تخت شاہی پر قبضے کے حوالے سے خون آشام لڑائیاں ہوئیں، بالآخران لڑائیوں میں اورنگ زیب کی جیت اور بقیہ تینوں شہزادوں کی ہار ہوئی تھی۔

شاہ جہان کے متعلق مورخین کا اتفاق ہے کہ وہ ایک نیک دل، شریعت کا احترام کرنے والا، بڑی بڑی مساجد تعمیر کرنے کا خاص شوق رکھنے والا اور اپنی ذات میں فرائض شرعیہ کا پابند بادشاہ تھا، علاوہ ازیں وہ علماء اور صلحاء کو اپنے قریب رکھتا اور ان پر اعتماد کرتا تھا، اس کے وزیر با تدبیر سعد اللہ خان علامی (متوفی ۱۰۶۶ھ) اپنے عہد کے ایک ممتاز عالم دین اور صاحب درس بزرگ تھے، علاوہ ازیں اس ذاتی دینداری وخداترسی کے ساتھ شاہ جہان نے عہدِ پیشین کی بعض خلاف شرع رسوم وآداب کو بند بھی کر دیا تھا، حضرت سید عبدالحیؒ شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

''شاہ جہان نے تختِ شاہی پر جلوس کیا تو اس کو مراسم ملت مصطفوی اور شریعت محمدی کا (جس میں کچھ خلل پڑ گیا تھا) ایسا پاس ولحاظ تھا کہ اول اس نے حکم دیا کہ سجدہ کرنے کی تعظیم کا معبود حقیقی سزاوار ہے، ویسے آئندہ کوئی بھی دوسرے کے لئے اپنی پیشانی کو خاک مذلت پر نہ رکھے''۔(۱)

(1) اس طرح سر رچرڈ برن (SIR RECHARD BURN) لکھتا ہے کہ:

(۱) نزہۃ الخواطر جلد ۵، سید عبدالحی الحسنی، والد بزرگوار حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔

''شاہ جہان اسلامی عقائد کو سختی سے نافذ کرنا چاہتا تھا، لیکن دوسرے مذاہب کے ماننے والوں سے متعرض بھی نہیں ہونا چاہتا تھا، اس نے جلد ہی تخت شاہی کو سجدہ کرنے کی رسم دربار سے اٹھادی۔۔۔۔الہی سنہ بھی جسے اکبر نے رائج کیا تھا اس کا سرکاری کاغذات اور سکوں پر استعمال شاہ جہان کی تخت نشینی کے چند سال بعد ختم ہو گیا۔۔۔ ۱۶۳۴ء میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مناکحت جو پنجاب اور کشمیر میں عام تھی، ممنوع قرار دی گئی''۔(۱)

الحاصل شاہ جہان کی آخری عمر میں ان کے بیٹوں کے درمیان لڑائی چھڑ گئی تھی، ظاہر ہے کہ داراشکوہ ولی عہد سلطنت تھا، داراشکوہ کے حوالے سے بات یہ ہے کہ عہد عالمگیری میں جو تاریخیں مرتب کی گئی ہیں، محض ان پر اعتماد کر کے ہم داراشکوہ کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے، نہ اس پر قطعی طور پر بے دین، بدعقیدہ ہونے کا حکم لگا سکتے ہیں، اور نہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ صرف تخت وتاج کے لئے بھائیوں کے مابین لڑائی ہوئی تھی، اور نہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ خالصتا دو فلسفوں، دوطریق فکر اور دین ولادینیت کے مابین کی یہ لڑائی تھی، تاہم بعض غیر جانبدار مورخین کے بیانات سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ داراشکوہ اپنے پردادا اکبر کے رنگ سے قریب تر اور وحدت ادیان کے نظریہ سے متاثر اور شریعت و ویدانت میں مطابقت ثابت کرنے کے لئے کوشاں تھا، دائرۂ اسلامیہ کے مقالہ نگار کے بقول:

''دارا تصوف سے خاصی دلچسپی رکھتا تھا، اور ہندو فلسفہ کے زیر اثر تھا، وہ مسلمان صوفیاء اور ہندو سنیاسیوں سے گہرے تعلقات رکھتا تھا، جن میں (دیگر مسلمان صوفیوں اور علماء کے علاوہ) مشہور آزاد مشرب وجودی سرمد، اور بابالال داس بیراگی، کبیر بھی تھا، دارا کی بعض متاخر تصانیف سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ نظریۂ وحدۃ الوجود کا پیرو تھا، وہ ہندو فلسفہ اور صنمیات سے بھی متاثر تھا، جس کی وجہ سے وہ متعدد ایسے ملحدانہ خیالات کی طرف مائل ہو گیا جن کی واضح مماثل ہندو فلسفہ میں پائے جاتے ہیں، اور جس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔۔۔۔دارا اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ ویدانت اور تصوف جن کے ذریعہ حق کا ادراک کرنا تھا، وہ باہم مخالف نہیں، فرق صرف لفظوں کا ہے، اوپنشدوں کے ترجمہ میں جسے وہ ''وحدت'' کا سرچشمہ بیان

CAMBRIDE HISTORY 0F INDIA VOL.IV,P.217.(1)

کرتا تھا، دارا نے دو بڑے مذہب اسلام اور ہندومت کے پروؤں کے مشترکہ نظریات کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی، نیز اس نے یہ چاہا کہ ہندوؤں کے اعتقادات سے مسلمانی کو آشنا کرایا جائے''۔(۱)

لیکن دارا کے بھائی محی الدین اورنگ زیبؒ نے (جن کو حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی سے عقیدت اور ان کی دعوت اسلامی سے شروع سے مناسبت تھی) حضرت خواجہ محمد معصوم سے بیعت وارادت کا تعلق قائم کرلیا تھا، اس بات کے متعدد قرائن وشواہد موجود ہیں کہ اورنگ زیب کا تعلق حضرت خواجہ سے محض غائبانہ عقیدت اور عام نیازمندی کا نہ تھا، بلکہ انہوں نے باضابطہ اصلاح وتربیت کا تعلق حضرت سے قائم کرلیا تھا، حضرت خواجہ محمد معصوم کی اورنگ زیب پر شہزادگی کے وقت سے خاصی نظر تھی، چنانچہ حضرت خواجہ ان کو شہزادۂ دین پناہ کے لقب سے یاد کرتے تھے، حضرت خواجہ سیف الدینؒ اپنے والد ماجد حضرت خواجہ محمد معصومؒ کے حکم سے بادشاہ اورنگ زیب کے پاس رہتے تھے، اور ان کو دینی اور روحانی تعلیم دیتے تھے، اس حوالے سے عالمگیر نامہ کا بیان ہے کہ:

''اورنگ زیب کی تخت نشینی کے فورا بعد خواجہ محمد معصوم اور ان کے برادرِ بزرگوار خواجہ محمد سعید دربارشاہی میں تشریف لائے اور اورنگ زیب نے اس موقعہ پر تین سو طلاقی مہریں نذر کیں''۔(۲)

شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے سال جلوس کے دوسرے سال جون/۱۶۵۹ء کی ابتدا میں لوگوں کی زندگی کو قرآنی تعلیمات سے ہم آہنگ کرنے کے لئے حسب ذیل احکامات جاری کئے:

(۱) اورنگ زیب نے کلمہ شہادت کو سکے میں کندہ کرنے سے اس لئے ممانعت کردی کہ یہ پیروں تلے پڑنے کا امکان ہے، یا کسی طریقہ سے اس کی بے حرمتی ہوسکتی ہے۔

(۲) ہندوستان کے مغل بادشاہ برج حمل میں سورج کے داخلہ کے وقت جشن مناتے تھے، عالمگیر نے اس کی ممانعت کرکے اس جشن کو رمضان میں اپنے تخت نشینی کے دن منتقل کردیا تھا۔

---

(۱) اردو دائرۃ المعارف الاسلامیہ جلد ۹، مقالہ نگار ستیش چندرا۔

(۲) محمد کاظم، عالمگیر نامہ، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۸ء، ص: ۲۹۳ (منقول از مقالات پروفیسر محمد اسلم)

(۳) عوام کی زندگی کو شعار اسلام سے نزدیک لانے کے لئے محتسب مقرر کئے گئے تھے۔

(۴) مملکت کے ہر حصہ میں بھنگ کی کاشت پر پابندی عائد کردی گئی تھی۔

(۵) سبھی قدیم مساجد وخانقاہوں کی مرمت، یا انہیں ازسرنو تعمیر کرنے کا حکم دیا تھا۔

(۶) سال جلوس کے گیارہویں سال دربار کے گویوں کو بادشاہ کے سامنے اپنے فن کے مظاہرہ کرنے کی ممانعت کردی گئی تھی۔

(۷) بادشاہوں کو اس کی دونوں سال گراہوں (شمسی وقمری تاریخ پیدائش) کے مواقع پر سونے اور چاندی میں تولنے کی رسم بند کردی گئی تھی۔

(۸) اکتوبر/۱۶۷۸ء میں پوری مملکت کے اندر نجومیوں کو اس کا پابند کیا گیا کہ وہ پیدائش کے مواقع پر کسی کا زائچہ نہیں بنائیں۔

(۹) بادشاہوں کو خطاب عطا کرتے وقت ماتھے پر اپنے ہاتھ سے ٹیکہ لگایا جاتا تھا، اسے بالکل بند کر کے راجا کے خطاب پانے والوں کو صرف تسلیم بجالانے کا حکم دیا تھا۔

(۱۰) شاہان مغل دن کی ابتدا میں محل کے جھروکے میں آکر رعایہ کو درشن دیتے تھے، اورنگ زیب نے اس عمل کو غیر اسلامی قرار دے کر بند کردیا تھا۔

(۱۱) عالمگیر نے قبروں کے اوپر عمارت یا چھت بنانے، قبروں پر سفیدی کرنے اور قبرستان میں عورتوں کے جانے کی ممانعت کردی تھی۔(۱)

اورنگ زیب اور ان کے تینوں بھائیوں کے درمیان ہونے والی لڑائیوں کی لمبی چوڑی داستان سے صرف نظر بات یہ ہے کہ اورنگ زیب اور شجاع کے درمیان ۱۶۵۹ء میں ''کاوا'' کے علاقہ میں شدید لڑائی ہوئی۔ ۵/اپریل ۱۶۶۰ء کو ٹانڈا کی لڑائی میں شہزادہ شجاع مکمل طور پر مغلوب اور اورنگ زیب غالب ہوگئے تھے۔

شہزادہ شجاع اپنی مکمل ہار کے بعد بنگال آیا اور جہانگیر نگر ڈھاکہ آٹھہرا تھا، لیکن اورنگ زیب کا سپہ سالار میر جملہ آخر تک اس کا تعاقب کرتا رہا تھا، شجاع نے ڈھاکہ پہنچتے ہی اپنا بیٹا زین العابدین کو ارکان روانہ کردیا، شجاع کی چاہت تھی کہ وہ ارکان میں پناہ لینے کے بعد وہاں سے بذریعہ جہاز مکہ معظمہ جاکر مستقل

---

(۱) ملاحظہ ہو سرجادوناتھ سرکار، ہسٹری آف اورنگ زیب، جلد سوم، کلکتہ ۱۹۲۸ء، ص: ۸۱-۹۰۔

سکونت پذیر ہو جائے گا، ابھی زین العابدین ارکان کی راہ پر تھا، ادھر میر جملہ شجاع کا تعاقب کرتے ہوئے بنگال آ پہنچا، بالآخر شہزادہ شجاع کے لئے جہانگیر نگر اور بنگال کی زمین تنگ ہوگئی تھی، چنانچہ اس نے بدحواسی کے عالم میں جہانگیر نگر کو خیر باد کہہ دیا تھا۔

شہزادہ شجاع کے رکان پہنچنے کے حوالے سے دو قسم کی روایات ملتی ہیں:

(۱) پہلی روایت کچھ ایسی ہے کہ شہزادہ شجاع ارکان کی نیت سے ٦ /مئی/ ۱۹٦۰ء کو ڈھاکہ کو خیر باد کہتے وقت اس کی دوسری بیوی پیارا بانو، تین شہزادے زین العابدین، بلند اختر، زین الدین، تین شہزادیاں گل رخ بانو، روشن آرا، آمنہ بانو اور بھانجی سبیجہ بی بی کے علاوہ بہتوں مغل افواج بھی ساتھ لے گیا تھا، شہزادہ نے ابھی ڈھاکہ سے نکل کر چار منازل طے کیں، اور ڈھاپہ کے علاقے میں پہنچا تو اس کے اکثر پرانے احباب اور بہتوں افواج اس سے علیحدگی اختیار کر کے واپس ڈھاکہ چلی گئیں، اور تو اور ڈھاکہ سے دسویں منزل پر مذکورہ قسم کا اور ایک حادثہ پیش آیا کہ شہزادے کا پرانہ دوست اور زندگی بھر کا ساتھی جان بیگ کے علاوہ بہتوں افراد اس سے علیحدگی اختیار کر کے ڈھاکہ واپس چلے گئے تھے، بالآخر شہزادہ اپنے بہتوں احباب سمیت جن میں سید عالم بدخشی، سید قلی ازبک قابل ذکر حضرت ہیں، مزید چالیس حضرات سمیت پرتگیز کپتان من ویل کو یلہ (Manoel Coelha) کے جہاز پر سوار ہو کر ارکان روانہ ہوا، اور لکی پور، بھلوا ہو کر ۳ / جون/ ۱٦٦۰ء کو دیوانگا جا ٹھہرا، اور وہاں سے ۲٦ / اگست کو دریائے ناف عبور کرتے ہوئے ارکان کے دار السلطنت مروہانگ جا پہنچا، اس رویت میں راستے کے حوالے سے کچھ باتیں پائی جاتی ہیں کہ:

(الف) بعض انگریز مورخین کے مطابق ارکان کی راہ پر پرتگیزوں نے شہزادہ کی دس ٹن دولت ہڑپ لی تھی۔

(ب) بعض مورخین کے مطابق شہزادہ کے ساتھ تین ہزار لشکر جرار تھے، لیکن بعض مورخین نے اس لشکر کی تعداد پانچ سو اور بعض نے اس کی تعداد صرف چالیس بتائی ہے۔(۱)

(۲) دوسری روایت ایسی بھی ملتی ہے کہ شہزادہ ڈھاکہ سے نکل کر دریائے میگنا کے ساحل پر اترا اور وہاں جا کر جالی بوٹ (ایک قسم کی بڑی کشتی) کے ذریعہ مکہ معظّمہ جانے کی ٹھان لی تھی، چوں کہ اس وقت موسم برسات کا تھا، تو اس قسم کی کشتی کے ذریعہ بحر بنگال کی راہ سے مکہ شریف جانا مذاق کی بات تھی، تو

(۱) عبدالحق چودھری، قدیم ارکان میں روہنگیا، بدھ اور ہندو باشندے، ص: ۱۲۸۔

بادل ناخواستہ اس نے ارکان کی راہ لی تھی، چنانچہ وہ تری پورا سے گزر کر چاٹگام پہنچا، پھر اگلے حالات کے حوالے سے یہاں دو قسم کی روایات مشہور ہیں:

(الف) شہزادہ تری پورا کے علاقہ اور دوئی پور سے ہو کر چاٹگام پہنچا، پھر چاٹگام کی پہاڑیوں کے کنارے کنارے ارکان کو روانہ ہوا، اس کی ان گزرگاہوں میں شہزادہ شجاع کے نام پر بعض مقامات آج بھی مشہور و معروف ملتے ہیں۔

(ب) شجاع حالیہ چاٹگام کے ''القری'' نامی محلہ (جو دریائے کرنا فولی کے ساحل پر واقع ہے) کے قلعہ میں چند روز ٹھہرا، اور وہاں سے مکہ مکرمہ جانے کا ارادہ کر لیا تھا، یہ جگہ بعد میں ''شجاع کاٹگر'' کے نام سے مشہور ہوئی، ادھر انگریزوں کے دور حکومت میں فٹکچری تھانہ میں شجاع نگر اور کوتوالی تھانہ میں شجاع کاٹگر نامی دو مقامات بھی مشہور و معروف تھے۔(۱)

بہر حال شہزادہ شجاع نے یہاں سے مکہ مکرمہ جانے کی بڑی کوشش کی تھی، بالآخر وہ ناکام ہوا، اور دریائے کرنا فولی کو عبور کرتے ہوئے براہِ دولھا زارا اور عید گاں سے ہو کر عید گر پہنچا، جہاں اس نے تری پورا راج کے جلاوطن شہزادہ گو بندا مانیک سے ملاقات کی، پھر یہاں سے روانہ ہو کر دریائے ناف کو عبور کرتے ہوئے ۲٦ / اگست/ ۱٦٦۰ کو مروہانگ پہنچا، یہاں بابوڈنگ نامی ایک پہاڑی کے کنارے بنے ہوئے ایک بھانس کے گھر میں اس نے سکونت اختیار کر لی، یہاں شجاع سمیت سارے خاندان کے افراد کو ٹھہرایا گیا تھا۔

شہزادہ شجاع کے انجام کے حوالے سے مورخین کے مابین شدید اختلافات پائے جاتے ہیں، چنانچہ عبدالحق چودھری رقمطراز ہیں کہ:

> ''شہزادہ کے مظلومانہ قتل کے حوالے سے مورخین کے مابین شدید اختلاف ہے، بعض مورخین کا بیان ہے کہ شہزادہ کے پناہ گزین ہونے کے بعد اورنگ زیب کے حکم سے میر جملہ نے ارکانی راجا کے نام خط لکھا، جس میں بتایا گیا تھا کہ شجاع مع اہل وعیال کو میر جملہ کا حوالہ کر دیا جائے، اور اس کی خلاف ورزی پر دھمکی دی گئی تھی کے ارکان پر مغلوں کا حملہ ہوگا، چنانچہ یہ خط ملتے ہی راجا نے مارے غضب کے شہزادہ کو قتل کر دیا، لیکن بعض مورخین کا کہنا ہے کہ ارکانی راجا کو شہزا دہ کی دولت اور شہزادیوں کی پری پیکر صورت

(۱) عبدالحق چودھری، بحوالۂ جورس ڈکشن، لسٹ آف دے دسٹرکٹ چٹاگانگ، ۱۹۳۰ء۔

> نے بدحواس بنا دیا تھا، جب کہ بعض مورخین کا یہ بھی کہنا ہے کہ شہزادہ نے ارکانی راجا کو تخت شاہی سے اتار کر خود تخت ارکان پر جلوہ افروز ہونا چاہا تو وہ اس سازش میں پکڑا گیا، آ کر کا ۷/فروری/۱۶۶۱ء کو اسے قتل کر دیا گیا تھا"۔(۱)

بہر حال تاریخ سے جہاں تک پتہ چلا کہ ۷/فروری/۱۶۶۱ء کو شہزادہ کو بشمول اس کے ساتھیوں اور دوستوں کے شہید کر دیا گیا، جس کے بعد اس کے اہل وعیال کو قید کر کے راجا کے حرم میں لایا گیا تھا، راجا نے پیارا بانو کی عصمت دری کی کوشش کی تو پیارا بانو نے بذات خود اپنے پیٹ میں چھرا گھونپ کر جان دے دی، پھر گل رخ بانو اور روشن آراء نے زہر قاتل سے اپنی اپنی جانوں کو ملک الموت کا حوالہ کر دیا، لیکن آمنہ بانو کو بزور بازو اپنے حرم میں لانے میں راجا کامیاب ہو گیا تھا، جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے بھی کھائے پیئے بغیر چند دن میں اپنی جان دے دی۔

شہزادہ شجاع کی شہادت کے چند دن بعد اس کے لڑکوں کو قید و بند سے آزاد کیا گیا تھا، کہا جاتا ہے کہ جولائی/ ۱۶۶۳ء کو ان شہزادوں نے راج بستی میں آگ لگادی تھی، چنانچہ ان کو اس الزام میں کہ اس سازش میں ان کا ہاتھ ہے کہ پکڑ کر قتل کر دیا گیا۔

بعض مورخین کا کہنا ہے کہ ۱۶۶۴ء کو بنگال کے صوبیدار نے شہزادہ شجاع کے بقیہ اہل وعیال کو آزاد کرنے کے لئے ارکان کی طرف ولی بیگ کو روانہ کیا تھا، ولی بیگ ارکان پہنچا اور راجا سے ملاقات کی، اس نے راجا سے شہزادہ کے قتل کی وجہ دریافت کی تو راجا غضبناک ہو کر اس کو ارکان سے فوراً نکل جانے کا حکم دیا تھا، مورخین کے مطابق اس حکم کی تعمیل بھی ہوئی تھی۔(۲)

ہمارے ممدوح شاعر الاول کو بھی اس سلسلے میں اس الزام پر گرفتار کر لیا گیا تھا کہ انہوں نے شہزادہ شجاع کا ساتھ دے کر ارکانی راجا کو تخت ارکان سے اتارنے کی سازش کی تھی، چنانچہ انہیں قید خانہ کی اندھیری میں غرق کر دیا گیا تھا، اس سلسلہ میں سندھ سودھمہ نے بہتوں مسلمانوں کو بھی جام شہادت پلادیا تھا، ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں پر ظلم وزیادتی کے پہاڑ توڑے گئے تھے، جس کی داستان بڑی طویل ہے(۳)

---

(۱) عبدالحق چودھری، ص: ۱۳۰۔

(۲) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو صدیق خان، شجاع کی زندگی کی شام، ساھتیہ پتریکا، ص: ۹۲-۱۲۶۔

(۳) مزید تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو راقم سطور کی تصنیف: سرزمین ارکان کی تحریک آزادی تاریخی پس منظر میں۔

الاول ارکان کے زندان میں

الاول کے عظیم اور باکمال محسن وزیر اعظم ماگن ٹاکور کی اچانک موت کے بعد وہ پریشانی اور مصیبت کی دلدل میں پھنس گئے، تو دوسری طرف ٹھیک اس وقت مغل شہزادہ شجاع ارکان پہنچ گئے تھے، ان کی شہزادہ سے ملاقات بھی ہوگئی تھی، بعد ازاں شہزادہ کو مع اہل وعیال اور دوست واحباب قتل کیا گیا تو الاول بھی مصیبت اور آزمائش کے جال میں پھنس گئے تھے، چونکہ بعض حاسدین ان کی خداداد صلاحیت اور فطری استعداد سے برہم اور نالاں تھے، شہزادہ کے دلدوز قتل کے بعد ان حاسدین نے راجا کے کان بھر دیا کہ الاول شجاع کے نہ صرف حامی تھے بلکہ اس کی ناجائز سازش میں وہ بذاتِ خود ملوث بھی تھے، اور تو اور راجا کو یہ کہہ کر باور کیا گیا کہ شجاع کے بعد راجا کو الاول کی خبر لینی چاہئے، مزید یہ کہہ کر بھڑکایا گیا کہ:

> "چونکہ الاول شجاع کے حالات و واقعات سے بخوبی واقف ہیں، وہ یہ سارے دلدوز حالات دلی کے مغل شہنشاہ اورنگ زیب کو لکھ بھیجیں گے، اگر شہزادہ کے حالات الاول کی زبانی اورنگ زیب سنیں گے تو وہ غضبناک ہو کر آپ کی خبر لینے نکلیں گے، ویسے معاملہ بہت خراب ہو جائے گا، اور ارکان کو طوفان کرب و بلا کا سامنا کرنا ہوگا"۔

ارکانی راجا نے یہ بات سنی تو تھوڑی دیر خاموش رہا، پھر کہا کہ اگر اس حالت میں الاول کو قتل کر دیا جائے گا تو معاملہ اور بھی پیچیدہ ہونے کا امکان ہے، اس لئے ان کو قتل کرنے سے زیادہ بہتر یہی ہوگا کہ ان سے ساری دستاویزات ہڑپ کر اسے زندان کی اندھیری میں غرق کر دیا جائے، تاکہ وہ باہر کی روشنی دیکھنے نہ پائے، چنانچہ الاول کو زندان کی اندھیری میں غرق کر دیا گیا تھا۔

الاول ارکان کے زندان میں پچاس روز پڑے رہے، لیکن اس درمیان راجا الاول کے پاکیزہ حالات سے واقف ہو گیا، چونکہ الاول سرے سے مجرم نہ تھے، اور شہزادہ کے حوالہ سے اس پر جرم عائد نہیں کیا جا سکتا تھا، اب راجا سمجھ گیا کہ وہ ایک صاف ستھرا انسان ہیں، جرم نے ان کو چھو کر بھی نہیں گزرا

ہے، چنانچہ ایسے پاک وصاف انسان کوزندان میں غرق کرر کھنا ایک عظیم غلطی ہے، یہ سوچ کر راجا نے وفاقی وزیر سلیمان کو بلاوا بھیجا، دربار میں سلیمان پہنچے تو راجا نے ان سے الاول کے متعلق مشورہ چاہا، سلیمان نے بھی الاول کے حق میں رائے دی تو ان کی باعزت کی رہائی ہوگئی، اور حاسدین میں سے چنداں کو قتل اور چنداں کو جیل کی اندھیری میں غرق کردیا گیا تھا۔

بایں ہمہ الاول کو اپنی کھوئی ہوئی دولت واپس نہ ملی، اسی لئے اس کے بعد ایک طویل مدت تک وہ خوشحال نہ ہوسکے، ہر سمت سے مصیبت اور آزمائش نے ان کو اپنے آغوش میں لے رکھا تھا۔

ہفت پیکر

الاول صاحب اب ایک طرف معاشی بحران کے شکار تو دوسری طرف ضعف اور بڑھاپے کی کمزوری کے مارے ہوئے تھے، ایسے حالات میں الاول کی زندگی کو اور ایک موڑ پر لا کھڑا کر دیا تھا، اب وہ پچھلے دنوں کی طرح قلم کاری اور شعر وشاعری کے دلدادہ نہ رہے، ویسے بہت دن کٹ گئے، اور حالات نے ان کا ساتھ نہ دیا تھا۔

ٹھیک ایسی حالت میں ارکانی وزیر سید محمد کی نظر الاول پر پڑی، چونکہ سید محمد مرحوم ایک عالم اور بڑے پنڈٹ انسان تھے، تو انہوں نے علم ودانش اور فکر وفن کی قدردانی کرتے ہوئے الاول کو بلاوا بھیجا، الاول تشریف لائے تو سید محمد نے ان سے مخاطب ہوکے کہا کہ:

> ''حضرت! آپ ایک پنڈٹ اور گیانی انسان ہیں، میری نظر میں آپ جیسے مقبول و معروف پنڈٹ آج کل ارکان میں نہیں ہے، ہم جانتے ہیں کہ حالات نے آپ کو مجبور ومعذور بنا رکھا ہے، لیکن انسان کوشش کرتا ہے تو حالات بھی بدل سکتے ہیں، آپ نے اگر اپنی قلم کاری اور شاعری بند کردی تو یہ ارکان کے علم ودانش کا بڑا نقصان ہوگا، جو ہم نہیں چاہتے''۔

اب الاول نے سید محمد کو جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ:

> ''جناب من! آپ جیسے پنڈٹ، گیانی، صاحب اقتدار اور معزز انسان نے فقیر کو اپنے دربار میں بلا کر ہمت افزائی کی، اور بڑا کرم فرمایا ہے، جس کا میں احسان مند ہوں، چونکہ فقیر نے اپنی زندگی علم وتحقیق میں ختم کی ہے، اب وقت کا تقاضا یہی ہے کہ فقیر اپنے بڑھاپے کو عبادت الٰہی اور خدا کی بندگی میں گذار دے، اب بڑھاپا آیا تو پڑھائی اور نغمہ سرائی میں دل نہیں لگتا، اور ایسے بڑھاپے کی حالت میں جس طرح فقیر کو اپنی کمزوری اور ضعف کی شکایت ہے، اسی طرح اپنی بحرانی معاشی کیفیت کا گلہ بھی ہے، ایسی مصیبت وکس مپرسی کی حالت

میں فقیر کو صرف اپنی زندگی کے بقیہ ایام کے گزارا کی فکر ہے، ایسی حالت میں فقیر کو نغمہ سنجی اور شعروشاعری کی فرصت کہاں؟''۔

سید محمد اپنی سنجیدگی کا سہارا لیتے ہوئے الاول سے مخاطب ہوئے اور کہا کہ:

'' حضرت ! میں آپ کے تمام حالات سے بخوبی واقف ہوں ، آپ براہ کرم شعروشاعری کی دنیا کو واپس آجایئے ، اور ہمت سے کام لیجئے ، خدا کرے تو ایسی ضعف و کمزوری کی حالت میں بھی کچھ کام ہوسکتا ہے، آپ اپنی بقیہ زندگی کے گزارے کی فکرمت کیجئے ، خدا کرے تو اس کی ذمہ داری میں لیتا ہوں ، اللہ تعالی کوئی راستہ نکال دے گا''۔

اب الاول نے ذرا تفکر کے بعد فرمایا:

''جناب من! آپ مجھے چند دن سوچنے کی مہلت دیجئے! اگر فقیر کی ہمت نے کام کیا تو فقیر پھر دوبارہ شعروشاعری کی دنیا کو آباد کرنے کی کوشش کرے گا''۔

یہ کہہ کر الاول مجلس سے اٹھ چلے گئے۔

چند روز بعد پھر دربارہ الاول کو بلایا گیا، الاول بڑی پریشانی کی حالت میں دربار جانے کی تیاری کی، ادھر دربار وزیر میں ملک کے بہتوں گیانی اور پنڈت حضرات منتظر تھے، الاول دربار میں پہنچے تو سارے گیانی اور درباری خوشی کے مارے پھولے نہ سمائے ، اب سارے کہ سارے لوگوں نے ان سے التماس کرتے ہوئے کہا کہ جناب ! براہ کرم ایک اچھی کہانی سنایئے ، چنانچہ لوگوں کی تمنا اور عرضی کے احترام کرتے ہوئے الاول نے فارسی کے عظیم شاعر نظامی کی مشہور کتاب ''ہفت پیکر'' سے کچھ داستان پڑھ سنائی۔

نظامی فارسی کے ایک بڑے شاعر تھے، آپ کی ولادت ۵۳۵ ء میں ہوئی ، آپ کا پورا نام نظام الدین ابومحمد الیاس تھا، آپ نظامی گنج آبی سے معروف ومشہور ہیں، آپ نے فارسی زبان میں طبع آزمائی کی اور بہتوں دواوین لکھ چھوڑے ہیں، جن میں لیلی مجنون ، خسرو شیرین، سکندر نامہ اور ہفت پیکر جیسے دواوین قابل ذکر ہیں۔

الاول کی مدبھری آواز اور دلفگار ترنم میں ہفت پیکر کی کہانی سن کر دربار کے سارے حاضرین مسحور و مخمور ہوگئے تھے، اب سید محمد نے الاول سے مخاطب ہوکر کہا کہ:

''جناب ! آپ براہ کرم نظامی کی یہ کتاب ''ہفت پیکر'' بنگلا میں ترجمہ کردیجئے ، اگر آپ اس کتاب کو بنگلا زبان میں منتقل کردیتے ہیں تو یہ بنگلہ زبان وادب کے ساتھ بنگال کے لوگوں پر بڑا احسان ہوگا ، جو ہم چاہتے ہیں''۔

آخر کار الاول وزیر سید محمد کی عرضی کے جال میں پھنس کر اس کے ترجمہ کرنے پر راضی ہوگئے ، چنانچہ آپ نے اپنے تن، من ، دھن کو اس کام میں لگادیا تھا۔

دراصل نظامی گنج آبی کے دیوان ''ہفت پیکر'' سات کہانیوں کا ایک مجموعہ ہے، کہانی کا اصل روپ کچھ اس طرح ہے کہ:

ایران کا ایک بادشاہ جس کا نام نعمان تھا، اس کا اکلوتا بیٹا جس کا نام بہرام گور تھا، نعمان نے اپنے بیٹے کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجا ، بہرام گور یمن پہنچ کر بڑی عیش وعشرت سے حکومت کررہا تھا، مگر چند دن بعد بہرام گور کی عیش وعشرت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دشمن نے یمن کی حکومت کو اکھاڑ پھینکنے کی سازش کی ، لیکن بہرام گور نے اپنی لیاقت وشجاعت کے سہارے دشمنوں کے سارے عزائم کو تہ و بالا کرتے ہوئے یمنی حکومت کو مستحکم کرلیا تھا ، پھر چند دن بعد خبر ملی کہ اس کے باپ نعمان کا انتقال ہوچکا اور اس کے ایک وزیر نے اس کی موت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تخت شاہی پر قبضہ کرلیا ہے۔

اس پریشانی کی خبر پاتے ہی بہرام گور پوری تیاری کے ساتھ ایران کی طرف روانہ ہوگیا، اور طرفین کی افوج آمنا سامنا ہوئیں تو بہرام گور نے وزیر کے نام خبر بھیجی کہ اگر لڑائی ہوگی تو طرفین کی جان ومال کا بھاری نقصان ہوگا ، جو دراصل ایران ہی کا نقصان ہوگا ، اب سزاوار یہی ہے کہ طرفین کے مابین کی لڑائی نہ ہونے پائے ، اس کی شکل یہ ہے کہ ادھر سے بہرام گور نکلے اور ادھر سے وزیر، معرکہ میں جو جیتے گا وہی ملک کا اگلا بادشاہ بنے گا ، علاوہ ازیں تاج وتخت کے مالک وہ اور اس کے اگلا خاندان ہوگا۔

چونکہ وزیر پہلے سے بہرام گور کی شجاعت اور قوت بازو سے واقف تھا، اب اس نے بغیر لڑائی کے بہرام گور کو تاج وتخت حوالہ کردیا ، یوں ایک لڑائی بغیر قتل خون کے ختم ہوئی تھی ، یہ کہانی پوری دنیا میں مشہور ہوگئی تو نظامی نے اس قصہ کو بڑی خوبی سے سجایا، پھر الاول نے اس دیوان کو ۱۶۶۳ ء میں بنگلا زبان میں منتقل کردیا۔(۱)

---

(۱) امرتو لال بالا ، الاول کے کلام میں ہندو مسلم ثقافت ، ص: ۲۱۹۔

تحفۃ النصائح

الاول نے ہفت پیکر کو بڑے اہتمام کے ساتھ ترجمہ کیا، اور بہت کم مدت میں یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچا تھا۔ ہفت پیکر کا کام تمام ہوا تو ٹھیک تھا، لیکن الاول کے دل میں وہی طمانیت اور وہی سکون پھر واپس نہیں آسکا جو ما گن ٹا کور کے زمانے میں تھا، وہ جہاں بھی جاتے پریشانی اور آلام ان کا پیچھا نہیں چھوڑتے تھے، پھر بھی الاول نے ہفت پیکر کے ترجمہ میں صبر واستقامت کا ثبوت پیش کیا تھا۔

ہفت پیکر کے ترجمہ کا کام تمام ہوا تو الاول کی زندگی نے اور ایک موڑ لیا، کہ الاول کو دل کی تڑپ نے ایک عظیم انسان اور انسانیت کی تربیت دینے والے مرشد کامل کے یہاں پہنچا دیا، جن کا نام گرامی حضرت شیخ سید مسعود شاہ (شہید) رحمۃ اللہ علیہ تھا۔

سرزمین ارکان کے عظیم ترین تاریخی شخصیت حضرت سید مسعود شاہ اپنے زمانے کے بڑے پائے کے عالم دین اور صاحب حال بزرگ تھے، آپ کے تلامذہ اور مجاز بیعت ارکان کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے تھے، انہوں نے سرزمین ارکان میں خانقاہوں اور مدرسوں کا جال پھیلا رکھا تھا، اور دین ودعوت کا کام بڑی خوبی سے انجام دیا تھا، جن میں صبر وشکر اور ایثار وہمدردی کے علاوہ اور کسی چیز کی گنجائش ہی نہیں ہوتی تھی، الاول کو حضرت شیخ نے اپنی ارادت میں لیتے ہوئے صبر وشکر اور طمانیت و سکون کی تلقین کی، اور ہر حالت میں خداوند کریم کی نافرمانی اور ناشکری سے دور رہنے کی ہدایت دی، الاول نے حضرت شاہ مسعود کے پاک ہاتھ پر بیعت کرنے کے بعد ایک طرح کی طمانیت محسوس کی، اور راہ طریقت وسلوک کے رہرو بن کر زندگی گزارنے لگے تھے۔

بعد ازاں الاول نے حضرت یوسف حسینی چشتی دہلوی (معروف بہ یوسف گدا کی مشہور کتاب ''تحفۃ النصائح'' کا ترجمہ شروع کیا، دراصل یہ ایک دیوان ہے، جو اسلام کے بنیادی احکام پر مشتمل ہے، جس میں کلمہ شریف، نماز، روزہ، حج، زکوۃ، تلاوت قرآن، اذکار کے احکام موجود ہیں، الاول نے اُس کتاب کے ترجمہ کر کے بنگلا زبان بولنے اور پڑھنے والے مسلمانوں پر بڑا احسان کیا ہے، جسے کبھی بھلائے جانے کا نہیں ہے، اس کتاب نے صرف سرزمین ارکان نہیں بلکہ بنگال کے مسلمانوں کو اپنی

طرف متوجہ کرلیا تھا، یہ کتاب گھر گھر میں پڑھی اور سنی جاتی تھی، بطور خاص دینی حلقوں میں اس کتاب کی تلاوت ہوتی تھی اور لوگ بیٹھ بیٹھ کر سنتے اور اس کے احکام پر عمل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

حضرت شیخ یوسف گدا حسینی چشتی ایک ولی کامل اور درویش بزرگ تھے (۱) آپ نے اپنی پوری زندگی کو علم وعرفان اور دین ودعوت کی راہ پر صرف کیا، عبادت وریاضت، مجاہدہ وتلاوت سے اپنی زندگی میں جان پیدا کی، آپ حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلوی کے مجاز بیعت تھے، آپ نے حضرت چراغ دہلوی سے بیعت ہو کر راہ سلوک وطریقت پر قدم رکھا، آپ نے اپنی مشہور کتاب ''تحفۃ النصائح'' کو بڑے اہتمام سے تحریر فرمایا تھا، خود آپ کا یہ فرمانا ہے کہ ''میری امید ہے کہ یہ کتاب ہر زمان ومکان میں مسلمانوں کی رہنمائی کرے گی، اور مسلمانوں کو اس سے بڑا فائدہ ہوگا'' ویسے بھی حضرت شیخ کی امید بھر آئی کہ اس کتاب سے مسلمانوں کا بہت بڑا فائدہ ہوا تھا۔

دراصل حضرت یوسف گدا نے اس کتاب کو اپنے لائق فرزند حضرت ابوالفتح کو اسلامی بنیادی احکام کی تعلیم دینے کے لئے عربی سے فارسی زبان میں منتقل کیا تھا، فارسی زبان میں تحریر کی گئی یہ کتاب پورے برصغیر میں شہرت پائی تھی، صرف ہندوستان میں نہیں بلکہ افغانستان سے لے کر ارکان تک یہ کتاب پھیلی ہوئی تھی، علم ودانش کے مالک حضرات اس سے محظوظ ہونے لگے تھے، ارکان میں اس کتاب کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی تھی، جس کے متعلق الاول کا بیان ہے کہ:

> ''صاحبزادۂ گرامی ابوالفتح بڑے صاحب علم انسان تھے، ان کے لئے اپنے والد حضرت یوسف گدا حسینی چشتیؒ نے یہ کتاب عربی سے فارسی میں منتقل کیا تھا، اور اس کی بڑی شہرت بھی ہوئی تھی''۔ (۲)

چونکہ اس زمانے میں ارکان کے مسلمان بنگلا زبان وادب کے حامل تھے، تو چندرا سودھمہ کے وزیر سلیمان نے الاول کو اس کتاب کی طرف توجہ دلائی تھی، اور کہا کہ جناب! اس کتاب کو فارسی زبان سے منتقل کر کے بنگلا زبان میں لایا جائے تو مسلمانوں کا بہت فائدہ ہوگا، اور آپ کی خدمات مسلمانوں

---

(۱) تحفۃ النصائح، ص: ۷۲، بنگلا اکیڈیمی، ڈھاکہ۔

(۲) تحفۃ النصائح، ص: ۷۲، بنگلا اکیڈیمی، ڈھاکہ۔

کے حق میں ایک نور وضیاء کا کام دیں گی، چنانچہ الاول نے وزیر کی عرضی قبول کرتے ہوئے اس کتاب کا ترجمہ کیا تھا۔(۱)

الاول نے اس کتاب میں علم وعمل کے حوالے سے اپنی طرف سے بھی بہت سارے حقائق لائے ہیں، آپ نے کبھی کبھار حضرت یوسف گدا سے آزاد ہوکر اس میں علم وعرفان کا دریا بہادیا ہے، جو بھی اس کتاب کو پڑھے گا الاول کی ژرف نگاہی کے اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکے گا۔

الاول ۱۶۶۳ء کے اوخر میں اس کے ترجمے کا کام ہاتھ لیا تھا، اور سات مہینے کے اختتام پر ۱۶۶۴ء میں اسے مکمل کردیا، الاول جو ایک بڑے شاعر وادیب ہونے کے علاوہ ایک بڑے پائے کے عالم دین ،صاحب نظر بزرگ اور شریعت وطریقت کے رمز شناش ہیں، اس کے ثبوت کے لئے بس یہی کتاب کافی ہے۔(۲)

(۱) تحفۃ النصائح، ص: ۲۸، بنگلا اکیڈیمی، ڈھاکہ۔

(۲) تحفۃ النصائح کے متعلق مزید کچھ گزارشات اگلی سطور میں آئیں گی۔

الاول کی آخری زندہ کاوش سکندر نامہ

سکندر نامہ حضرت الاول مرحوم کی آخری اور زندہ کاوش ہے، شہزادہ شجاع کے قتل کے بعد آپ جیل بھیجے گئے تھے، باوجودیکہ آپ پچاس روز کے بعد رہا کئے گئے مگر ایک طرف آپ کے سر پر نہ جانے کن وجوہات کی بنیاد پر جرمانہ کا ایک عظیم بارگراں تھونپ دیا گیا تھا، جس کی ادائگی اس مصیبت اور پریشانی کے حالات میں آپ کے لئے انہونی چیز بن گئی تھی ، جب کہ دوسری طرف آپ کو جیل بھیجے جاتے وقت آپ کے سارے اموال اور جائدایں سرکار نے اپنی تحویل میں لے لی تھیں، جو کبھی واپس نہیں ملیں ، ایسی پریشانی اور غیر یقینی حالات میں الاول اپنی روشن اور سنہری زندگی کے ایک روشن باب گھنوانے پر مجبور ہو گئے تھے، اور پریشان کن حالات سے دوچار ہوکر تقریباً اپنی امید وامنگ کے سارے دروازے بند کر لئے تھے۔

اس وقت کے حالات کے متعلق الاول خود رقمطراز ہیں کہ:

> ''باوجودیکہ بھیک مانگنا ایک اچھا کام نہیں ہے، جو انسان کو ذلیل وخوار کردیتا ہے، مگر میں اس بڑھاپے کے حالات میں اپنے بال بچہ اور اہل وعیال سمیت اس رسوا کن حالات کا شکار ہوگیا تھا، علم وہنر کی وجہ سے لوگ مجھے نگاہِ کرم واحترام سے دیکھتے تو ٹھیک تھے، لیکن میں مجبور تھا، چنانچہ بھیک کے سہارے راجا کا جرمانہ ادا کرنے پر مجبور ہوگیا تھا''۔(۱)

اس پریشان کن حالات میں الاول نے اپنی زندگی کے نو سال کٹوادیئے تھے، بعدازاں سید موسی کے آسرا میں ''سیف الملوک بدیع الجمال'' جیسی زندہ کاوش لکھی ، یہاں ایک بات جو قابل ذکر ہے وہ یہ ہے کہ باوجودیکہ ان نو سال کے بعد سید موسی کا آسرا ملا تھا، لیکن اس نے بھی الاول کی پریشانی کو دور نہ کرسکا، ویسی بڑی کوشش کے باوجود بھی الاول پریشانی کی وادی سے نہ نکل سکے تھے۔

ان پریشان کن حالات میں ایک روز سرزمین ارکان کے ایک اور وزیر اعظم حضرت مجلس نے ملک کے

(۱) نورالاسلام مانیک، عظیم شاعر الاول، ص: ۶۲، بحوالہ الاول۔

بڑے بڑے علماء، فقہاء، شعراء اور ارباب بست وکشاد کو کھانے پر بلایا، جن میں حضرت الاول بھی مدعو تھے، کھانے پینے کے اختتام پر لوگ وزیر اعظم کی مدح سرائی کرنے لگے، اس حوالے سے خود الاول رقمطراز ہیں کہ:

''وزیر اعظم مجلس صاحب نے ملک بھر میں بہت ساری اچھی اچھی خدمات انجام دی ہیں، بہتوں تالاب بنوائے ہیں، جن سے لوگ پیاس بجھاتے ہیں، اور مختلف مقامات میں مساجد بنوائیں اور لوگوں کے لئے نماز کی جگہے کا انتظام کیا، ان سارے اچھے اچھے کاموں اور قابل ستایش خدمات کی وجہ سے ملک بھر میں اور خارج ملک میں بھی ان کی شہرت عام ہو چکی تھی''۔(۱)

لوگوں کی مدح سرائی کے جواب میں وزیر اعظم نے کہا تھا کہ:

''میں نے جتنے بھی کام کئے وہ تو ملک کے حدود وثغور کے اندر ہی رہیں گے، جس کی شہرت ملک کے باہر شاید پہنچے گی، اگر کسی انسان کی مدح سرائی دواوین اور تصانیف کی وجہ سے کی جاسکتی ہے تو اس کا حق دار الاول ہیں، یاد رہے کہ تصنیف کی وجہ سے ایک طرف انسان کی شہرت پوری دنیا میں پہنچ جاتی ہے، تو دوسری طرف وہ تصنیف زندہ اور بے موت ہو کر قیامت تک باقی رہتی ہے، علاوہ اس کے جس طرح صاحب تصنیف کا نام باقی رہتا ہے، اسی طرح اسے امداد وتعاون کرنے والا بھی باقی رہتا ہے''۔(۲)

سید موسی نے اس مختصر سی تقریر کے بعد الاول کی طرف متوجہ ہو کر کہا کہ:

''آپ ہمارے ملک کے سب سے بڑے شاعر ہیں، اگر آپ چاہتے ہیں تو آپ کی طرح مجھے بھی بے موت بنا سکتے ہیں''۔(۳)

الاول نے وزیر اعظم کے اس تقریر کے جواب میں فرمایا کہ:

---

(۱) الاول، سکندر نامہ، مطبوعہ ڈھاکہ، ۱۹۷۷ء، ص: ۲۹۔۳۰۔

(۲) ڈاکٹر عبد الکریم، عبد الکریم ساھتیہ بیشارد، حالات وکارنامے، ص: ۲۶۲۔

(۳) نور الاسلام مانیک، عظیم شاعر الاول، ص: ۶۵۔

''آپ نے تصنیف وتالیف کے سلسلے میں جتنی بھی باتیں کیں، یہ سب ٹھیک ہیں، لیکن فقیر میں دوبارہ تصنیف وتالیف کی دنیا میں اترنے کی سکت بالکل نہیں ہے، ایک طرف بڑھاپے کی پریشانی تو دوسری طرف راجا کے مجھ پر تھونپا ہوا جرمانہ''۔(۱)

الاول نے اس سلسلے میں اپنے حالات کو کھول کھول کر لوگوں کے سامنے بیان کیا تو وزیر اعظم نے ان کے جواب میں کہا کہ:

''اگر آپ اس بات کا مجھے یقین دلا سکتے ہیں کہ پریشان کن حالات سے رہائی کے بعد آپ پھر سے تصنیف وتالیف اور شعر وشاعری کی دنیا میں لوٹ آئیں گے، تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ خدا کرے تو آپ کو اس پریشانی سے ضرور رہائی مل جائے گی''۔(۲)

بالآخر الاول نے وزیر اعظم کو اس بات کا یقین دلایا کہ خدا کرے تو وہ پھر سے تصنیف تالیف کی دنیا میں اتر جائیں گے، چنانچہ اس یقین دہانی کے بعد وزیر اعظم نے آپ کو پریشانی سے رہائی دلانے کی ہر ممکن کوشش تیز کردی، جس کے نتیجے میں آپ کو رہائی بھی ملی، جس کے بعد آپ نے اور ایک زندہ تصنیف تحریر کی، جس کا نام سکندر نامہ ہے۔

دراصل سکندر نامہ فارس کے عظیم شاعر نظامی کی کتاب/ دیوان کا بنگلا ترجمہ ہے، الاول نے اس کے ترجمہ کر کے اس بات کا ثبوت پیش کر دیا ہے کہ وہ ایک عظیم گیانی اور بڑے عالم ہیں، دراصل سکندر نامہ کا ترجمہ مذاق کی بات نہ تھی، کیوں کہ یہ عربی، فارسی، ترکی کے ساتھ چند اور زبانوں کے سخت ترین الفاظ و محاورات کے علاوہ دیگر چنداں زبانوں کے سخت ترین جملوں، دقیق معانی، اشارات وتلمیحات سے بھری پڑی ایک کتاب ہے، اور اس کا ترجمہ کرنا درحقیقت بحر بیکراں کی شناوری کرنا تھا، تو الاول نے اس کتاب کے ترجمہ کے دوران اپنے سارے کام کو ترک کر دیا تھا، یعنی دنیا کے تمام علائق سے دور ہو کر اس کا ترجمہ کیا تھا، اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اس کتاب کے ترجمہ کرنے کی کوشش کسی عام پنڈٹ اور گیانی کی ہمت وحوصلہ کی باہر کی چیز تھی، چنانچہ الاول نے اسے ترجمہ کر کے اس بات کا ثبوت پیش کر دیا کہ وہ ایک عام پنڈٹ اور عام گیانی نہیں ہیں، چنانچہ خود الاول اس کتاب کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

---

(۱) نور الاسلام مانیک، عظیم شاعر الاول، ص: ۶۵۔

(۲) نور الاسلام مانیک، عظیم شاعر الاول، ص: ۶۵۔

"اس کتاب کا ترجمہ کرنا دراصل بحر بیکراں میں تیرنے کا دوسرا نام ہے، ظاہر ہے کہ یہ فارسی زبان میں لکھی گئی ایک مشکل کتاب کا ترجمہ ہے، درحقیقت فارسی کے عظیم شاعر نظامی نے اپنی کتاب کو بے شمار اشارات اور تلمیحات سے بھر دیا ہے"۔(۱)

سکندر نامہ کی کہانی ایک فاتح کی فتوحات کی عجیب داستان پر مشتمل ہے، اس داستان کا اجمال کچھ یوں ہے کہ:

سکندر رومی دنیا کو فتح کرنے کی غرض سے اپنے ملک سے باہر نکلا تو سنتا ہے کہ اویسینیا کا راجا "پالنگ" نے مصر میں ہنگامہ برپا کر رکھا ہے، اب سکندر اپنے سارے لشکر سمیت مصر کی نیت سے روانہ ہوتا اور راجا پالنگ کی فوج پر حملہ کر دیتا ہے، اور اپنی ہمت وحوصلہ، جوانمردی و بہادری، چالاکی اور عیاری کا ثبوت دیتے ہوئے پالنگ پر فتح حاصل کر لیتا اور ساتھ ساتھ مال غنیمت کا ایک بڑا پہاڑ جمع کر لیتا ہے، فتوحات کے بعد مال غنیمت کا ایک بڑا حصہ فارس کے شہنشاہ دارا کے ہاں بھیج دیتا ہے، لیکن دارا نہ صرف سکندر کا یہ ہدیہ قبول نہیں کرتا بلکہ سکندر کے سفیر کو ذلیل وخوار کر کے ملک فارس سے باہر بھی کر دیتا ہے، جس کی وجہ سے سکندر دارا کی اس ناجائز اور نالائق حرکت سے نالاں و برہم ہوجاتا اور انتقام لینے کی نیت سے دارا اور اس کے ملک فارس پر چڑھائی کر دیتا ہے۔

بعد ازاں سکندر اور دارا کے مابین مہیب اور انسانیت کش جنگ چھڑ جاتی ہے، جس میں بالآخر سکندر کی جیت ہوتی اور دارا کی ہار، صرف یہی نہیں بلکہ دارا کو اپنے ایک نافرمان خادم کے ذریعے موت کی وادی میں پہنچا دیا جاتا ہے، جب کہ دارا کی آخری خواہش کے نتیجے میں سکندر دارا کی بیٹی روشن سے شادی کر لیتا ہے۔

اس کے بعد سکندر عراق کی فتح کی نیت سے نکلتا ہے اور عراق کو بھی فتح کر کے اسے بھی اپنے ملک کا ایک عظیم حصہ بنالیتا ہے، اس طرح سکندر چند اور ملکوں کو فتح کرتے ہوئے آخر کار اپنے ملک روم کو واپس چلا جاتا ہے۔(۲)

بہر کیف الاول نے اپنی اس کاوش کو ۱۶۷۳ء میں مکمل کیا، اس کاوش کی تکمیل پر راج دربار میں ایک جلسہ منعقد کیا گیا، جس میں الاول کی بڑی مدح سرائی ہوئی تھی، اور لوگ بہت دور دراز سے الاول اور ان کی زندہ کاوش کو دیکھنے آئے ہوئے تھے۔ غرض یہاں خراج تحسین کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔

(۱) نور الاسلام مانیک، عظیم شاعر الاول، ص: ۶۶، بحوالہ الاول۔

(۲) نور الاسلام مانیک، عظیم شاعر الاول، ص: ۶۷۔۶۸۔

پانچواں باب

الاول تصوف وسلوک کی دنیا میں

حضرت شاہ الاول کے دواوین اور ان کے کلام کے مطالعہ سے یہ بات سورج کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ وہ شروع ہی سے ایک صوفی اور درویش انسان تھے، وہ طریقۂ عالیہ قادریہ کے سالک اور مرشد حضرت شیخ شاہ مسعود رحمۃ اللہ علیہ کے مجاز بیعت تھے، مرشد ارکان قاضی القضاۃ حضرت شاہ صاحب ان کو بڑی الفت ومحبت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، ان دونوں مرشد ومرید کے درمیان جو محبت تھی، اس کی تصویر کشی وہی کر سکتا ہے جو بذاتِ خود اس راہِ تصوف وسلوک کے رہرو اور سالک ہو، ورنہ ایک مرشد و مرید کے درمیان پائی جانے والی محبت ولگاؤ کی تصویر کشی ایک عام لکھاری کے بس کی بات نہیں ہے۔

خیر جو کچھ بھی ہو کہ الاول حضرت شیخ اور قاضی القضاۃ شاہ مسعود کے مرید خاص اور مجاز بیعت تھے، یہ تو واضح ہو چکی ہے کہ شاعر اپنی ابتدائی زندگی میں لوگوں کو علم، شاعری، سنگیت سکھایا کرتے تھے، لیکن جہاں تک معلوم ہوا کہ وہ اپنی آخری زندگی میں سنگیت وشاعری کی تعلیم نہیں دیتے تھے، بلکہ زندگی کے آخری ایام میں وہ لوگوں کو راہ حق کی طرف آنے اور طریقۂ عالیہ قادریہ میں بیعت لیتے ہوئے راہ سلوک وطریقت کے رہرو بننے کی دعوت دیتے تھے۔

لیکن بعض سوانح نگاروں کی تحریر سے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ الاول سنگیت وموسیقی کے راز ہائے سر بستہ سے واقف تو تھے ہی اور زندگی کے آخری ایام تک وہ لوگوں کو اس راز سے واقف کراتے رہے تھے، یعنی وہ اپنی زندگی کے آخری ایام تک سنگیت وموسیقی سے لو لگائے ہوئے تھے، چنانچہ ان سوانح نگاروں کے اس دعوی سے معلوم ہوتا ہے کہ الاول برصغیر کے بعض صوفیاء کی طرح اپنی زندگی کے آخری ایام تک سمع ومزامیر سے لو لگائے ہوئے تھے، اور سمع ومزامیر اور رقص وسرود کو راہِ سلوک وطریقت کے لئے ایک نفع بخش عمل سمجھتے تھے، ان سوانح نگاروں نے

اپنے دعویٰ کی صحت پر الاول کی اس بات کو بطور دلیل پیش کیا ہے کہ:

''روشنگ (ارکان) کے جتنے مسلمان ہیں ان سب کو میں اپنے تلامذہ جان کر پیار کرتا ہوں، بڑے اور چھوٹے ہر طبقہ کے لوگوں کو سنگیت وموسیقی، رقص سرود کا درس دیا کرتا ہوں''۔(۱)

جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ شاعر کے بس اتنے کلام سے یہ بات نکالنا کہ وہ اپنی زندگی کے آخری ایام میں بھی لوگوں کو سنگیت وموسیقی کا درس دیتے تھے ٹھیک نہیں ہے، ممکن ہے کہ یہ اس وقت کا کلام ہو کہ جب وہ اپنی زندگی کے عہد شباب میں اس کام کے لئے گویا وقف تھے۔

بیعت کے بعد الاول کو اپنے مرشد کے ساتھ ہمیشہ ویسے لگاؤ تھا، جیسا کہ ایک صاحب نظر مرشد اور صاحب دل مرید کے درمیان ہونا چاہئے تھا، آپ کسی بھی وقت اپنے مرشد کی یاد سے محروم نہیں رہتے تھے، اس حوالے سے وہ قمطراز ہیں کہ:

''مرشد کی یاد سے محروم رہنا ایک بڑے گناہ کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہے، اس لئے میں ہر وقت ان کی یاد کرتا رہتا ہوں، کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ عشق کے لاکنار سمندر کا پار کرنا ان کے بغیر ممکن نہیں ہے، اور میں اس بحر بیکراں کا ایک مجبور شناور ہوں، اور میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ مرشد کو ساتھ رکھنا ہر حال میں ضروری ہے، کیوں کہ ان کی معیت میں ہی اس بحر بیکراں کا پار کرنا ممکن ہے، اس راہِ پر خار اور بحر لاکنار میں ان کے بغیر کوئی میرا دوسرا ساتھی نہیں ہے، اس لئے وہ میری زندگی کا آخری سہارا اور میری حیات کا مقصد وحاصل ہیں، اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ دیدار حق ان کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے''۔(۲)

شاعر دراصل دریائے عشق والفت کے شناور تھے، ان کا یقین تھا کہ عشق والفت کے بغیر انسان اپنی زندگی کے اصلی مقصد کو پا نہیں سکتا، ان کے نزدیک وہ زندگی دراصل زندگی ہی نہیں ہے جس میں الفت وعشق کے موجزن سمندر نہ رہا ہو، ان کے نزدیک عشق کا دریا ایک ایسا دریا ہے جس کا نہ پار ہے نہ کنار، ہاں اس عشق کے دریا کو پار کرنا ممکن ہے صرف اور صرف اس انسان کے لئے جو راہِ سلوک وطریقت کے راہی ہو، اور وہ اس ناپیدا کنار اور متلاطم سمندر سے خائف نہ ہو، راجع نہ ہو، واقف نہ ہوں، بلکہ

(۱) امرتو لال بالا، الاول کے کلام میں ہندو مسلم ثقافت، بحوالہ الاول، ص: ۳۶۴۔
(۲) امرتو لال بالا، الاول کے کلام میں ہندو مسلم ثقافت، ص: ۳۶۵، بحوالہ الاول۔

اپنے مرشد برحق کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اللہ کے نام لئے سالک ہو، شاعر کا یقین یہ بھی ہے کہ اگر سالک کے قلب میں موجزن عشق ہو تو یہ ناپیدا کنار سمندر بھی اس کے سامنے ایک معمولی سا نہر بن جاتا ہے، ایسے سالک کے لئے اس سمندر کا پار کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہوتا، ان کا کہنا ہے کہ اس راہ سلوک وطریقت میں زندگی کی وہ کشتیاں ڈگمگاتی ہوئی متلاطم بھنور میں ہچکولے کھائیں گی، جو مرشد برحق سے محروم ہو چکی ہوں، ان کے نزدیک راہ سلوک میں اس راجع اور واقف کا کوئی کام نہیں جو عشق والفت سے محروہو۔ میں نے اس مضمون کا کھوج شاعر کے دیوان ''پدا پتی'' سے لگایا، چنانچہ شاعر کا بیان ہے کہ:

''کیوں کہ عشق والفت کی وجہ سے یہ دنیا آباد ہوئی ہے، اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ عشق کے بغیر کوئی خیال صحیح معنی میں بن نہیں سکتا، اور ایسے خیالات میں لذت نہیں ہو سکتی کہ جن میں عشق والفت نہ ہو، اور اس دنیا میں جو کچھ بھی ہے اس کا وجود عشق سے ہے، جس کسی کے دل میں عشق کا ایک پودا ہو، اور اس پودے کا وہاں نشوونما بھی ہو رہا ہو تو اس نے دراصل زندگی کے اصل رازہائے سربستہ کو پالیا ہے''۔(۱)

الاول عام متصوفین کے خلاف راہِ سلوک کے ایسے راہی کو ملامت کرتے ہیں جو بظاہر عشق کے مارے کنگال تو بن چکا ہو، لیکن اس کے اندر تلاش، جستجو، ریاضت اور مجاہدہ نہ ہو، ساتھ ہی ساتھ جس کے اندر علم وعمل کا بھی فقدان ہو، وہ راہِ سلوک کا راہی نہیں بن سکتا، بخلاف اس کے جو عشق والفت کے ساتھ ساتھ علم وعمل سے بھی متصف ہو، مقصد کو پانے کے لئے تلاش وجستجو کے ساتھ راہ سلوک کے فرائض بھی بجالاتا ہو، وہ ایک نہ ایک دن منزل مقصود تک پہنچ جاتا ہے۔

یہاں ایک بات قابل ذکر ہے کہ شاعر اپنے مرشد سے ملاقات سے قبل برصغیر کے بعض شعراء کی طرح صوفیت سے شدید متاثر تھے، کیوں کہ شاعر کو ایک ایسے ماحول نے متاثر کیا تھا جس میں باوجودیکہ اسلامی تہذیب وثقافت کا کچھ نشوونما بھی ہوا تھا، لیکن اسے گہوارۂ اسلام حجاز مقدس سے دور ہونے کے ساتھ بعض ناسمت شناس خدامانِ اسلام کی ناسمت شناسی نے دے مارا تھا، کہتے ہیں کہ شاعر نے مجاز بیعت بننے سے پہلے دو باہم متضاد نظریۂ حیات یعنی اسلام اور ہندومت میں تطبیق دینے کی کوشش کی تھی

(۱) ملاحظہ ہو، پدا پتی، از الاول۔

،چنانچہ ڈاکٹر امرتولال بالا کے مطابق شاعر کا دیوان ''پدا پتی'' ہندومت/ ویدانت اور اسلامی تہذیب و ثقافت کا سنگم ہے، پھر یہاں کسی قدر ہم بھی دیکھتے ہیں کہ خاکم بدہن پدا پتی کے نظریۂ حیات میں اسلامی افکار سے زیادہ صوفیت کی شکل میں ویدانت/ جوگیت کا نظریہ کارفرما ہے۔

بعض اہل نظر حضرات کے نزدیک صوفیت (عام حالات کے مطابق) ایک ایسا نظریۂ حیات ہے جس سے نہ دنیاوی اور نہ اخروی مقاصد پورے ہوسکتے ہیں، یعنی صوفیت ان کے نزدیک دراصل رہبانیت اور جوگیت کا دوسرا نام ہے۔ لفظ تصوف کا اصل صوف سے ہو یا صفاء سے، صفو سے ہو یا صفہ سے یا بعض حضرات کے مطابق اس کا ماخذ یونانی لفظ صوفیا سے ہو (۱) لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کا ماخذ نہ قرآن ہے اور نہ احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم، نہ ہی اصحاب باصفا رضوان اللہ علیہم اجمعین کے آثار میں اس کا کوئی سراغ ملتا ہے اور نہ ہی تابعین کے اقوال میں اس کا کوئی پتہ، ہم قرآن کریم پر نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ دین کے ایک اہم شعبہ یا نبوت کے ایک اہم رکن کو یہاں اس شکل میں بیان کیا گیا ہے کہ:

هو الذی بعث فی الامیین رسولا منهم یتلو علیهم آیاته ویزکیهم
ویعلمهم الکتاب والحکمة وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین۔ (۲)

قرآن کریم میں جس تزکیہ اور احادیث نبویہ میں جس احسان کا بیان ہے درحقیقت اس سے مراد یہ ہے کہ انسانی نفوس کو شیطانی وطاغوتی رزائل سے پاک صاف کرتے ہوئے اسے اعلی وبالا اخلاق سے مزین ،متصف اور آراستہ کیا جائے، اور قرآن کریم اور احادیث نبویہ کے مطالبے کے مطابق تزکیہ واحسان کی اصلی شکل اور شاندار نمونے ہمیں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی زندگی میں نظر آتے ہیں، جو ایسا تزکیہ اور ایسا احسان ہو کہ جس کے نتیجے میں صالح اور پاکیزہ زندگی وجود میں آئے، اور ساتھ ساتھ رزائل سے پاک وصاف ایک مثالی معاشرہ قائم ہو، صحابۂ کرام کی زندگی ایک ایسی زندگی اور ان کا معاشرہ ایک ایسا معاشرہ تھا کہ جس کی مثال پیش کرنے سے انسانی تاریخ بالکل عاجز ودرماندہ کا ہے،

(۱) ملاحظہ ہو: جرجی زیدان، تاریخ اللغۃ العربیۃ۔ اور امرتولال بالا، الاول کے کلام میں ہندو مسلم ثقافت، ص: ۳۶۹۔

(۲) سورۃ الجمعۃ: ۲۔

اور جس کے نتیجے میں ایک ایسی عادل اور منصف، حق پرست اور حق شناس حکومت قائم ہوئی تھی جس کی نظیر انسانیت کی تاریخ پیش نہیں کرسکتی۔

اسلامی دنیا میں بعثت نبوی علیہ السلام کے صدیوں بعد برآمد ہونے والی اصطلاح ''تصوف'' نے اسلام کی کتنی عظیم وکریم کتنی روشن وتاباں، کتنی ضروری اور اہم حقیقت پر پردہ ڈال دیا ہے، اسے اندازہ کرنے کے لئے دعاۃ ومرشدین کی تصانیت کا مطالعہ ضروری ہے۔ (۱)

چونکہ راقم سطور کا اس چھوٹا سا مقالہ اس مفصل بحث کا متحمل نہیں ہوسکتا، اس لئے وہ یہاں ایک ضروری اور اہم اقتباس مفکر اسلام کی کتاب ''تزکیہ واحسان یا تصوف وسلوک'' سے نقل کردیتا ہے، چنانچہ آپ لکھتے ہیں کہ:

> ''اس کے علاوہ دوسری چیز جس نے دینی حقیقت کو اور زیادہ غبار آلود کردیا، وہ پیشہ ور، جاہ طلب، حقیقت فروش، الحاد شعار اور فاسد العقیدہ نام نہاد صوفی ہیں، جنہوں نے دین میں تحریف کرنے، مسلمانوں کو گمراہ کرنے، معاشرہ میں انتشار پیدا کرنے، آزادی اور بے قیدی کی تبلیغ کرنے کے لئے تصوف کو آلۂ کار بنایا، اور اس کے محافظ اور علمبردار بن کر لوگوں کے سامنے آئے، نتیجہ یہ ہوا کہ اہل غیرت اور اہل حمیت مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد ان سے بدظن ہوگئی، کچھ غیر محقق صوفی ایسے تھے جو اس شعبہ کی روح اور اس کے حقیقی مقاصد سے ناآشنا تھے، وہ مقصد اور وسیلہ میں تمیز نہ کرسکے، بعض اوقات انہوں نے وسائل پر تو بہت اصرار کیا اور مقاصد کو نظر انداز کردیا، اور اس شعبہ یا اس فن میں ایسی چیزیں داخل کیں جس کا اس سے کوئی تعلق نہ تھا، اور اس کو فن کی روح اور فن کا کمال قرار دیا، بلکہ مقصود اور مطلوب سمجھ بیٹھے ،غرض کہ اس طرح انہوں نے مسئلہ کو اور پیچیدہ بنادیا، اور اس نزاع کو مختصر کرنے کے بجائے اور طول دیا، انہوں نے ان چیزوں کو جن کا مکلف ہر مسلمان ہے اور جو دین کی روح اور زندگی کی ضرورت ہیں، معمہ فلسفہ اور رہبانیت بنا کر پیش کیا، جن کی

(۱) ملاحظہ ہو: مفکر اسلام سید ابوالحسن علی ندویؒ کی تصنیف: تزکیہ واحسان یا تصوف وسلوک۔

ہمت صرف وہی شخص کرسکتا تھا، جوترک دنیا اور مادی اسباب سے کنارہ کشی کا فیصلہ کر چکا ہو، اور دنیا کی ساری نعمتوں سے دستبردار ہونا چاہتا ہو، ظاہر ہے کہ ایسے لوگ ہر جگہ اور ہر زمانہ میں بہت کم ہیں، اس سے بڑھ کر یہ کہ یہ نہ دین کا مطالبہ تھا نہ رسول کی سنت، نہ تخلیق انسانیت کی حکمت (۱)

ہمارے ممدوح شاعر الاول کی زندگی کے آخری ایام میں ہم دیکھتے ہیں کہ انہوں نے اپنے سابقہ نظریات میں کافی تبدیلی لائی ہے، کیوں کہ پداپتی اور سکندر نامہ (جو ان کی زندگی کی آخری کاوش ہے) کے تخیلات میں نمایاں فرق پایا جاتا ہے، پداپتی کے تخیلات میں جس طرح میں نے پچھلی سطور میں عرض کی کہ ہندوستانی صوفیوں اور ہندو جوگیوں کے تخیلات کارفرما ہیں، مگر سکندر نامہ کے تخیلات اس سے کافی مختلف ہیں، جس میں شاعر کے خیالات ایک ایسی دنیا میں پرواز کرتے ہیں جہاں رہبانیت کا کام سرے سے نہیں، شاید دونوں دواوین میں موضوع کی چاہتیں ومطالبات بھی کارفرما ہوں، لیکن سچ تو یہ ہے کہ شاعر الاول اپنی زندگی میں بہتوں مراحل سے گزرے ہیں، ایسے ایسے مراحل کہ جن سے متاثر ہوئے بغیر وہ آخر تک نہ رہ سکے ہوں۔

سرزمین ارکان کے اس سرے سے لے کر اس سرے تک ہمارے ممدوح شاعر کے بہتوں مرید تھے، جہاں تک معلوم ہوا کہ نہ صرف ارکان بلکہ بنگال میں بھی ان کے بہتوں خلفائے کرام دین ودعوت کے حوالے سے پہنچے ہوئے تھے، چنانچہ وہ اپنے ایک محبوب خلیفہ کے متعلق رقمطراز ہیں کہ:

"سید صلاح الدین بڑے اچھے سالک ہے، اس نے فقیر سے طریقۂ عالیہ قادریہ کی نسبت لی، اور دنیائے علم وعرفان میں چلنے کی تربیت حاصل کی، ایک طرف وہ مجلس خان (ارکان کا وزیر اعظم) کی نسبت سے دوسری طرف بذات خود نیک سیرت اور پاکیزہ اخلاق کے مالک ہونے کی وجہ سے وہ میرے بہت عزیز ہے، علاوہ ازیں وہ نہایت صاف دل اور پاکیزہ ضمیر کا حامل ہے، وہ میرے صاحب نظر خلیفہ ہے، اور ہر وقت میرے سامنے کاغذ اور قلم لئے بیٹھا رہتا ہے، وہ شعروشاعری کا دلدادہ اور اچھے شاعر بھی ہے"۔(۲)

---

(۱) مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، تزکیہ واحسان یا تصوف وسلوک، ص: ۱۷-۱۸۔

(۲) امرتو لال بالا، الاول کے کلام میں ہندو مسلم ثقافت، ص: ۳۶۵، بحوالہ الاول۔

نظریہ وحدۃ الوجود اور الاول

مغلوب الاحوال متقدمین صوفیاء کی زبان سے نکلے ہوئے اتحاد نما اقوال جو وحدۃ الوجود پر دلالت کرتے ہیں، ان میں عارف ربانی حضرت بایزید بسطامی کا قول سبحانی ما اعظم شانی اور لیس فی جبتی الا اللہ اور منصور حلاج کا نعرۂ انا الحق خاص طور پر مشہور ہے، لیکن اس متوحش اور معرکۃ الآراء بحث کے علمی طور پر مؤسس حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن العربی متوفی ۶۳۸ھ کو مانا جاتا ہے، جن کے زمانے میں یہ مسئلہ شہرت کی چوٹی تک پہنچا، یہاں تک کے اہل ذوق ونظر کا شعار بن گیا، اوراس سے انکار گویا اپنی جہالت کا ثبوت دینا یا بزم تصوف میں محروم اور طفیلی ہونے کا اعلان کرنا تھا۔

چونکہ یہ فلسفہ اور تصوف کا دقیق سے دقیق ترین مسئلہ ہے، جس کا کم سے کم احاطہ بھی اس عجالے میں ممکن نہیں، اسے باضابطہ طور پر سمجھنے کے لئے کم سے کم حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن العربی کی مشہور تصانیف "فصوص الحکم" اور "فتوحات مکیہ" اور شاہ اسماعیل شہید کے "عبقات" اور مجدد الف ثانی کے "مکتوبات" کا مطالعہ ضروری ہے، البتہ علامہ بحر العلوم متوفی ۱۲۲۵ھ جو شیخ اکبر کے نظریۂ وحدۃ الوجود کے شارح اور ترجمان ہیں، ان کی کتاب کے بعض اقتباسات سے شاید حضرت شیخ اکبر کے منشاء اور مراد سمجھنے میں مدد ملے گی:

"اللہ تعالی کے سوا جو کچھ ہے، وہ عالم شیونات وتعینات ہے، تمام شیونات و تعینات اس کے مظاہر ہیں، اور وہ ان میں جاری اور ساری ہے، اس کی سرایت وہ نہیں جس کے حلولی قائل ہیں، جس کا بیان اتحادی کرتے ہیں، بلکہ یہ سریان مثل اس سریان کے ہے، جو کہ گنتی کے اعداد میں ایک کی ہے، گنتی کے تمام اعداد بجز اکائیوں کے اور کچھ نہیں، عالم میں ایک ہی عین یعنی ایک ہی ذات کا ظہور ہے، کثرت میں وہی ظاہر ہے، اپنی ذات سے کثرت کا وجود نہیں ہے، اللہ کی پاک ذات کے وجود سے اس کا ظہور ہوا ہے، اللہ ہی کی ذات اس کی کثرت میں ظاہر ہے، اللہ ہی اول ہے، اللہ ہی آخر ہے، اللہ ہی ظاہر ہے، اللہ ہی باطن ہے، اللہ تعالی شریک بنانے سے پاک ہے"۔

"اللہ تعالی کے نام بغیر کسی مظہر کے ظاہر نہیں ہوتے، وہ مبارک نام چاہے تنزیہی ہو

چاہے تشبیہی، اب جب کہ اسماء مظاہر پر موقوف ہوئے اور بغیر مظاہر کے ان کا کمال متصور ہی نہیں ہوسکتا، تو اللہ تعالی نے اعیان عالم کو موجود کیا، تا کہ وہ اعیان اس کے مظاہر ہوں، اور اس کے اسماء کا کمال پوری طرح ظاہر ہو‘‘۔

اللہ تعالی اپنے ذاتی کمال میں قطعاً غنی ہے، لیکن اسمائے کمال جو مرتبہ میں عالم کے وجود خارجی سے غنی نہیں ہے، اس حوالے سے حافظ شیرازی کہتے ہیں کہ:

پرتو معشوق گر افتاد بر عاشق چہ شد

ما بدو محتاج بودیم او بہ ما مشتاق بود

یعنی اگر معشوق کا سایہ اور پرتو عاشق پر پڑ گیا تو کیا بات ہوئی، ہم اس کے محتاج تھے، اور وہ ہمارا مشتاق تھا، یہ بیان اس حدیث قدسی سے ثابت ہے: ’’**کنت کنزا مخفیا فاحببت ان اعرف فخلقت الخلق**‘‘ (یعنی) میں ایک مخفی خزانہ تھا، میں نے چاہا کہ میں پہچان لیا جاؤں، لہذا خلق کو میں نے پیدا کیا تا کہ میرا ظہور ہو اور مخلوقات مظہر ہوں میرا اور میرے اسماء کا‘‘۔

’’جو دو وجود کا قائل ہوا کہ ایک اللہ کا وجود ہے اور ایک ممکن کا، تو وہ شرک کر رہا ہے، اور اس کا یہ شرک خفی ہے، اور جو شخص صرف ایک وجود کا قائل ہوا، اور اس نے کہا کہ وجود صرف اللہ ہی کا ہے، اس کے سوا جو کچھ ہے وہ اس کے مظاہر ہیں، اور مظاہر کی کثرت اس کی وحدت کی منافی نہیں تو یہ شخص موحد ہے‘‘۔

’’تم حق کے عین نہیں ہو، کیوں کہ حق تعالی وجود مطلق ہے، اور تم مقید اور متعین ہو، اور متعین کسی بھی طرح عین مطلق نہیں ہوسکتا، تم اپنی حقیقت سے عین حق ہو، حق تعالی تم میں متعین ہوا ہے، تم اللہ کو عین موجودات میں تعین کی قید سے آزاد اور تعین کی قید سے مقید پا رہے ہو، یعنی اللہ تعالی کو متعین میں ظاہر دیکھ رہے ہو، **لاموجود الا اللہ**، اللہ کے سوا نہ کوئی موجود ہے اور نہ کوئی معبود ہے‘‘۔(۱)

(۱) ملاحظہ ہو: رسالہ وحدۃ الوجود، تالیف بحر العلوم علامہ عبد العلی انصاری لکھنوی، ترجمہ مولانا شاہ زید ابوالحسن فاروقی مجددی، شائع کردہ ندوۃ المصنفین دہلی، ص: ۲۹ اور ۵۶۔

حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ مترجم عبقات (حجۃ الاسلام حضرت شاہ اسماعیل شہید قدس سرہ) عبقۂ ۱۶/ کے تعارف میں لکھتے ہیں کہ:

’’مسئلۂ وحدۃ الوجود کے متعلق عام طور پر یہ مشہور ہوگیا ہے کہ اس عقیدے کے ماننے والے کہتے ہیں کہ خالق ہی مخلوق ہے اور مخلوق ہی خالق ہے، یعنی ذاتا دونوں ایک ہی ہیں، اس عبقہ میں اس غلط خیال کی تردید کی گئی ہے‘‘۔(۱)

الحاصل شیخ اکبر کے بعد صوفیاء اور فلاسفہ اور شعراء میں سے نوے فیصد اس مسئلہ کے قائل یا ہم نوا بن گئے تھے۔ شیخ سے اختلاف محدثین اور علماء وفقہاء میں بہتوں نے کیا ہے، جن میں علامہ ابن حجر، علامہ سخاوی، ابوحیان مفسر، عز الدین بن عبد السلام، حافظ ابو زراعہ، حافظ بلقینی، ملا علی قاری وغیرہ جیسے نامور مشائخ قابل ذکر ہیں، اور مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس عقیدۂ وحدۃ الوجود کی مخالفت کے سب سے بڑے علمبردار اور قرآن وسنت کی روشنی میں اسے تحلیل وتجزیہ کرنے والا شیخ الاسلام حافظ تقی الدین ابن تیمیہ (۶۶۸۔۷۲۸ھ) تھے، آپ شیخ اکبر کی وفات سے ۳۳/ سال بعد پیدا ہوئے، اور شیخ کے مدفن دمشق میں ہوش سنبھالا، چونکہ شیخ کی وفات کے بعد شام اور مصر میں علم معرفت کے خم خانے شیخ کے ذوق توحید سے مخمور تھے، تو شیخ الاسلام تقی الدین ابن تیمیہ نے اس مسلک پر گھات لگا کر حملہ کر دیا تھا۔ اور یاد رہے کہ شیخ اکبر کے غالی معتقدین میں مصر کے شیخ ابوالفتح نصر المنجبی تھے، علاوہ ان کے اس مسلک کے دیگر غالی حاملین میں شیخ اکبر کے براہ راست شاگرد ابن سبعین، صدر الدین قونوی، بلیانی اور تلمسانی خاص طور پر شہرۂ آفاق ہیں۔

آٹھویں صدی میں یہ مسئلہ ہندوستان آیا، اور آرین نسلوں کے مزاج اور یہاں کے مذاہب اور فلسفوں کی اطلاق پسندی سے مل کر اس مشرب نے اور بھی گہرا رنگ اختیار کر لیا، اور یہاں آکر فلسفہ کے مزاج نے مقامی مزاج سے ہم آہنگ اور ہم آغوش ہو کر ایک نیا جوش اور نیا مکتب خیال پیدا کر لیا، یہاں کے مشائخ میں شیخ عبد القدوس گنگوہی متوفی (۹۴۴ھ) شیخ عبد الرزاق جھنجھانوی متوفی (۹۴۹ھ) اور شیخ عبد العزیز دہلوی معروف بہ شکر بار متوفی (۹۷۵ھ) اور شیخ محمد بن فضل اللہ برہان پوری

(۱) ملاحظہ ہو: شاہ اسماعیل شہید، عبقات، مترجم، حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی، ص: ۲۰۷۔

متوفی (۱۰۲۹ھ) اور شیخ محب اللہ الہ آبادی متوفی (۱۰۵۸ھ) وغیرہ یہ سب اس مسلک اور اس مشرب کے علمبردار تھے۔

برصغیر ہندوستان کے صوفیائے کرام کے تذکروں کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ پورے کے پورے برصغیر کے صوفیائے کرام ایک طویل زمانے تک تقریبا اس مسلک کے حامل اور علمبردار رہے ہیں، یہاں تک کہ افغانستان سے لے کر ارکان تک کے پورے علاقے کے تمام صوفیائے کرام نے اس مشرب کو اپنا خزرجان بنا رکھا تھا، جن میں الاول کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے، اس مسلک نے اپنی پیدائش سے لے کر حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی کے زمانۂ دعوت وتجدید تک حکمرانی کرتی رہی تھی، اور حضرت مجدد کے بعد بھی اگرچہ اس مسلک پر ایک اور نظریہ پیش کیا گیا، لیکن وحدۃ الوجود کے مسلک کے حاملین آج تک کم بھی نہ کئے جاسکے، حضرت عارف ربانی مجدد الف ثانی نے خصوصیت اور اہتمام کے ساتھ اس مسلک کی تنقید اور تردید کی، اور اس کی متوازی ''وحدۃ الشہود'' کا ایک نظریہ پیش کیا، بعد ازاں وحدۃ الشہود کا ایک نظریہ یا مشرب عالم وجود میں آیا، اور ان کے زمانے میں اس مسلک کے حوالے سے مشائخ اور صوفیائے کرام میں تین قسم کے حضرات دیکھے گئے ہیں:

(۱) پہلی قسم کے حضرات وحدۃ الوجود کے مکمل اثبات اور یہ ایک بدیہی حقیقت ہونے کے قائل تھے۔

(۲) دوسری قسم کے حضرات اس نظریہ کے مکمل طور پر منکر تھے۔

(۳) تیسری قسم کے حضرات وحدۃ الوجود کے متوازی وحدت الشہود کے مشرب ونظریہ کے حامل تھے۔

مگر حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ نے ان سارے نظریات کے معالجے کرتے ہوئے ایک ایسا مسلک اختیار کیا جو دراصل ایک مجدد کے تجدیدی کارنامے کی روشن دلیل ہوسکتا ہے، وہ یہ کہ:

''وحدۃ الوجود سالک کے سیر وسلوک کی ایک منزل ہے، اس کو عیانا اور مشاہدۃ نظر آتا ہے، کہ وجود حقیقی کامل کے علاوہ کسی چیز کا وجود نہیں، جو کچھ ہے وہ ایک ہی وجود ہے، باقی سب اس کی تلوینیات اور تنوعات ہیں، یا شیخ اکبر اور اس مشرب وجودی کے عارفین کے بقول ''تنزلات'' ہیں۔ اگر توفیق الٰہی شامل حال اور شرع محمدی کا روشن چراغ سالک کا رہنما ہو تو وحدۃ الوجود کے بعد اور ایک منزل سامنے آتی ہے، وہ ہے منزل ''وحدۃ الشہود''۔ یہ بحر علم معرفت میں نئی دریافت اور اس کا اعلان ہے،

جو ایک طرف عقیدۂ جمہور مسلمین، کتاب وسنت اور شریعت حقہ کے مطابق ہے تو دوسری طرف مشائخ اسرار سربستہ کی تمام تحقیقات سے سرمو انحراف اور منہ موڑ لینے کے بجائے ایک چیز کا اضافہ ہے، جس سے نصوص شرعیہ اور اصول قطعیہ اور سیر انفس وآفاق کے آخری مکشوفات وتحقیقات میں مطابقت پیدا ہوجاتی ہے''۔

حضرت امام ربانی کے متعلق نامور مغربی مصنف پیٹر ہارڈی (PETER HARDY) نے بہر حال سچ لکھا ہے کہ:

''شیخ احمد سرہندی کی بڑی کامیابی یہ ہے کہ انہوں نے ہندی اسلام کو متصوفانہ انتہا پسندی سے خود تصوف کے ذریعے نجات دلائی، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ جس نظریہ کی انہوں نے تردید کی، اس کا مطلب ومفہوم اور قدر وقیمت کا ان کو ذاتی طور پر عمیق ادراک تھا''۔(۱)

بہر حال بعض اہل نظر کے مطابق وحدۃ الوجود کی افکار عقیدۂ اسلامیہ اصلیہ کے خلاف ایک متضاد عقیدہ ہے، ہر زمانہ اور ہر دور کے فقہاء اور اہل شرع متین اس عقیدہ کے منکر رہے ہیں، بعض لوگوں نے اسے اسلامی عقیدہ بنانے کی بڑی کوشش کی تھی، لیکن آخر کار ان کی یہ کوشش رائگاں ہوگئی۔ چنانچہ ڈاکٹر سید محمد علی النمر اسی عقیدہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

''بلاشبہ وحدۃ الوجود کی فکر یہ قدیم فلسفات کی فکر میں سے ایک ہے، جو اسلام کے عقائد وتشریحات کے موافق نہیں ہے، اور مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ قرآن وسنت کو التزام کرے، اس میں جتنی چیزیں ہیں ان کی اتباع کرے، اور ایسی افکار وفلسفات کو ترک کردے جو اسلامی عقائد کے خلاف ہیں۔ وحدۃ الوجود کا نظریہ مادہ پرستی کی طرف لے جاتا ہے، اور یہ نظریہ الوہیت سے انکار، عالم کو قدیم ماننے کا بہانہ اور آسمانی شریعت کو منہدم کرنے کی ایک کوشش ہے، جو دراصل خالق ومخلوق اور عبد ومعبود کے درمیان حد فاصل کرنے کی کوشش کی بنیاد پر قائم ہے، اس مذہب کا دعوی

SOURCES OF INDIAN TRADITION,N.Y. P.449.(1)

یہ ہے کہ بہر حال وجود ایک ہی ہے، یہاں کوئی خالق ومخلوق کوئی عبد ومعبود نہیں ہے، جہاں قدیم وجدید کا سوال رائگاں ہے، بلکہ پوری کائنات واحد ہے، ازل سے ابد تک''۔(۱)

الحاصل ہمارے ممدوح شیخ ارکان حضرت الاول رحمۃ اللہ علیہ نہ صرف اس مسلک کے قابل تھے بلکہ حامل اور داعی بھی تھے، اگر یہ مسلک اور یہ نظریہ کسی جرم عظیم کا نام ہے تو یہ جرم صرف الاول کا سر تھو پا نہیں جا سکتا، بلکہ شیخ اکبر اور ان کے بعد پیدا ہونے والے سارے حاملین نظریۂ وحدۃ الوجود اس کے مرتکب ہیں۔

(۱) ڈاکٹر محمد علی النمر ،سورۃ الاسراء والاہداف التی ترمی الیھا، دار البحوث الحدیثہ جدۃ، ص: ۱۳۳۔۱۳۴۔

الاول کے کلام میں اسلامی رجحانات

الاول ایک عظیم اسلامی صوفی شاعر ہیں ، آپ نے وقت کے بڑے بڑے اسلامی اور صوفی شاعروں کی طرح زندگی بسر کی ، اور اس پر فخر بھی محسوس کیا تھا، جس طرح میں پچھلی سطور میں بیان کر آیا ہوں کہ الاول صوفیت سے نہ صرف متاثر تھے بلکہ وہ بذاتِ خود صوفیانہ مشرب کے حامل انسان بھی تھے، اسی لئے ان کے کلام اور ان کی شاعری میں تصوف بشمول رقص وسرود اور سمع موسیقی کا رنگ بھرا ہوا ہے، اور وہ ہندو فارس کے بڑے بڑے صوفی شاعروں کی طرح نہ صرف رقص وسرود اور غنا وموسیقی کے دلدادہ تھے بلکہ وہ اس فن کے فنکار اور بڑی مہارت رکھنے استاد بھی تھے، تو وجہ یہی ہے کہ ان کی شاعری میں زمزمۂ چنگ اور آہنگ رباب بڑی حد تک ملتا ہے۔

الاول نے اپنے دواوین میں رب کبریاء کی تعریف وتوصیف اور حمد وثنا میں ذات وصفات باری کے متعلق جس بلند خیالی کا مظاہرہ کیا ہے اس سے ہمیں یقین ہو گیا ہے کہ وہ توحید اور الوہیت کے متعلق ایک راسخ العقیدہ اور پختہ علم رکھنے والے شاعر تھے، یہاں ذات باری اور صفات باری کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے کافی زور بیانی سے کام لیا ہے، جس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آپ قرآن کریم اور احادیث نبویہ کے بہت بڑے اور باکمال عالم تھے، انہوں نے اپنی کاوش پدا پتی، سکندر نامہ ، سیف الملوک بدیع الجمال، تحفہ النصائح، ہفت پیکر وغیر کی ابتدا میں حمد وثنا کے باب میں اپنے دل و ضمیر کی جو بھڑاس نکالی وہ ایک توحید باری سے سرشار شاعر سے ہی ممکن ہے۔

الاول نے اپنے تمام دواوین میں رسول انسانیت اور پیمبر خیر وبرکت سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح سرائی میں جس بلند خیالی، راشن ضمیری اور ذوق ادبیت سے کام لیا ہے وہ ایک مومن شاعر سے ہو سکتا ہے، جہاں ان کی ادبیت وشاعری میں جوش ایمانی بھرا اور الفت ومحبت کا بھبوکا پھوٹا ہے، انہوں نے اپنی آتش نوائی کے سہارے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم پاک میں عقیدت ومحبت کے وہ گلدستے پیش کئے ہیں، جن کے لئے صرف اور صرف وہی ذات ہی لائق اور مستحق ہیں، یہاں شاعر کو حدیث لولاک سے کافی متاثر بلکہ اسے دنیا کو منوانے پر مصر نظر آتا ہے، وہ رسول انسانیت کی مدح

سرائی کے دوران قرآن کریم اور احادیث نبویہ اور سیرت وسوانح کے ان دفعات سے مستفید ہوئے جنہیں ہم فارس کے ایک شاعر کے بقول: ''بعد از خدائے بزرگ توئی قصہ مختصر'' سمجھتے ہیں۔

بعد ازاں الاول حضرات خلفائے راشدین کو بھولنا ایک خطائے عظیم اور جرم لاتلافی سمجھتے ہوئے ان کی مدح سرائی پر اپنا دل کھول دیتے ہیں، پداپتی میں حمد ونعت کے بعد خلفائے راشدین کا جس اخلاص وفدائیت اور محبت والفت سے تذکرہ کیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ان کی زندگی، ان کی کارکردگی اور ان کے روشن کارناموں پر فدا تھے، الاول حضرت صدیق اکبر کی صداقت، حضرت عمر الفاروق کی عدالت، حضرت عثمان غنی کی سخاوت اور شیر خدا حضرت علی حیدر کی شجاعت کے تذکرے کے بعد لکھتے ہیں کہ:

''باوجودیکہ یہ چاروں حضرات جسمانی اعتبار سے الگ الگ ہیں لیکن دینی اور روحانی اعتبار سے ایک ہی ہیں''۔

الاول کو ان چاروں حضرات خلفائے راشدین کی ذات میں وحدت نظر آئی ہے، جن کی راہ ورسم، لے و دھن اور سوز وساز ایک اور چاروں کے چاروں ایک ہی منزل کے مسافر تھے(۱) غرض حمد وثناء اور نعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد انہوں نے اپنے تمام دواوین میں ان خلفائے راشدین کی توصیف کی ہے۔

یوں تو الاول کے تمام دواوین اس بات کی دلیل ہیں کہ ان کی شاعری دراصل اسلامی شاعری ہے، چنانچہ جبھی وہ کسی اسلامی مضامین کا ترجمہ کرتے ہیں تو اس کے مضامین میں بس اسلام کا رنگ بھرا ہوا ہوتا ہے، اور اسلامی شاعری کی تقریبا تمام صفات وکمالات سے ان کی شاعری متصف ہوجاتی ہے، جب کہ وہ دوسری ثقافت کی کہانی یا داستان سرائی کا ترجمہ کرتے ہیں تو اس میں مضمون کی کچھ رعنائیاں طبعی طور پر داخل ہوجاتی ہیں، اس بات کی روشن دلیل ان کی کاوش ''پداپتی'' ہے۔

یہاں ایک بات قابل ذکر ہے کہ چوں کہ الاول بنگلا زبان کا شاعر ہیں، اور بنگلا زبان من حیث المجموع سنسکرت کی مرہون منت ہے، تو ظاہر ہے کہ الاول کی شاعری میں سنسکرت کے الفاظ ومحاورات اور تعبیرات کے روپ میں سنسکرتی رسم ورواج اور ثقافت بھی نظر آتی ہے، جس میں الاول کے مقصد کا کوئی عمل دخل نہیں ہے، اگر خوبی ہو تو زبان کی، اگر بھدا پن ہے تو بھی زبان کی ہے۔

(۱) دیکھئے پداپتی، زیر اشراف سید محمد علی احسن، احمد پبلیکیشن ہاؤس، ڈھاکہ۔

لیکن الاول کے بعض کلام اور بعض شاعری میں بعض لوگوں کو الفاظ ومحاورات اور تعبیرات کے روپ میں جو سنسکرت اور ہندو ثقافت نظر آتی ہے، وہ ان کی نظر کی بات ہے۔

اب الاول کے کلام میں خالص ہند وثقافت دیکھنے والوں سے میری گزارش ہے کہ وہ ان کے دیوان ''پداپتی'' (جس میں وہ زیادہ سے زیادہ ہندو ثقافت دیکھ رہے ہیں) کو از سر نو مطالعہ کے دوران ان کے مخصوص نظریۂ وحدۃ الوجود کا از سر نو جائزہ لیں، میرا خیال ہے کہ ان کو اس میں بہت سارے خالص اسلامی مضامین کے علاوہ تصوف کے ان گہرے خیالات کارفرما نظر آئیں گے جنہیں اس وقت کے عام متصوفین حضرات نے اپنا اپنا مشرب بنا رکھا تھا، ساتھ ہی ساتھ وہ حضرات جو حضرت الاول کو ہندو رسم ورواج سے متاثر شاعر کہنے پر مصر ہیں، میں ان کے لئے الاول کے مخصوص دیوان ''تحفۃ النصائح'' کا مطالعہ ضروری سمجھتا ہوں، مگر مجھے یقین ہے کہ ان کو تحفۃ النصائح جیسی کتاب کبھی راس نہ آئے گی، کیونکہ یہ خالص اسلامی شاعری ہے، جس میں ہندو رسم ورواج کی گنجائش بالکل نہیں رہی ہے، کیوں کہ یہ تو اسلامی تعلیمات کا ایک انوکھا مجموعہ ہے، جس سے کسی قسم کی گنجائش نکالنے کی کوشش ایک رائگاں کوشش کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہوگی۔

الاول کے دیوان تحفۃ النصائح میں بھی ان کے دوسرے دیوان کی طرح حمد وثنا اور مدح رسول واصحاب باصفا کے بعد توحید باری، ایمان ویقین آخرت کا حساب اور قبر کا عذاب، علم وہنر کی فضیلت، وضوء وتیمم کی ضرورت کے علاوہ نماز، روزہ، حج، زکوۃ، تلاوت قرآن پاک، توکل، کسب حلال وکسب حرام، ازدواجی زندگی، شادی بیاہ، کھانے پینے اور سونے کے اسلامی آداب، تجارت، درویشی، والدین وخویش واقارب اور انسانیت کے ساتھ حسن سلوک، قرضۂ حسنہ کی ترغیب، بغض وحسد، عداوت وکینہ، ریاء وتکبر سے نفرت، توبہ وتوکل، عدالت و سخاوت اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی ضرورت اور جہاد وقتال کی فضیلت کے علاوہ سنن ومستحبات سے لے کر شکار اور ذبح تک کے احکام کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں، ان تمام چیزوں کے تہ بتہ الاول نے تصوف کو اپنی شاعری کے درون خانے میں رکھا، چنانچہ تصوف کے حوالے سے الگ الگ مضامین بھی لکھے ہیں۔(۱)

(۱) بایں ہمہ راقم سطور کو تصوف کے حوالے سے الاول کے کچھ خیالات سے کافی اختلاف ہے، جن کی کچھ جھلکیاں پچھلی سطور میں نظر آئیں گی۔

تاریخ ارکان کے درخشاں ستارے

(جلد اول)

تیسرا حصہ

پہلا باب

سرزمین ارکان کے بعض بڑے شعراء

مدخل

الاول اور قاضی دولت کے علاوہ بھی سرزمین ارکان میں بڑے بڑے مسلم شعراء کے اسمائے گرامی اوران کی خدمات کے تذکرے پائے جاتے ہیں، اس لئے اسی کاوش میں ان کے تذکرے کوضروری سمجھ کردرج کر دیا جاتا ہے۔ یادرہے کہ تاریخ کی ورق گردانی سے پتہ چلا کہ چاٹگام ارکان کا ایک تاریخی حصہ تھا، جس سے انکار تاریخ اورحقیقت تاریخ ارکان سے اپنی جہالت کے ثبوت دینے کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہے، اسی لئے ہم نے اپنے اس دراستہ اور تحقیق میں بعض چاٹگامی شعراء کے نام اورصرف نام یہاں درج کر دیئے ہیں، تاکہ قائین کرام کم سے کم ان کے اسماءگرامی سے واقف ہوسکیں، اور چاہیں تو ان کے حالات اوران کے کارناموں سے واقف ہونے کی کوشش کریں۔

شاعرِ ارکان حضرت سید محمد سلطان

پندرھویں صدی عیسوی کے نامور ارکانی شاعر سید محمد سلطان ممبرا کے قصبہ قیم میں پیدا ہوئے، آپ کے خاندان کا تعلق سادات قیم سے تھا، اس لئے آپ نے اپنے نام کے شروع میں سید کا لفظ چسپاں کیا تھا، آپ کے خاندان میں بہت بڑے بڑے جلیل القدر علماء، صلحاء اور مشائخ گزرے ہیں، جنھوں نے سرزمین ارکان میں دعوت دین متین اور اشاعت اسلام کی خاطر قربانیاں دی تھیں۔

سید سلطان کی جائے پیدائش، رہائش اور وفات کے متعلق بعض حضرات نے طرح طرح کے خیالات ظاہر کئے ہیں، ان میں سے کسی نے لکھا ہے کہ ان کی پیدائش سلہٹ میں ہوئی، اس حوالے سے ڈاکٹر انعام الحق صاحب کا خیال ہے کہ آپ چاٹگام کے رہنے والے تھے، مگر یہ سب خیالات ہیں، سچی بات تو یہی ہے کہ آپ ممبرا (ارکان) کے قدیم اور مردم خیز قصبہ قیم کے رہنے والے تھے، یہاں آپ پیدا ہوئے، یہاں آپ نے بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے، اور آخر کار یہاں ہی کی زمین کو آپ نے اپنے سے لگالیا۔

سید سلطان کے متعلق مجھ سے ایک روز نامور محقق مورخ پروفیسر محمد حبیب اللہ صاحب (مرحوم) نے یوں کہا ہے کہ:

> ''میری تحقیق یہی ہے کہ سرزمین ارکان کے معروف شاعر سید سلطان ممبرا کے قریبی علاقہ قیم میں پیدا ہوئے، ان کی تعلیم وتربیت اور نشوونما بھی وہیں ہوا، وہ ایک ذی استعداد مورخ، سیرت نگار اور بلند پایہ کے شاعر تھے، علم وفن سے ہمیشہ لگاؤ رکھتے تھے، انہوں نے اپنی زندگی میں کئی دواوین لکھ چھوڑے ہیں، جن میں سے ''نبی بنش'' (آل نبی) اور شب معراج نامی دو دواوین ملتے ہیں، چنانچہ یہ دونوں دواوین ان کی مورخانہ شان اور شاعرانہ استعداد کے آئینہ دار ہیں''۔

سید صاحب کی تعلیم وتربیت خاندان کے بزرگوں، علماء اور مشائخ کے ہاتھ میں ہوئی، کچھ بڑے ہوئے تو آپ نے تاریخ اسلام سے دلچسپی لی، ویسے آپ ایک بالغ نظر مورخ ہونے کے ساتھ صاحب

بصیرت سیاست دان بھی تھے، علمی حلقوں کے علاوہ سیاسی حلقوں میں بھی آپ کی خاصی شہرت تھی، لوگ آپ کو بالغ نظر سیاست دان سمجھتے تھے، آپ کی ان دونوں میدانوں کے علاوہ قرآن و حدیث، فقہ واصول اور عقائد وکلام پر بھی خاص نظر تھی، چونکہ آپ کا تعلق سادات سے تھا، چنانچہ آپ نے ''نبی بنش'' (آل نبی) کے نام سے ایک گرانقدر تالیف منظوم کی، جس میں آپ نے اپنی تاریخ دانی اور سیرت نویسی کا ثبوت بڑی خوبی سے پیش کردیا۔

مذکورہ منظوم تصنیف کے علاوہ آپ کا اور ایک دیوان بھی ''شب معراج'' کے نام سے پایا جاتا ہے، جس میں شب معراج کے حوالے سے کچھ نایاب باتیں ملتی ہیں، چونکہ یہ دونوں منظوم تصانیف ہیں، جن میں قدرے عبارت آرائی کے ساتھ شاعر کی انفرادیت بھی پائی جاتی ہے، تاہم یہ دونوں تصانیف آپ ایک قادر الکلام شاعر ہونے کا بین ثبوت ہیں، بہرحال آپ نے اپنی زندگی میں علم و ثقافت، رشد وہدایت اور میدان سیاست میں گرانمایہ خدمات انجام دی ہیں، اور پندرھویں صدی میں وفات پاکر قصبۂ قیم میں مدفون ہیں۔

سید سلطان کے کارناموں کے حوالے سے ایک بات بہت اہم ہے کہ بنگال کی وشنو تحریک (جو دراصل ایک ہندو تحریک تھی) کے اثرات ارکان پر بھی پڑے تھے، اس زمانے میں اس تحریک کے خلاف بنگال کے بڑے بڑے مسلمان علماء اور دانشوروں نے بڑی خوبی سے کام کیا تھا، یاد رہے کہ وشنو تحریک کی وجہ سے اس زمانے میں رامائن اور مہا بھارت کے ترجمے مسلمانوں میں بھی عام ہونے لگے تھے، چنانچہ بنگال میں اس تحریک کے خلاف جس طرح چند اہل قلم مسلمان اٹھے تھے، ٹھیک اسی طرح ارکان میں بھی چند اہل کمال اس تحریک کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے، جن میں سید سلطان پیش پیش تھے، جنھوں نے اسلامی موضوعات پر بنگلا زبان میں نظمیں اور کتابیں لکھ کر ارکانی مسلمانوں کے لئے فکری، دماغی، علمی اور روحانی غذا مہیا کی، اور ظاہر ہے کہ سید سلطان اپنے دور کے ایک عظیم اور کامل بزرگ تھے، جنھوں نے خالص اسلامی موضوعات پر بنگلا زبان میں کتابیں لکھ کر ارکانی مسلمانوں پر بھاری احسان کیا ہے، اس بارے میں سید صاحب کا موقف یہی تھا کہ:

> ''اس علاقے کے عام مسلمان عربی اور فارسی سے واقف نہیں ہیں، اور ان کی زبان

بنگلا ہے، اس لئے ضروری ہے کہ یہاں کے مسلمانوں کے لئے فارسی اور عربی کے بجائے بنگلا زبان میں دینیات کی کتابیں لکھی جائیں، ورنہ مسلمانوں کی توجہ رامائن اور مہابھارت کے ان تراجم جو وشنو تحریک کی وجہ سے عام ہو گئے ہیں مبذول ہو جائے گی، اور یہاں کے مسلمان دینیات کے حوالے سے یہ کتابیں پڑھنے لگیں گے ، چنانچہ اس صورت حالات کی اصلاح کے لئے بنگلا زبان میں دینیات میں تصانیف لکھنی بہت اہم اور ضروری ہے‘‘۔

چنانچہ سید سلطان نے جب دینیات کے موضوع پر بنگلا زبان میں کتابیں لکھیں تو بعض حضرات نے آپ کو منافق کہنا شروع کر دیا تھا، کیوں کہ ان حضرات کا موقف یہ تھا کہ اسلامی کتابیں صرف عربی اور فارسی زبان میں ہونی چاہئے، ان زبانوں کے بجائے کسی تیسری زبان میں دینیات کی کتابیں لکھنا نفاق کی علامت ہے، اس لئے سید صاحب نے جبھی اسلامی موضوعات پر بنگلا زبان میں کتابیں لکھیں تو ان حضرات نے آپ کو منافق کہنا شروع کر دیا تھا، لیکن سید صاحب اپنے موقف پر کوہِ گراں کی مانند اٹل تھے، اس حوالے سے آپ نے ایک جگہ میں بڑے درد بھرے لہجے میں لکھا ہے کہ:

’’ان حالات کی اصلاح کے لئے میں نے اسلامی موضوعات پر بنگلا زبان میں کتابیں لکھیں، لیکن یہاں کے بعض علماء اسے پسند نہیں کرتے اور مجھے منافق کہتے پھرتے ہیں، لیکن میں جانتا ہوں کہ میرا فرض کیا ہے‘‘۔

سید صاحب نے ایک کتاب ’’وفات رسول‘‘ کے نام سے لکھی، چنانچہ اُس کتاب کی ابتدائی سطور میں اس صورت حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ:

سب بنگالی مسلمان عربی نہیں جانتے۔
کوئی بھی اپنے دین کی باتیں نہیں سمجھتا۔
ہر کوئی رامائن اور مہابھارت کی کہانیوں سے دل بہلانا چاہتا ہے۔
میں گنہگار راندۂ دربار خدا ان مسلمانوں کے درمیان ہوں۔
مجھے معلوم نہیں کہ روز جزاء مجھ سے رب کیا پوچھے گا۔

اگر اس نے پوچھا کہ تم نے ان لوگوں کے درمیان رہ کر انہیں دین کی باتیں کیوں نہیں بتائیں۔
اور مجھے اس قصور پر ملزم ٹھہرایا گیا تو میں کیا جواب دوں گا؟
یہ سوچ کر میں نے خاندان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ پر مشتمل ’’نبی بنش‘‘ نامی کتاب لکھی۔
اس ناکردہ جرم کی پاداش میں لوگ کہتے ہیں کہ میں نے دین کی کتاب کو ناپاک کر دیا ہے۔
اگر پڑھے لکھے لوگ عربی میں کتابیں پڑھ کر انہیں بنگلا میں ترجمہ نہ کریں گے۔
تو لوگوں کو یہ چیزیں کس طرح سمجھ آئیں گی؟
یاد رہے کہ خدا نے جس انسان کو جس زبان میں پیدا کیا ہے وہی اس کے لئے بڑا خزانہ ہے۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ سید سلطان کی تصانیف اگرچہ بنگلا زبان میں ہیں، لیکن ان میں خالص سنسکرت کے الفاظ نہیں پائے جاتے ہیں، تاہم ان میں ہندوستانی اور بنگلا کے مشترک الفاظ پائے جاتے ہیں، آگے چل کر آپ نے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت بیان کرتے ہوئے یہی لکھا ہے کہ:

’’اگر ناخواندہ لوگوں کو دین کی تعلیم نہ دی جائے گی تو ممکن ہے کہ وہ بچارے دوزخ میں جائیں گے، اور عام لوگ اپنی لاعلمی سے گناہ کریں گے تو اللہ تعالی اہل علم کو اس کا ذمہ دار ٹھہرائے گا، چونکہ میں بھی ان میں سے ہوں، اس لئے میں اہل علم سے دو ٹوک الفاظ میں کہتا ہوں کہ روز قیامت خدا پوچھے گا کہ تم تو اہل علم تھے، تو تم نے لوگوں کو گناہوں سے کیوں نہ بچایا، یوں اہل علم روز قیامت خدا کے سامنے مجرم ٹھہریں گے، جب باری تعالی لوگوں کے نیک و بد کا حساب کرے گا تو ناخواندہ لوگ کہیں گئے کہ ہمیں اپنی زندگی میں ایک اہل علم ملا تھا، لیکن اس نے ہمیں سکھایا کچھ نہیں، تو خدا اہل علم کو اور بھی بڑا ملزم قرار دے گا، چنانچہ اس ڈر سے اور مزید براں نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت کا خیال کر کے میں اہل علم کو بتاتا ہوں کہ تم گناہوں میں مزید مت الجھو!۔ رہا اللہ تعالی نے مجھے کتاب شریعت کے علوم سے نوازا ہے، تاکہ میں لوگوں کو دین کی باتیں بتاؤں، اس لئے میں نے یہ کتاب تصنیف کی ہے، مگر یہاں کے علماء مجھے منافق کہتے پھر رہے ہیں، کہ ان کے خیال

> میں میں نے ہندوستانی زبان میں کتابیں لکھ کر دین کو ناپاک کردیا ہے،لیکن ارشاد باری ہے کہ: میں نے نبی بھیجا ہے،لوگوں کو اس زبان میں تعلیم دینے کے لئے،جس میں انہیں پیدا کیا گیا ہے''۔

سید سلطان ایک زندہ دل اہل علم،شاعر اور مصنف تھے،مگر ان کی تصانیف میں مقامی اثرات بھی بہت سے ملتے ہیں،علاوہ ازیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بعض قصے ایسے ہیں جو کرشن اور وشنو کے متعلق ہیں،صرف یہ نہیں بلکہ آپ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اوتار تک کہہ ڈالا ہے،غرض آپ نے اپنے آپ کو جو مقامی اثرات سے کلیتا پاک نہ کرسکا،اس حوالے سے یہ بھی ممکن ہے کہ آپ نے لوگوں کی عام زبان میں بحیثیت ایک مصلح باتیں کرنے کی کوشش کی ہو،جن کے آپ عادی ہو چکے تھے۔

سید سلطان کی تصانیف دو قسم کی ہیں:

(۱) جن میں انہوں نے قصص الانبیا اور سیرت رسول اکرم کی روایات کو بنگلا زبان میں منتقل کیا ہے۔

(۲) جن میں اسلامی فلسفہ اور تصوف وشریعت کے مسائل کو بنگلا زبان میں لکھا گیا ہے۔

چنانچہ آپ کی موخر الذکر قسم کی کتابوں میں ''گیان پردیب'' (نورعرفان) بھی ہے،جس میں آپ نے صوفیانہ خیالات کو تنتر یوگ کی زبان میں بیان کیا ہے،آپ کی وفات کے بعد آپ کے جانشینوں نے ان کوششوں کی بڑی وسعت دی،اور حج،روزہ،نماز،زکوۃ وغیرہ کے ساتھ دیگر شرعی احکامات پر کثرت سے کتابیں لکھیں،چنانچہ ان تصانیف میں ارکانی شاعر نصر اللہ خان کا ''شریعت نامہ'' خاصی شہرت کا حامل ہے،بعدازاں ارکان کے عظیم شاعر الاول نے ان مضامین کی توضیح کے لئے''تحفۃ النصائح''لکھا ہے،پھر اسلامی خیالات ورجحانات کو بنگالی زبان میں منتقل کرنے والے ارکان کے وہ شعراء خاص طور پر قابل ذکر ہیں،جنہوں نے عربی اور فارسی زبانوں کے قصص اور کہانیوں کو بنگلا زبان میں منتقل کردیا تھا،جن میں داستان امیر حمزہ،سکندر نامہ،ہفت پیکر وغیرہ خاص شہرت کی حامل تصانیف ہیں۔

سید سلطان ایک مرشدِ کامل بھی تھے،پیر کامل ہونے کی وجہ سے ارکان بھر میں آپ کے مریدان بھی بے شمار تھے،لیکن آپ کی طرف منسوب کسی خلیفہ کا آج تک پتہ نہیں چل سکا۔شب معراج،نبی بنش، وفاتِ رسول،گیان پردیب کے علاوہ آپ کی اور ایک تصنیف بنام''ابلیس نامہ'' بھی ہے،آپ کی تمنا

تھی''وفات رسول'' والی تصنیف میں خلفائے راشدین سمیت واقعۂ کربلا کی تفاصیل درج کردی جائیں،لیکن آپ کی زندگی میں یہ تمنا پوری نہ ہوسکی،اس لئے آپ نے اپنے مرید خاص شاعر محمد خان کو اس آرزو کی تکمیل کرنے کے لئے کہا تھا،چنانچہ محمد خان نے اس کی تکمیل کرتے ہوئے''صحابہ رکھا''(اصحاب رسول نامہ)اور''مقبول حسین''اور''قیامت نامہ'' جیسی کتابیں لکھیں،ان میں مقتول حسین کو بڑی شہرت حاصل ہے،اور کتاب ادبی اعتبار سے بھی بلند ہے۔اس بارے میں پوچھنے پر ایک روز استاد محترم پروفیسر ڈاکٹر معین الدین احمد خان نے اپنی تحقیق کی روشنی میں فرمایا کہ:

> ''سید سلطان نے نبی بنش،شب معراج،وفات رسول،گیان پردیپ کے علاوہ ''ابلیس نامہ'' کے نام سے ایک کتاب لکھی،آپ کا ارادہ تھا کہ''وفات رسول'' والی تصنیف میں خلفائے راشدین سمیت واقعۂ کربلا کی تفاصیل شامل کردی جائیں، لیکن آپ کی زندگی کی یہ تمنا پوری نہ ہوسکی،اس لئے وفات سے قبل آپ نے اپنے مرید خاص (شاید کہ خلیفہ وجانشین بھی ہوں) ارکانی شاعر محمد خان کو اس کی تکمیل کے وصیت کی تھی،چنانچہ محمد خان نے اس تمنا کو پوری کرنے کے لئے''صحابہ رکھا'' (اصحاب رسول نامہ)''مقتول حسین''اور'' قیامت نامہ'' جیسی کتابیں لکھیں،محمد خان کی ان تصانیف میں''مقتول حسین'' سب سے مقبول ہے،اور میرے خیال میں ادبی نقطۂ نظر سے بھی یہ تصنیف ایک گرانمایہ تصنیف ہے''۔

حضرت سید سلطان کی تصانیف سے اس بات کا بخوبی پتہ چلا کہ آپ بڑے نرم مزاج اور معذرت خواہانہ افتادِ طبع کے ایک مرشد کامل تھے،مذہبی امور کے حوالے سے آپ نے جو تصانیف اپنی زندگی میں لکھ چھوڑیں،ان میں آپ کا طرز تحریر معذرت خواہانہ ہے،علاوہ ازیں یہ بھی پتہ چلا کہ آپ بحیثیت شیخ کے لوگوں سے بیعت بھی لیا کرتے تھے،آپ کے بے شمار مرید تو تھے ہی،لیکن آپ کی طرف منسوب کسی خلیفہ کا پتہ نہ چل سکا۔

ارکان کے نامور شاعر دولت قاضی مرحوم

قاضی دولت کے حوالے سے ان کی زندہ کاوش ''شتی مینا'' کے تذکرے کے دوران پچھلی سطور میں کچھ معروضات پیش کی جا چکی ہیں، لیکن یہاں زیر نظر حصے میں ان گزارشات کے تہ بتہ بقیہ کچھ مزید گزارشات پیش کرنے کی ضرورت محسوس ہورہی ہیں، تو گزارش ہے کہ:

حضرت دولت قاضی صاحب اس زمانے میں ارکان کا ایک عظیم حصہ چاٹگام میں پیدا ہوئے، ان کی ابتدائی تعلیم اور نشوونما وہیں ہوا، لیکن یہ ان کی یا ہمارے معاشرہ کی ایک بدنصیبی تھی کہ ان جیسے ایک خداداد صلاحیت و استعداد کے مالک انسان کو اپنے پیدائشی وطن میں کسی قسم کی پذیرائی نہیں ملی تھی، جس کی وجہ سے انہوں نے اپنی قسمت آزمائی کے لئے اس وقت کے ارکانی دارالحکومت مروہانگ (پتھری قلعہ) کا رخ کیا تھا۔

ارکانی شاعر قاضی دولت کے حالات عبدالکریم ساھتیہ بیشارد اور ڈاکٹر محمد انعام الحق نے انکشافات کرنے کی حد درجہ کوشش کی، ان دونوں مصنفیں کے مطابق دولت قاضی چاٹگام کے مشہور علاقہ روزان میں پیدا ہوئے، لیکن ان کے برعکس بعض مصنفین کا یہ بھی خیال بلکہ دعوی ہے کہ ان کی پیدائش چاٹگام کے جنوبی علاقہ بھانس خالی میں ہوئی، بہر حال ساھتیہ بیشارد اور ڈاکٹر انعام الحق کے مطابق وہ بہت کم عمر میں شاعر بنے، اپنے پیدائشی علاقے میں ان کی قدردانی نہیں ہوئی تو ارکان کے دارالسلطنت مروہانگ چلے گئے تھے۔

قاضی دولت ارکان کے دارالحکومت مروہانگ پہنچے تو لشکر وزیر اشرف خان صاحب (جو اس زمانے میں وزیر تھے) کے دربار میں ان کی بڑی دھوم دھام سے پذیرائی ہوئی، انہوں نے اپنی فطری قابلیت اور خداداد صلاحیت کو دارالسلطنت مروہانگ میں جا ابھارا، ان کی صلاحیت اور استعداد کو دیکھ کر لشکر وزیر اشرف خان صاحب نے'' شتی مینا لور چند رانی '' لکھنے کی فرمائش کی (۱) یاد رہے کہ شاعر جس

(۱) ڈاکٹر عبدالکریم، عبدالکریم ساھتیہ بیشارد، حیات و کارنامے، ص: ۲۴۲۔

وقت ارکان کے دارالسلطنت تشریف لے جا رہے تھے اس وقت چاٹگام کا پورا علاقہ ارکان کا حصہ تھا (۱) اور یہ بھی یاد رہے کہ شاعر دولت قاضی ارکان سے باہر کہیں بھی تشریف نہیں لے گئے تھے، انہوں نے ارکان کی سرزمین سے محبت کی اور آخر کار اسے اپنے سینے سے لگالیا۔

شاعر مرحوم دولت قاضی اپنے زمانے میں ارکان کے قاضی القضاۃ بھی رہ چکے تھے، اور یاد رہے کہ برطانوی دور حکومت کے اواخر تک یہاں جو قاضی یا قاضی القضاۃ ہوتے تھے ان کے خاندان کے لوگ اس قاضی کی طرف منسوب ہونے کو پسند کرتے تھے، اور اپنے ناموں کے ساتھ'' قاضی'' کا لفظ ملحق کر لیتے تھے، لیکن ظاہر ہے کہ قاضی دولت کسی پچھلے قاضی کی طرف منسوب قاضی نہیں تھے، بلکہ آپ بذات خود ارکان کے قاضی القضاۃ تھے۔

مصنفین و مورخین نے دولت قاضی صاحب کے متعلق بہت کچھ لکھا، اور ان کے دواوین کو کھوج نکالنے کی بھی بڑی کوشش کی، مرحوم عبدالکریم ساھتیہ بیشارد نے قاضی دولت کی طرف منسوب کوئی پچیس دواوین کے نسخے دریافت کئے، لیکن کریم صاحب کے مطابق ان کے اکثر دواوین نامکمل ہیں، شاعر نے اپنی زندگی میں ان دواوین کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کی، لیکن آخر کار مکمل نہیں کر سکا، جیسا کہ معلوم ہے کہ خود ان کی گرانمایہ کتاب ''شتی مینا لور چندرانی'' بھی نامکمل رہ گئی تھی، ان کی زندگی نے وفا نہ کی تو اس کا تکملہ ارکان کے قومی شاعر الاول کو لکھنا پڑا تھا، جو آج کسی قدر مشکل سے مل جاتا ہے۔

یہاں ایک بات قابل ذکر ہے کہ قاضی دولت نے اپنے دواوین میں صرف اپنے نام کے علاوہ اپنی زندگی کا اجمال یا تفصیل کچھ بھی نہیں لکھا، تاہم ان کی تحریر کی بعض جگہوں میں صرف اپنے دور کے دو ارکانی بادشاہ اور وزیر اشرف خان کے تذکرے ملتے ہیں، شاعر نے اپنی مشہور کتاب شتی مینا لور چند رانی میں ان بادشاہوں اور مذکورہ وزیر کی کافی مدح سرئی کی ہے، جو قابل دید ہے۔

چلتے چلتے یہاں لشکر وزیر اشرف خان صاحب کے متعلق اتنی سی گزارش ہے (مزید کچھ گزارشات اگلی سطور میں آئیں گی) کہ وہ شمالی چاٹگام کے مشہور قصبہ ہاٹہزاری کے ساریہ گاؤں میں پیدا ہوئے، اس گاؤں میں اب بھی آپ کے پختہ مکان کے کھنڈرات موجود ہیں، اور یہاں آپ کے نام پر ایک تالاب

(1) ISLAMIC HERITAGE IN BANGLADESH, BY DR. NAJUMUDDIN AHMED,P.39.

بھی ہے، علاوہ ازیں چاٹگام کے بعض گاؤں میں آپ کے نام کے کچھ نشانات بھی پائے ہیں، اس طرح روزان کے مشہور گاؤں قدل پور میں آپ کے نام کا ایک بڑا تالاب ہے، جسے لوگ لشکر وزیر کا تالاب کہتے ہیں۔

لشکر وزیر اشرف خان صاحب بڑے صاحب علم اور صاحب کردار انسان تھے، عربی، فارسی، گجراتی ، ہندی، پالی اور سنسکرت زبانوں میں بڑی مہارت رکھتے تھے، اور ان ساری زبانوں میں ہونے والے شعروشاعری سے نہ صرف محظوظ ہوتے بلکہ اس پر تنقید وتبصرہ بھی کیا کرتے تھے۔

مرحوم اشرف خان سرزمین ارکان کے ایک عظیم اور نامور بزرگ انسان تھے، جیسا کہ پچھلی سطور میں عرض کی گئی ہے کہ آپ ارکانی بادشاہ سری سودھمہ (۱۶۲۲ء۔۱۶۳۸ء) کے دور حکومت میں سلطنت ارکان کے سالار جنگ یا سپہ سالار رہ چکے تھے، تاریخ میں آپ کے تذکرے اور آپ کی خدمات کا منہ بولتا ثبوت ملتا ہے، قاضی دولت کی کتاب ستی مینا لور چندرانی میں آپ کے بلند اخلاق وصفات اور اچھے اچھے کارناموں کی تفصیلات موجود ہیں، آپ بڑے انسان دوست بزرگ تھے، بڑوں کی تعظیم ، چھوٹوں سے پیار، علماء وصلحاء سے محبت اور لگاؤ گویا آپ کی طبیعت ثانیہ تھا، آپ نے سلطنت ارکان کے اس سرے سے لے کر اس سرے تک مدرسے، مساجد، خانقاہیں، تالاب اور مسافر خانے بنوا بنوا کر ملک کے لوگوں کے دل موہ لئے تھے، آپ ۱۶۲۲ء سے لے ۱۶۴۸ء تک اس منصب جلیلہ پر فائز رہ چکے تھے، قاضی دولت آپ کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

"لشکر وزیر اشرف خان حنفی مذہب اور چشتی مشرب کا ایک عظیم انسان ہیں، آپ علماء اور صلحاء کو بڑی محبت کرتے ہیں، بڑے دلدار اور سخی انسان ہیں، لوگوں کے ساتھ کسی بھی قسم کے مظالم سے کوسوں دور رہتے ہیں، خانقاہیں، مساجد، مدرسے اور تالاب وغیرہ بنوا بنوا کر لوگوں کے دل موہ لیتے ہیں، خاصی شیریں زبان آدمی ہیں، چھوٹوں سے پیار، بڑوں کی تعظیم وتکریم، علماء اور صلحاء سے لگاؤ اور ان کی قدر دانی جیسی صفات آپ کے دل میں چھپی ہوئی ہیں"(۱)

(۱) عبدالحق چودھری، بحوالۂ دولت قاضی۔

لشکر وزیر اشرف خان کے متعلق ڈاکٹر احمد شریف لکھتے ہیں کہ:

"لشکر وزیر اشرف خان صاحب چاٹگامی نژاد ایک زندہ دل مسلمان تھے، بمقام ساریہ (ہاٹھزاری، چاٹگام) میں آپ اور آپ کے خاندان کی پختہ عمارتوں کے کھنڈرات ابھی تک پائے جاتے ہیں، اس گاؤں میں آپ کا بنوایا ہوا ایک بڑا اور پرانہ تالاب موجود ہے، علاوہ ازیں موضع قدل پور (ہاٹھزاری) میں بھی ان کا بنوایا ہوا ایک پرانہ تالاب ہے، جو ان کی طرف منسوب ہے"۔(۱)

ارکانی مورخ جناب مرحوم وکیل خلیل الرحمن صاحب ستی مینا صفحہ ۲ تا ۵ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

" اشرف خان راجہ سند سودھمہ (۱۶۵۲ء) کے عہد حکومت میں سپہ سالار تھے، جس کو راجا نے تلوار، ہاتھی، گھوڑے وغیرے عطا کئے تھے، اس نے ایک مسجد (خلیل صاحب کے مطابق) بنوائی تھی، جس کا خطیب سید قاضی عالم شاہ تھے، جن کے فیض روحانی سے عربی، رومی، مغل اور پٹھان قومیں ارکان میں مستفیض ہوئیں"(۲)

دراصل ستی مینا لور چندرانی یہ ایک ترجمہ ہے، جب کہ اصل کتاب گوہری اور ٹیٹھ زبان میں لکھی گئی ہے، لشکر وزیر اشرف خان نے اسے بنگلا میں منتقل کرنے کی عرض قاضی دولت سے کی تو قاضی صاحب نے اسے لکھنا شروع کیا تھا۔

اس حوالے سے یہاں ایک بات عرض ہے کہ دراصل لشکر وزیر اشرف خان نے قاضی صاحب کو دیسی زبان میں منتقل کرنے کی عرض کی تھی، اب سوال آتا ہے کہ اس وقت ارکان کی دیسی زبان کون سی تھی، بنگلہ یا اور کوئی زبان؟؟ جواب یہ ہے کہ اس وقت چاٹگام بھی ارکان کا ایک عظیم حصہ تھا، تو ظاہر ہے کہ چاٹگامی اور حالیہ ارکانی مسلمانوں کی زبان ایک ہی ہے، ملک میں مسلمانوں کی اکثریت تھی، تو شاعر نے ان مسلمانوں کی زبان بنگلا (دراصل چاٹگامی زبان بھی ایک علاقائی بنگلا زبان ہے) میں تحریر کی تھی۔

پتہ چلا کہ لشکر وزیر اشرف خان باقاعدہ ایک وزیر بننے سے پہلے مشہور ارکانی راجا سری سودھمہ کے سپہ سالار تھے، یہ بات بعض مغربی مصنفین کی کتابوں میں بھی ملتی ہے، باوجودیکہ سارے مغربی مورخین

(۱) ڈاکٹر احمد شریف، بنگالی اور بنگلا ساھتیہ دوسری جلد، ص: ۴۴۴۔۴۴۵۔

(۲) اڈووکیٹ خلیل الرحمن، تاریخ اسلام برما وارکان، ص: ۴۸۔

نے نہ لشکر وزیر اشرف خان کا نام لیا اور نہ اس زمانے کے بادشاہ کا اسلامی نام لکھا، تاہم ان مورخین میں سے صرف من ریک نے اس وقت کے ارکانی بادشاہ کا نام سکندر شاہ ثانی لکھا ہے۔(۱)

سکندر شاہ ثانی اپنے والد کے انتقال کے بعد تخت وتاج کا مالک ہوا، مگر اس نے تاج سلطنت سر پر لیتے وقت کوئی تقریب نہیں کی تھی، اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اس وقت کے شاہی نجومیوں نے بتایا تھا کہ کوئی بھی نیا بادشاہ اگلے دو سال کے اندر انتقال کر جائے گا، تو بادشاہ سکندر شاہ نے اس دو سال کی مدت کے لئے اپنی بادشاہت کی تقریب نہیں مناتی تھی، لیکن پورے بارہ سال بیت جانے کے باوجود اس کا انتقال نہ ہوا تو پورے بارہ سال گزر جانے کے بعد وزراء اور درباریوں نے عرض کی کہ بادشاہ اپنی بادشاہت کی تقریب منائیں، مگر بادشاہ نے اس معاملے کو اپنے شیخ ومرشد کی چاہت کا حوالہ کیا تھا، راقم نے ہزار کوشش کی کہ بادشاہ کے مرشد کا نام مل جائے، لیکن اب تک کامیاب نہیں ہوسکا، مگر اتنا ضرور پتہ ملا ہے کہ وہ ایک مسلمان تھے، جنہوں نے دو مرتبہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ کے روضۂ اقدس کی زیارت کی تھی (۲) ڈاکٹر عبدالکریم صاحب کا خیال ہے کہ یہ الاول کے زمانے کے عظیم وزیر ماگن ٹاکور کے والد بزرگوار تھے، جو خود بھی کسی زمانے کے لشکر وزیر (سپہ سالار) رہ چکے تھے، یاد رہے کہ مغربی مورخ جناب من ریک (Mam Rague) جو بذات خود سکندر شاہ ثانی کے بارہ سالہ تقریب میں شریک تھے، جو ۱۶۳۵ء میں منعقد کی گئی تھی، جس نے اس تقریب کے تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''میں بذات خود اس تقریب میں شریک تھا، یہاں ارکانی فوجوں کو بھی دعوت دی گئی تھی، جس میں سب سے پہلے لشکر وزیر اشرف خان نے مسلم افواج کی سربراہی کی تھی'' (۳)

قاضی صاحب نے سری سودھمہ اور اس کے سپہ سالار لشکر وزیر شرف خان کا دل کھول کر تذکرہ کیا ہے، ارکان کے اس شاعر نے ۱۶۳۸ء کے لگ بھگ انتقال کیا، انتقال کے وقت ان کی عمر ۳۸ سال تھی، تو ظاہر ہے

(۱) Travels of fray Sabastien Manrique vol. 1,P.352

(۲) عبدالکریم ساھتیہ بیشارد، حیات وکارنامے، عبدالکریم ص: ۲۴۱۔

(۳) Travels of fray Sabastien Manrique vol. 1, P.375

کہ وہ ۱۶۰۰ء میں پیدا ہوئے تھے، شاعر کی مفصل حیات، حالات وواقعات کے انکشاف کے لئے بہتوں پنڈتوں اور سوانح نگاروں نے بڑی کوشش کی لیکن سوانح نگار حضرات بڑی کوشش کے باوجود تقریباً ناکام رہ گئے۔

خیر جو کچھ بھی کیوں نہ ہو، شاعر دولت قاضی اپنی بیش قیمت کتاب شتی مینا کی تحریر کے دوران صرف ۳۸ سال کی عمر میں اچانک انتقال کر گئے، اور ان کی اس انمول کتاب کا تکملہ سید الاول نے ۱۶۵۹ء میں لکھا تھا۔

بہر حال دیوان شتی مینا لور چندرانی تین حصوں پر مشتمل ہے:

(۱) پہلا حصہ: تعارف نامہ پر مشتمل ہے، جس میں لور چندرانی کا تعارف کرایا گیا اور ساتھ ہی ساتھ عاشق الشوق کی پریم کہانی بیان کی گئی ہے۔

(۲) دوسرا حصہ: ہجر ووصل کی داستان ہے، یعنی اس میں شاعر نے لور چندرانی کی شادی پر جنگ و جدل کے تفصیلی حالات درج کئے ہیں، جہاں تک معلوم ہوا ہے کہ شاعر کا اس ہجر نامے کی تحریر کے دوران اچانک انتقال ہو گیا۔

(۳) تیسرا حصہ: عاشق ومعشوق کی طویل جدائی کے بعد وصل کی داستان ہے، یہ حصہ حضرت شاہ الاول صاحب کی تحریر ہے(۱)

بہر حال قاضی دولت صاحب بہت کم عمری میں اس جہان فانی سے رخصت لے چلے، لیکن جتنا کچھ ان کے قلم سے نکلا ہے وہی ہمارے لئے کافی ہے، یاد رہے کہ اگر ان کے بعد الاول پیدا نہ ہوئے ہوتے تو شاید ان کی تحریر سے دنیا واقف ہو پاتی، اللہ تعالیٰ دولت قاضی اور الاول سمیت ہمارے تمام بزرگوں کی مغفرت فرمائے، اور ان کے درجات کو بلند کرے، آمین یارب العالمین۔

(۱) امرتو لال بالا، الاول کے کلام میں ہندو مسلم ثقافت، ص: ۲۶۹۔

اراکان کا درباری شاعر نصر الدین مردن

ارکان کا مشہور شاعر نصر الدین مردنؔ ارکان ہی میں پیدا ہوئے، ان کا نشو ونما اور تعلیم وتربیت بھی یہیں ہوئی، وہ ارکانی راجا سری سودھمہ یعنی سکندر شاہ ثانی کے عہد حکومت میں ارکان کا درباری شاعر تھا، شاعر نے اپنے مشہور دیوان ''نصیب نامہ'' لکھ کر بنگلا زبان وادب میں ایک اچھا مقام بنالیا تھا، باوجود یکہ عبد الکریم ساھتیہ بیشارد نے مردن کو درباری شاعر ہونے سے انکار کیا ہے، لیکن ڈاکٹر عبد الکریم صاحب نے ساھتیہ بیشارد پر تنقید کرتے ہوئے بتایا کہ شاعر مردن ارکان کے درباری شعراء میں سے ایک عظیم شاعر تھا۔(۱)

نصیر الدین مردن اور قاضی دولت ہم عصر اور دونوں ایک ہی زمانے میں درباری شاعر تھے، ڈاکٹر انعام الحق صاحب کا بیان ہے کہ مردن نے سری سودھمہ یعنی سکندر شاہ ثانی کا تقرب حاصل کیا تھا(۲)

شاعر مردن کی ولادت خود ان کے بیان کے مطابق کونچی (غیر معروف مقام) نامی گاؤں میں ہوئی، شاعر نے اپنے مذکورہ دیوان میں اپنی جنم استھان اور وہاں کا راجا سری سودھمہ کی کافی مدح سرائی کی ہے، علاوہ ازیں شاعر نے اپنے دیوان میں اپنے مرشد برحق حضرت شیخ ابراہیم علیہ الرحمۃ کا تذکرہ بھی کیا ہے، مگر یہ تذکرہ بالکل مختصر اور کسی ایک تذکرہ نگار کے لئے اس سے استفادہ ممکن نہیں ہے، جس میں نام کے علاوہ اس بڑے مرشد کا تعارف نہیں دیا گیا ہے۔

دیوان نصیت نامہ:

یہ دیوان ایک پریم کہانی کی تفصیلات پر مشتمل ہے، کہانی کا مختصر روپ یہ ہے کہ:

''عبد الکریم اور عبد النبی سوداگر دونوں آپس میں جگری دوست تھے، ان دونوں کے

(۱) ڈاکٹر عبد الکریم، عبد الکریم ساھتیہ بیشارد، حیات اور کارنامے، ص: ۲۴۳۔

(۲) بنگلا ایشیاٹک سوسائٹی پتریکا، چوتھا حصہ، دسمبر ۱۹۸۶ء، ص: ۷۳۔

درمیان ایک معاہدہ طے پایا تھا کہ اگر ان میں سے ایک کے گھر میں لڑکا اور دوسرے کے گھر میں لڑکی جنی تو دونوں میں ضرور شادی دلائی جائے گی، چنانچہ اللہ تعالی کے حکم سے عبد الکریم کے گھر میں لڑکی جنی اور عبد النبی کے گھر میں ایک لڑکا، لیکن مقدر سے عبد الکریم مسکین اور بے سروسامان ہو گیا تھا، اب دونوں کی اولاد جب بڑی ہوئیں تو عبد النبی نے اس معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اپنے بیٹے کی شادی ایک دوسری لڑکی سے دلانی چاہی، اب عبد الکریم خبر پا کر دوست کے گھر آیا اور اسے اپنا معاہدہ یاد دلایا، اب عبد النبی نے اپنے معاہدہ کو انکار اور مسترد کرتے ہوئے کہا کہ یہ ایک بے بنیاد معاہدہ تھا، جس کی کوئی بھی حقیقت اور حیثیت نہیں، مگر عبد النبی کی بیوی بڑی شریف زادی تھی، اس نے عبد الکریم کو ایسے حالات میں تسکین اور دلاسا دیا، یوں عبد النبی کی شدید مخالفت کے باوجود دونوں میں شادی ہوگئی تھی''۔

جناب عبد الحق چودھری شاعر نصیر الدین مردن کے متعلق قمطراز ہیں کہ:

''ارکانی شاعر مردن قاضی دولت کے ہم عصر تھے، وہ مروہانگ (ارکان) کے قریب کونچی نامی گاؤں میں پیدا ہوئے، اور یہاں ہی ان کی زندگی گزری، انہوں نے ارکانی راجا سری سودھمہ کے عہد حکومت میں اپنا مشہور دیوان ''نصیب نامہ'' تحریر کیا''۔(۱)

شاعر نے اپنی طویل زندگی ارکان ہی میں گزاری، اور سرزمین ارکان کو اپنے سینے سے لگالیا، دعا ہے کہ اللہ تعالی ہمارے شاعر کی مغفرت کے ساتھ ان کا درجہ بلند فرمائے، آمین۔

(۱) عبد الحق چودھری، پروچین ارکان، ص: ۱۰۸۔

شاعر ابوالحسین پنڈٹ

تاریخ ارکان کے مشہور ومعروف شعراء میں شاعر ابوالحسین پنڈٹ کا نام بھی شامل ہے، پتہ چلا ہے کہ وہ نہایت پاک باز اور خداترس اور مسلمانوں کے نہایت خیرخواہ شاعر تھے، انہوں نے اپنے زمانے میں ارکانی مسلمانوں کی کافی خدمات کیں، اور جہاں بھی گئے کہ یہاں کے مسلمانوں کی ہر ممکن مدد کرنے کی کوشش کی تھی۔

شاعر ابوالحسین ارکان کے دارالحکومت مروہانگ (پتھری قلعہ) کے قریبی قصبہ بندر میں پیدا ہوئے، اس زمانے میں یہ قصبہ علماء، صلحاء اور مشائخ کا قصبہ تھا، انہوں نے تعلیم تربیت ان علماء وصلحاء اور مشائخ کے یہاں پائی، انہوں نے عربی، فارسی کے ساتھ بنگلا زبان وادب میں اتنی مہارت حاصل کر لی کہ وہ اپنے زمانے میں ارکان کے سب سے بڑے ادیب اور شاعر کہلائے جانے لگے تھے، وہ ایک شریف زادے ہونے کے ساتھ بڑے ذہین وفطین انسان تھے، کہتے ہیں کہ طالب علمی کے زمانے میں وہ اپنی شاعری کے حوالے سے مشہور ہو چکے تھے، اس کے بعد باضابطہ طور پر شعر وشاعری کی دنیا میں انہوں نے قدم رکھا اور اپنی خداداد صلاحیت واستعداد کا بین ثبوت پیش کر دیا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ شاعر ابوالحسین کے بہتوں دواوین تھے، لیکن آج کل ان کا ایک ہی دیوان ملتا ہے، جس کا نام ''آدم کی لڑائی'' ہے، شاعر نے اپنے دیوان میں اپنے آپ کو ابوالحسین پنڈت کے نام سے متعارف کرایا ہے، اس لئے میں نے ان کے نام کے ساتھ پنڈت کا لفظ چسپان کیا ہے۔

یاد رہے کہ پنڈٹ بنگلا زبان وادب میں کسی باکمال، عالم، گیانی انسان کو کہا جاتا ہے، اس لئے اس زبان میں یہ خطاب کسی ایک انسان کے لئے باعث عزوشرف ہوتا ہے، بہرحال ان کا دیون ''آدم کی لڑائی'' ان کے کمالات کا بین ثبوت ہے، جو سرزمین ارکان کے علاوہ بنگال میں بھی خاصی پڑھی سنی جاتی تھی، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے اور ان کا درجہ بلند فرمائے۔

قریشی ماگن ٹاکور

ایک روایت کے مطابق قریشی ماگن ٹاکور ارکان کے دار الحکومت مروہانگ میں پیدا ہوئے، جب کہ دوسری روایت یہ بھی ہے کہ ان کے آباء واجداد حجاز مقدس سے بنگال کی غوری سلطنت میں آئے، اور غوری سلطنت میں قحط ووباء کی وجہ سے زوال آیا تو آن کے آباء واجداد پٹیہ (چاٹگام) کے چتروشالہ گاؤں میں آٹھہرے، یہاں قریشی ماگن کی ولادت ہوئی، بعد ازاں ان کے والد بڑاماگن نے اپنے اہل وعیال سمیت ارکان کے دارالسلطنت مروہانگ (پتھری قلعہ) میں مستقل طور پر سکونت اختیار کی، اس حوالے سے عبدالحق چودھری صاحب ڈاکٹر انعام الحق اور عبدالکریم ساھتیہ بیشارد کے حوالے سے رقمطراز ہیں کہ:

> ''شاعر قریشی ماگن نے ارکانی راجا نراپتی جی کے عہد حکومت (۱۶۳۸ء۔۱۶۴۵ء) میں اپنا مشہور دیوان ''چندرابتی'' تحریر کی، آپ ادریس علی کے حوالے سے بتاتے ہیں کہ قریشی ماگن ایک بڑے شاعر تھے''۔(۱)

کہتے ہیں کہ ماگن کی وفات حسرت آیات کے بعد ان کے صاحبزادہ سجاول اور بھتیجہ مجاہد کسی وجہ سے روہانگ کو ترک کر کے چاٹگام آئے، پہلے پہلے یہ دونوں شیتا کونڈو میں ٹھہرے، اور بعد میں ان دونوں نے روزان کے مشہور گاؤں فتح نگر (نوازش پور) میں سکونت اختیار کی، یہاں دونوں کروڑوں مالیت کے مالک بھی بنے تھے۔(۲) کہتے ہیں کہ روزان کے علاقے میں اب بھی ان دونوں کے وارثین بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔

ادھر ''چندرابتی'' قریشی ماگن کے دیوان ہونے میں اختلاف ہے، ڈاکٹر عبدالکریم بحولۂ ساھتیہ بیشارد

---

(۱) عبدالحق چودھری پروچین ارکان، ص:۱۰۹۔

(۲) ڈاکٹر عبدالکریم، عبدالکریم ساھتیہ بیشارد، حیات وکارنامے، ص:۲۶۴۔

لکھتے ہیں کہ:

(الف) قریشی ماگن ایک شاعر اور شعر وشاعری سے محظوظ ہونے والے انسان تھے، ان کی شعر و شاعری سے انکار کرنا آسان نہیں ہے۔۔۔۔۔۔حقیقت میں وہ ایک بڑے شاعر تھے، اور شعر و شاعری سے اُن کی دلچسپی کی وجہ سے الاول کو ان کے یہاں پناہ ملی تھی۔

(ب) الاول کے مطابق ماگن قریشی النسب تھے، تو ظاہر ہے کہ قریشی ماگن اور صدیقی ماگن ایک ہی شخصیت ہیں۔

(ج) درحقیقت ماگن ان کا اصل نام نہ تھا، بلکہ ان کا کوئی اسلامی نام بھی تھا، چونکہ وہ اپنے والدین کی دعاؤں کی برکت سے پیدا ہوئے تھے تو ان کا نام ماگن یعنی دعاؤں سے ملا ہوا ٹھہرا، چونکہ چندرابتی میں جو ماگن ملتا ہے وہ بھی دراصل یہی ہے، یوں سمجھا جاتا ہے کہ چندرابتی ماگن ہی کا دیوان ہے۔

لیکن ڈاکٹر عبدالکریم صاحب ساھتیہ بیشارد کے مذکورہ بیان کے شدید مخالف ہیں، اور لکھتے ہیں کہ:

''ہم اپنی تحریر میں صاف صاف بتاتے آئے ہیں کہ قریشی ماگن اور ماگن ٹاکور ایک نہیں ہیں، اور قریشی ماگن نے اپنا دیوان کہاں لکھا ہے یہ بھی ظاہر نہیں ہے، علاوہ ازیں قریشی ماگن کم سے کم الاول کے انتقال کے پچاس برس کے بعد کے شاعر ہیں''۔(۱)

ڈاکٹر عبدالکریم صاحب کی طرح جناب سلطان احمد بھونیا بھی لکھتے ہیں کہ:

''قریشی ماگن اور ماگن ٹاکور دونوں الگ الگ شخصیتیں ہیں''۔

بہر حال جو کچھ بھی ہو شک نہیں ہے کہ قریشی ماگن سرزمین ارکان کے ایک بڑے صاحب علم شاعر تھے، جنہوں نے ''چندراپتی'' لکھ کر ارکان اور بنگلا زبان وادب کو عزت سے نوازا، وہ کبھی بھی بھلا کے جانے والا انسان نہیں ہیں، ان کے احسانات سرزمین ارکان بشمول یہاں کے مسلمان اور اسلام پر بھاری ہیں ، جناب مرحوم وکیل خلیل الرحمن صاحب ارکانی الاول کے حوالے سے رقمطراز ہیں کہ:

''بقول ملک الشعراء سید الاولؒ کہ ماگن ارکان کے راجا تھاڈومن یا من راجا جی

(۱) ڈاکٹر عبدالکریم، عبدالکریم ساھتیہ بیشارد، حیات وکارنامے، ص: ۲۶۸۔

معروف بہ سلیم شاہ (۱۶۰۰ء) من کھامن حسین شاہ (۱۶۱۲ء) اور سندھ سودھمہ (۱۶۵۲ء) کے ایام حکومت میں وزیر اعظم تھا، وہ صدیقی تھا، وہ بڑا علم دوست اور قدرداں وقدر شناس اہل علوم وفنون تھا، پارسا اور خیر خواہ قوم تھا، وزارت ارکان اس کو بطور آبائی میراث ملی تھی، ارکانی مسلمانوں کی تعلیم وتربیت کے لئے اس نے متعدد کتب فارسی سے بنگلا میں ترجمے حضرت شاہ (الاول) صاحب موصوف سے کروائے تھے، جیسا کہ پداپتی، ذوق قلندر، ہفت پیکر اور سیف الملوک بدیع الجمال وغیرہ۔ اور شجاع کی ارکان میں تباہی کے بعد بہر صورت شاہ صاحب کو ممدوح نے حمایت اور اعانت کی''۔(۱)

ماگن بڑے باوقار اور ہر دلعزیز شخصیت کے مالک انسان تھے، بادشاہ سے لے کر سلطنت کے ارباب بست وکشاد ان کو بڑے احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے، سلطنت کے اس سرے سے لے کر اس سرے تک ان کی تعریف اور مدح سرائی ہوتی تھی، بادشاہ انہیں اتنے باوقار انسان سمجھتا تھا کہ اس نے اپنے خاندان کا سب سے بڑا مربی انہیں بنایا تھا، سلطنت کا پورا رکھوالا ان کو بنایا گیا تھا، اس حوالے سے عبد الحق صاحب چودھری رقمطراز ہیں کہ:

''راجا نراپتی جی کی ایک بیٹی تھی، انتقال کے وقت اس راجا نے اسے ماگن کا حوالہ کیا، یوں ماگن اس لڑکی کا رکھوالا بنے، انہوں نے نراپتی جی کا بھتیجہ تھاڈومنترا (۱۶۴۵ء۔ ۱۶۵۲ء) سے اس لڑکی کی شادی دی، ویسے وہ بعد میں سرزمین ارکان کی رانی بنی تھی، اور تھاڈومنترا نے بھی ماگن کو اپنا وزیر اعظم بحال رکھا تھا، اس تھاڈو منترا کے عہد حکومت میں الاول ارکان پہنچے تھے، تھاڈومنترا کے انتقال کے بعد اس کے بیٹا چندراسودھمہ (۱۶۵۲ء۔ ۱۶۸۴ء) کو ارکان کا راجا بنایا گیا، مگر سری چند راسودھمہ کی عمر اس وقت بہت کم تھی، وہ مستقل راجا ہونے یا بنائے جانے کی عمر تک

(۱) اڈووکٹ خلیل الرحمن ارکانی، تاریخ اسلام برما وارکان، ص: ۷۴۔

پہنچا ہوا نہ تھا، تو رانی پر سلطنت کا سارا بار پڑا تھا، چنانچہ رانی نے ماگن کو وزارت عظمی کے منصب پر بحال رکھ کر ان کے ذریعے سلطنت چلائی تھی، اور ۱۶۳۸ء سے لے کر ۱۶۸۵ء تک یعنی تین تین راجاؤں کے عہد ہائے حکومت میں ماگن ارکان کا وزیر اعظم بنے رہے تھے، آخر کار ماگن نے ۱۶۸۵ء میں اس جہان فانی سے رخصت لی‘‘۔(۱)

ماگن ٹاکور اپنے والد بزرگوار بڑے ماگن کا لائق و فائق وارث تھے، نراپتی جی کے عہد حکومت میں والد کے انتقال کے بعد وہ وزارت عظمی جیسے منصب جلیلہ پر فائز ہوئے تھے، پچھلے بیانات سے ظاہر ہے کہ وہ نراپتی جی (۱۶۳۸ء۔ ۱۶۴۵ء) اور تھاڈو منترا (۱۶۴۵ء۔ ۱۶۵۲ء) اور سندھ سودھمہ (۱۶۵۲ء۔ ۱۶۸۴ء) یعنی مسلسل تین بادشاہوں کے ادوار حکومت میں وزیر اعظم رہ چکے تھے، الاول نے اپنے دیوان پداپتی اور سیف الملوک بدیع الجمال کے مقدموں میں ان کے طویل تذکرے کئے ہیں، چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

’’پردھان منتری (وزیر اعظم) ماگن ٹاکور بڑے صدق وصفا کے مالک انسان تھے، میری خوش قسمتی تھی کہ ان سے میری ملاقات ہوگئی تھی، انہوں نے مجھے بہت پیار دیا، اور عزت بھی دی، اور مجھے بڑے بڑے ہدایا سے نوازا، ان کے دربار میں پنڈتوں اور گیانیوں کا ہمیشہ ہجوم رہتا تھا، ان کو شعر و شاعری کے ذوق کے ساتھ مشاعرہ سے دلچسپی تھی، علاوہ ازیں ان کے دربار میں بہتوں علوم وفنون، اور متنوع موضوعات پر گفتگو ہوتی تھی، ادھر وہ دربار میں جلوہ افروز ہوتے تو ادھر ان کے گرد پنڈتوں اور عالموں کا بڑا ہجوم ہوتا تھا‘‘۔

اسی طرح الاول نے اپنے دیوان سیف الملوک بدیع الجمال میں بیان کیا ہے کہ:

’’ماگن ٹاکور ایک عظیم پنڈٹ اور گیانی انسان ہیں، اللہ تعالی نے انہیں ظاہری اور باطنی صفات سے متصف اور تاباں کیا ہے، وہ صدیقی النسب، شیخ زادہ ہونے

(۱) عبدالحق چودھری پروچین ارکان، ص: ۹۸۔۹۹۔

کی وجہ سے ملک بھر کے تمام باشندے ان کے گن گاتے اور مدح سرائی کرتے ہیں، ملک کی فضاء ان کی انمٹ اور روشن خدمات سے بھری پڑی ہے، خود علم وعمل کی دولت سے متصف ہیں، یعنی وہ علم اور گیان سے مالا مال ہیں‘‘۔(۱)

ڈاکٹر نجوم الدین صاحب ماگن ٹاکور کے متعلق رقمطراز ہیں کہ:

’’آپ قرشی النسب تھے، عربی، فارسی، سنسکرت، برمیز اور بنگلا زبانوں کے ماہر ہونے کے علاوہ ایک جلیل القدر عالم و فاضل، ظاہری و باطنی علوم وعرفان سے متصف شاعر تھے، آپ نے اپنی زندگی میں ’’چندرابتی‘‘ جیسا دیوان تحریر کیا تھا‘‘۔(۲)

ظاہر ہے کہ ماگن ٹاکور سب سے پہلے نراپتی جی کے عہد حکومت میں وزیر اعظم بنے، وہ سلطنت ارکان کے راج دربار میں بڑے باوقار انسان تھے، نراپتی جی ان کو اپنے باپ سے زیادہ احترام کرتا تھا، چنانچہ اس راجا نے اپنے انتقال کے وقت انہیں اپنی اکلوتی بیٹی کا رکھوالا بنایا تھا۔(۳)

(نوٹ) ظاہر ہے کہ ماگن ٹاکور سرزمین ارکان کی ایک تاریخی شخصیت جو طویل عرصے تک یہاں کے وزیر اعظم رہ چکے تھے، چنانچہ ان کا تذکرہ ارکان کے وزراء اور ارباب بست وکشاد میں ہونا چاہئے تھا، لیکن ان کا تذکرہ بحیثیت شاعر یہاں اس باب میں کیا گیا ہے، اس لئے ان کا تذکرہ ارکان کی بڑے بڑے اصحاب حل وعقد میں نہیں ملے گا۔

(۱) عبدالحق چودھری بحوالہ سیف الملوک بدیع الجمال، ص: ۹۷۔۹۸۔

(2) DR.NAJUMODDIN AHMED,ISLAMIC HERITAGE IN BANGLADESH,P. 39.

(۳) سید علی احسن، مقدمہ ’’پداپتی‘‘، ص: ۳۴۔۳۵۔

مولوی عبدالکریم خواندکار المعروف بہ شجاع قاضی

مولوی عبدالکریم معروف بہ شجاع قاضی صاحب علاقۂ ممبرا کے معروف قصبہ قیم کی سادہ/سادات فارہ بستی میں پیدا ہوئے، جہاں تک پتہ چلا کہ ان کا خاندان اس علاقے کے بڑے بااثر اور متمول خاندان میں سے تھا، خاندان کے بزرگوں نے ان کی پیدائش سے پہلے اور بعد میں بھی ارکانی حکومت میں کافی حصے لئے تھے۔ عبدالکریم صاحب کا نشوونما، تعلیم اور تربیت اپنے علاقے میں خاندان کے بزرگوں کے ہاتھوں ہوئی، کچھ بڑے ہوئے تو انہوں نے سیاست کے ساتھ تجارت سے دلچسپی، باوثوق ذرائع سے پتہ چلا کہ ۱۷۸۴ء کو برمی راجا بدھوپھیہ نے جب ارکان کو قبضہ کیا تو شجاع قاضی نے برمی غاصبوں کا بھرپور ساتھ دیا تھا، برمی راجا بدھوپھیہ کے گورنر نے ان کو اس تائید کے صلے میں جنوبی ارکان کا حاکم اعلی بنادیا تھا، یوں وہ رامری میں عرصہ دراز تک مقیم رہے، بعدازاں وہ قیم واپس آئے اور اپنے گاؤں کو ایک بارونق شہر میں تبدیل کردیا تھا، وہ ایک حاکم ہونے کے ساتھ ایک بڑے پائے کے ادیب، شاعر اور ماہر تاجر بھی تھے، اس زمانے کے مشہور ارکانی تاجر او جی صاحب (جن کا تذکرہ اگلی سطور میں انشاء اللہ تعالی آنے والا ہے) قاضی صاحب کا گہرا دوست اور شریک عمل تھے، علاوہ ازیں کہتے ہیں کہ او جی صاحب ان کا مشیر خاص بھی تھے، موضع سادہ فارہ میں قاضی صاحب نے ایک مسجد بنائی تھی، جس کے کھنڈرات اب بھی یہاں پائے جاتے ہیں، جس کے قریب ایک پختہ تالاب بھی ہے، اس مسجد کے بغل میں قاضی صاحب کا پختہ مقبرہ اب بھی زیارت گہِ عام ہے۔

بعد میں قاضی صاحب برمی غاصبوں کے شدید سے شدید ترین مخالف ہو گئے تھے، چنانچہ برمی راجا چیڈ وبا کے عہد حکومت میں جب ارکانی مسلمانوں پر مظالم ڈھائے جانے لگے تو انہوں نے او جی کے تعاون سے انگریزوں کو ارکان لانے کی کوشش کی تھی، اس سلسلے میں انہوں نے او جی کو کلکتہ بھیجا تھا، جس میں وہ کسی قدر کامیاب بھی ہو گئے تھے۔

کہا جاتا ہے قاضی صاحب کی بہت ساری بیویاں تھیں، جن کے بطن سے ان کی بہت ساری اولاد

تھیں، کہتے ہیں کہ قاضی صاحب کی بڑی اہلیہ کسی برمی نژاد مسلمان وزیر کی صاحبزادی تھی، بہر حال قاضی صاحب کی اولاد ارکان میں مشہور ومعروف تھیں، انگریز سرکار نے ان کی اولاد کی بڑی قدردانی کی اور صاحب زادوں کو ضلع اکیاب کے مختلف قصبہ جات کے حاکم بنایا گیا تھا، چنانچہ مسٹر ربرٹسن او جی اور شجاع قاضی کے متعلق رقمطراز ہیں کہ:

> ''شجاع قاضی صوبہ ارکان کے مسلمانوں کا رئیس اعظم ہے، اس کے ساتھ ہمارا خفیہ خط وکتابت جاری رہتی تھی، وہ ہندوستانی زبان کا ماہر ہے، وہ سرزمین ارکان کی ذی وقار وبا اقتدار شخصیتوں میں سے ایک ہے، اس کے ساتھ میں بسا اوقات بات چیت کرتا تھا، شجاع قاضی اور او جی سے ملاقات کے بعد میں نے ان سے یہ مشورہ طلب کیا کہ ہم آپ حضرات کے ساتھ مستقل طور پر ارکان میں رہنا چاہتے ہیں، آیا یہ ممکن بھی ہے؟ تو انہوں نے جواب میں یہ بتایا تھا کہ ہم آپ کو تنبیہ کرتے ہیں کہ اس ملک کی آب و ہوا آپ حضرات کے موافق نہیں ہے، اس لئے ممکن ہے کہ آب و ہوا کی خرابی آپ حضرات کو کھا جائے گی، اور یہ بھی ممکن ہے کہ جس کی وجہ سے آپ حضرات موت کی اندھیری وادی کو پہنچ جائیں گے، چنانچہ ان دونوں کا یہ نیک مشورہ صحیح ثابت ہوا، اور ہمارے دوست ڈاکٹر لویس گرانٹ کے مطابق ان کے خیالات صحیح اور سچے نکلے''۔(۱)

شاعر شجاع قاضی نے ''روشنگ پنچالی'' کے نام سے سرزمین ارکان کی تاریخ منظوم کی، اس بیش قیمت دیوان کے علاوہ آپ کے اور بھی چند تصانیف پائی جاتی ہیں، جن کے نام درج ذیل ہیں:

(۱) راحۃ القلوب۔

(۲) نورنامہ۔

(۳) دریغ مجلس/ دھلا مجلس۔

---

(۱) روبرٹسن، فرسٹ برمیز وار، ص:۹۸۔

(۴)مدھومالتی۔

(۵)عبداللہ کے ہزار سوالات۔

(۶)تمیم انصاری۔

ڈاکٹر احمد شریف شاعر شجاع قاضی کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

''عبدالکریم خواندکار ارکان میں پیدا ہوئے، آپ کے آباء واجداد سلطنت ارکان کے مختلف بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے، آپ کا نسب نامہ تحریری طور پر پایا جاتا ہے، آپ کے تین دواوین (ڈاکٹر احمد شریف صاحب کے مطابق) پائے جاتے ہیں: (۱) دھلامجلس (۲) تمیم انصاری (۳) عبداللہ کے ہزار سوالات، آپ نے ۱۷۵۰ء کو دھلامجلس کی تکمیل کی، انہوں نے یہ کتاب سلطنت ارکان کے مشہور راجانراپیا (۱۷۴۲ء-۱۷۶۱ء) کے زوال کے چالیس سال قبل لکھی تھی''۔(۱)

جس طرح ڈاکٹر احمد شریف نے لکھا ہے کہ:

''ان (شجاع قاضی صاحب) کا نسب نامہ تحریری طور پر پایا جاتا ہے''۔

چنانچہ میں نے اس حوالے سے خاصی کوشش کی کہ ان کا نسب نامہ کہیں سے مل جائے، لیکن بڑی کوشش کے باوجود قاضی صاحب سے لے کر ان کے پہلے والے بزرگوں کا نسب نامہ کہیں سے نہ مل سکا، تاہم قاضی صاحب کی اولاد کا ایک تفصیلی شجرہ سعودی عرب میں مقیم ان کے خاندان کی طرف منسوب ایک صاحب (جن کا نام اب مجھے یاد نہیں آرہا) کے ہاتھوں تحریری طور پر مل گیا ہے، چنانچہ اس شجرہ کے مطابق قاضی صاحب کی اولاد درج ذیل ہیں:

(۱)عظیم الدین کیونگ۔

(۲)صادقہ۔

(۳)مقیمہ۔

(۱)ڈاکٹر احمد شریف، بنگالی اور بنگلا ساھتیہ، حصہ دوم، ص:۹۳۔

(۴)آمین خاتون۔

(۵)بڑاچیرانگ کیونگ۔

(۶)امین الدین کیونگ۔

(۷)نورخاتون۔

(۸)عبدالجلیل۔

(۹)معین الدین کیونگ۔

(۱۰)صورت۔

(۱۱)عقیمہ۔

(۱۲)ملنگ چیرانگ کیونگ۔

(۱۳)علاءالدین کیونگ۔

قاضی صاحب کے بڑے صاحب زادے عظیم الدین کیونگ صاحب کی صاحب زادی مرحومہ نورعین کا ایک تفصیلی اور بڑی تفصیلی شجرہ دستیاب ہوا ہے، چنانچہ اس شجرہ کے مطابق یہ نورعین بنت عظیم الدین کیونگ بن شجاع قاضی صاحب سرزمین ارکان کے مایۂ ناز بزرگ عالم دین وشیخ طریقت حضرت مولانا نورمحمد صاحب خنڈ لی (خلیفۂ اجل حضرت مولانا شاہ عبدالسلام صاحب ارکانی گودام فاروی) کی والدہ ماجدہ ہیں۔

یاد رہے کہ حضرت مولانا نورمحمد صاحب خنڈ لی بن حضرت علامہ جناب مولانا بدیع الرحمن بن حضرت مولانا خطیب عبدالباری بن حضرت مولانا عبداللہ امام بن حضرت مولانا محمد ناہیک امام بن حضرت شاہ محمد اسحاق بن حضرت اقدس، قدوۃ السالکین، زبدۃ العارفین، شاہ محمد الاول (علاول) قدس سرہ شاعر ارکان ماں کی جانب سے شجاع قاضی صاحب کی اور باپ کی جانب سے حضرت الاول کی اولاد میں سے ہیں، حضرت مولانا نورمحمد صاحب خنڈ لی اور ان کے بھائی شیخ الحدیث حضرت مولانا شمس الضحیٰ صاحب کے تذکرے ہمارے اس سلسلۂ ''تاریخ ارکان کے درخشان ستارے'' کی زینت بنے ہوئے ہیں۔

مولوی عبدالمطلب

مولوی عبدالمطلب صاحب کی پیدائش ایک روایت کے مطابق سترھویں صدی عیسوی کی ابتدائی دہائی میں ارکان کے دارالسلطنت مروہانگ میں ہوئی، جب کہ دوسری روایت کے مطابق ان کی پیدائش کیوکتو میں ہوئی، انہوں نے تعلیم وتربیت اپنے علاقے میں پائی، فراغتِ تعلیم کے بعد درس وتدریس سے منسلک ہو گئے، انہوں نے پند ونصیحت اور دعوت وتبلیغ کے ذریعے بندگانِ خدا کی خاصی رہنمائی کی تھی، کہتے ہیں کہ وہ ایک روادار بزرگ تھے، وہ دعوت دین کی شمع جلائے غیر مسلموں کے یہاں بھی جایا کرتے تھے، چنانچہ انہوں نے اسلام کی صداقت اور حقانیت سے ان غیر مسلموں کو متعارف کراتے ہوئے بہتوں کو دین اسلام کے حلقے میں بھی داخل کر لیا تھا۔

مولوی عبدالمطلب صاحب راہِ تصوف وسلوک کے سالک بھی تھے، لیکن ان کے شیخ طریقت کون تھے اور کہاں کے تھے اس کا پتہ نہ چل سکا، ان کی تصنیف سے جہاں تک پتہ چلا ہے کہ وہ ایک شبِ زندہ دار صاحب دل اور درویش صفت بزرگ تھے۔

مولوی عبدالمطلب کی تصنیف ''کیدانی'' دراصل فقہ اسلامی کا نچوڑ ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک زبردست عالم دین اور ذی استعداد فقیہ اور صاحب نظر مفتی تھے، انہوں نے اپنی تصنیف کیدانی میں فقہ اسلامی کے ایک متلاطم سمندر کو کوزے میں بھر دیا ہے، علاوہ ازیں وہ بڑے مالدار اور باثروت انسان تھے، لیکن عام مالداروں کے برعکس بڑے سخی اور فراخ دل تھے، ان کے یہاں کوئی بھی مصیبت زدہ یا حاجت مند آتا تو وہ اسے کبھی بھی خالی ہاتھ واپس نہیں کرتے تھے، غرض وہ ہر کسی سے محبت رکھتے، اور ہر حال میں غریبوں، مسکینوں اور یتیموں کو اپنا سمجھتے تھے۔

مولوی عبدالمطلب صاحب نے ایک طویل مدت تک اس سرزمین میں پند ونصیحت اور دین ودعوت کے ساتھ غریبوں، مسکینوں، یتیموں اور حاجتمندوں کی خدمات انجام دیتے ہوئے بالآخر اس دنیا سے رخصت لی۔

مولوی محمد اسماعیل ثاقبؔ:

ارکان کے بڑے عالم و شاعر جناب مولانا محمد اسماعیل ثاقبؔ ارکان کے علاقۂ ممبرا کی مشہور ومعروف بستی قیم میں پیدا ہوئے، ان کی تعلیم وتربیت اور نشوونما بھی وہیں ہوا، وہ ایک بڑے شاعر ہونے کے علاوہ بنگلا زبان کے نثار وادیب تھے، علاوہ ازیں بڑے متقی، پرہیزگار اور خدا ترس بزرگ بھی تھے، ساتھ ہی ساتھ وہاں کی ایک جامع مسجد کے امام اور خطیب بھی تھے، اور ان کے متعلق یہ بھی پتہ چلا کہ وہ اپنے زمانے میں ایک داعی الی اللہ اور مصلح قوم بھی رہ چکے تھے، مولانا اسماعیل ثاقب کے متعلق عبدالحق چودھری لکھتے ہیں کہ:

> مولوی اسماعیل ثاقب قیم ارکان کا باشندہ تھے، آپ نے ''بلقیس نامہ'' نامی ایک دیوان تحریر کیا''۔(۱)

اور ارکانی مورخ اڈووکٹ خلیل الرحمن صاحب مولانا کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

> اور مولوی محمد اسماعیل نے سراجیہ اور شریفہ کا ترجمہ بنگلا زبان میں کیا تھا.....اور قیم کے امام ثاقبؔ نے مولانا عبدالعلی دری کے ارشاد کے مطابق ''بلقیس نامہ'' لکھا ہے''۔(۲)

---

(۱) عبدالحق چودھری، قدیم ارکان میں مسلمان، ہندو اور بدھ باشندے، ص:۱۱۰۔

(۲) اڈووکٹ خلیل الرحمن، تاریخ اسلام بر ماوارکان، ص:۷۷۔

قاضی محمد حسین

ارکان کے مشہور شاعر مرحوم قاضی محمد حسین صاحب بندر میں پیدا ہوئے، ان کی تعلیم وتربیت اور نشوونما اپنے علاقے میں ہوا، ان کے خاندان کا شمار اس علاقے کے متمول باثر اور علمی خاندانوں میں ہوتا تھا، وہ ایک صاحب دل اور صاحب علم انسان تھے، علاوہ ازیں وہ ارکان کے ایک باوقار قاضی بھی رہ چکے تھے، مورخین کے بیانات سے جہاں تک پتہ چلا کہ انہوں نے اپنی زندگی میں تین مشہور دواوین لکھے، جن میں ان کی شاعری کا گل کھلا، اورہمیں ان کی صلاحیت و استعداد کا ثبوت ان دواوین کے ذریعے ملا ہے، چنانچہ عبدالحق چودھری صاحب ان کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

''آپ (قاضی محمد حسین صاحب) مروہانگ کے قریبی علاقہ بندر کا باشندہ تھے، آپ نے تین دواوین منظوم کئے، جن کے نام یہ ہیں: (۱) داستانِ امیر حمزہ (۲) دیولال متی (۳) حیدری جنگ''۔(۱)

قاضی محمد حسین صاحب کے متعلق اڈووکٹ خلیل الرحمن صاحب لکھتے ہیں کہ:

''بندر کے قاضی محمد حسین نے داستان امیر حمزہ، دیولال متی اور حیدری جنگ کا اول حصہ تصنیف کی''۔(۲)

قاضی صاحب ایک صاحب دل اور صاحب نظر بزرگ تھے، خودتو شیخ طریقت تھے، لیکن پتہ نہ چل سکا کہ ان کے شیخ طریقت کون تھے، وہ ایک داعی الی اللہ ہونے کے ساتھ سیاست سے بھی دلچسپی رکھتے تھے، انہوں نے دعوت وتبلیغ اور پند ونصیحت کے ذریعے اپنے علاقے سے بدعات وخرافات کو ختم کرنے کی حد درجہ کوشش کی تھی، چنانچہ ارکان کی سرزمین میں ان کی گرانقدر خدمات ہیں، انہوں نے ستارھویں صدی کی آخری دہائیوں میں مروہانگ میں وفات پائی، اور وہیں مدفون ہیں۔

(۱) عبدالحق چودھری، قدیم ارکان میں مسلمان، ہندو اور بدھ باشندے، ص:۱۱۰۔

(۲) اڈووکٹ خلیل الرحمن، تاریخ اسلام برما وارکان، ص:۷۷۔

شاعر محمد خان

ارکانی شاعر محمد خان ایک روایت کے مطابق ممبرا میں پیدا ہوئے، ان کی کچھ تعلیم وتربیت خاندان کے بزرگوں کے یہاں ہوئی، بعد میں وہ ارکان کے عظیم داعی، مصنف، مصلح اور شاعر سید سلطان سے منسلک ہوگئے، یہاں ان کی خوب سے خوب تر تعلیم اور تربیت ہوئی، محمد خان ایک شاعر اور مصنف بھی تھے، انہوں نے اپنی مستعار زندگی میں کئی تصانیف لکھ چھوڑیں، جن میں ''صحابہ رکھا'' (اصحاب رسول نامہ) ''مقتول حسین''/مقتل حسین اور ''قیامت نامہ'' ناقابل فراموش ہیں، ان کی ان مذکورہ تصانیف میں مقتول حسین نامی تصنیف نے کافی شہرت پائی ہے، یہ تصنیف ادبی لحاظ سے بھی گرانقدر ہے۔

مولوی زین الدین وہ نصر اللہ

مولوی زین الدین اور نصر اللہ صاحبان کا شمار ارکان کے بڑے شاعروں میں ہے، یہ دونوں ارکان کے دارالسلطنت مروہانگ کے قریبی علاقے میں پیدا ہوئے، ان کی تعلیم اور نشوونما بھی وہیں ہوا، ان دونوں نے مل کر قاضی محمد حسین مرحوم کے نامکمل دیوان ''حیدری جنگ'' کے بقیہ حصے کی تصنیف کی۔(۱)

(۱) کچھ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو اڈووکٹ خلیل الرحمن، تاریخ اسلام برما وارکان، ص:۷۶۔

دیگر شعرائے ارکان

مذکورہ بالا شعراء کے علاوہ اور بھی چند شعراء ایسے پائے جاتے ہیں کہ جن کو اگر چہ باضابطہ طور پر روہانگ کے شعراء نہ مانا جائے تو بھی کم سے کم ارکان (جس زمانے میں چاٹگام کا علاقہ بھی ارکان کا ایک حصہ تھا) کے شعراء ضرور کہا جا سکتا ہے، اس لئے ہم ان میں سے بعض مشہور اور صاحب دواوین شعراء کے صرف اسمائے گرامی درج کر دیتے ہیں:

(۱) شمشیر علی۔

(۲) محمد خان۔

(۳) دھونا غازی چودھری۔

(۴) عبدالنبی۔

(۵) سید محمد اکبر۔

(1) محمد رضا۔

() محمد رفیع الدین۔

(٦) شیر باز۔

(۷) شیخ سعدی۔

(۸) عبدالعلیم

(۹) رام علی داس۔

(۱۰) عبدالحکیم۔

(۱۱) شاہ بارود خان۔

بعض حضرات مورخین وقلمکار شمشیر علی کے علاوہ مذکورہ دوسرے شعراء کو حالیہ ارکان کے شعراء ہونے سے انکار کرتے ہیں، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ یہ سارے شعراء کم سے کم چاٹگام کے پیداوار

ہیں، جب کہ میں پچھلی سطور میں بتا کے آیا ہوں کہ اس وقت چاٹگام بھی ارکانی سلطنت کا ایک حصہ تھا، اس لئے میں نے اپنے دعوی کی صحت کے ثبوت پر ڈاکٹر عبدالکریم صاحب کا حوالہ دینا مناسب سمجھا، چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''ہم نے کہا ہے کہ کم سے کم ۱۵۷٦ء سے لے کر ۱٦٦۵ء تک چاٹگام ارکان کا ایک حصہ رہا تھا، اسی وقت چاٹگام میں جن شعراء نے دواوین لکھے وہ بھی ارکان کے باشندے تھے''۔(۱)

---

(۱) ڈاکٹر عبدالکریم، عبدالکریم ساھتیہ بیشارد، حیات وکارنامے، ص:۲٦۷۔

دوسرا باب

ارکان کے چندوزراءاورارباب بست وکشاد

مدخل

مورخین کا اس بات پر تقریبا اتفاق ہے کہ مروکو دور حکومت سرزمین ارکان کی حکمرانی کا زرین دور تھا، اس حوالے سے یہ بات قابل ذکر ہے کہ ۱۶۲۲ء سے لے کر ۱۷۸۴ء تک کی درمیانی مدت میں پائے جانے والے شاہان ارکان اور وہاں کے وزراء وارباب بست وکشاد کے کارناموں کی جھلکیاں تو پائی جاتی ہیں، لیکن ان کی تفصیلی حالات سے مورخین تقریبا خاموش ہیں، اس خاموشی کے اسباب میں سے میرے ناقص خیال میں ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ سوانح نگاری سے یہاں کے مصنفین وتاریخ نگار واقف نہیں تھے، تاہم کسی نے کچھ لکھا بھی تو اسے برمی راجا بدھوپھیہ نے اپنے حملے کے دوران جلا کر راکھ کردیا تھا، بایں ہمہ تاریخ کے جھروکے سے جتنے اور جن بزرگوں کے اجمالی حالات ملے ہیں، ہم اس باب میں انہیں درج کردیتے ہیں۔

تاریخ کی جھلکیوں سے جہاں تک پتہ چلا کہ ارکانی حکومت کے تقریبا تمام وزراء اور ارباب حل وعقد نے اپنے اپنے زمانے میں اپنی اپنی لیاقت وصلاحیت اور حسن انتظام کا بڑا ثبوت پیش کیا تھا، اسی طرح اس زمانے کے علماء، دانشوران، مصلحین ومبلغین اور مشائخ ومرشدین اور مجاہدین نے بھی اپنی اپنی صلاحیت واستعداد سے کام لیا تھا، اس حوالے سے کم سے کم ۱۴۳۰ء سے لے کر ۱۷۸۴ء کی درمیانی مدت میں کی جانے والی ان کی روشن خدمات اور تابناک کارناموں کو یادرکھے جانے کے قابل ہیں۔

یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ مذکورہ درمیانی مدت کے اکثر ارکانی بادشاہ سے لے اکثر وزراء، حکومت کے بڑے بڑے عہدیداران حتی کہ بڑے بڑے چپراسی تک مسلمان تھے، یہاں کے غیر مسلم باشندوں کا کام صرف

اور صرف عیاشی، آرام طلبی، غفلت شعاری اور تساہل پسندی ہی تھا، مروکو دور حکومت میں یہاں کے مسلمانوں نے جو خدمات کی تھیں ان کی نظیر ارکان کی پچھلی تاریخ میں ملنی مشکل ہے، مسلمانوں کے حسن انتظام کی وجہ سے یہ سلطنت امن وآشتی، سکون وطمانیت، اخوت وبھائیچارگی اور انسانیت نوازی کا گہوارہ بنی ہوئی تھی، چنانچہ اسے دیکھ کر دنیا کے گوشے گوشے سے امن وسکون کے طالب انسان یہاں آئے ہوئے تھے۔

لشکروزیراشرف خان

لشکر وزیر اشرف خان صاحب شمالی چاٹگام کے مشہور مقام روزان کے ساریہ گاؤں کی بستی قدل پور میں ایک متمول اور با اقتدار گھرانے میں پیدا ہوئے،ان کی تعلیم و تربیت اور نشوونما بھی یہیں ہوا،بعد میں وہ ارکانی فوج میں بھرتی ہوگئے،ترقی کے مختلف مدارج طے کرتے ہوئے آخرکار سپہ سالار جیسے منصب پر فائز ہوگئے تھے۔اس گاؤں میں اب بھی آپ کے پختہ مکان کے کھنڈرات موجود ہیں،اور یہاں آپ کے نام پر ایک تالاب بھی ہے،علاوہ ازیں چاٹگام کے بعض گاؤں میں آپ کے نام کے کچھ نشانات بھی پائے ہیں،اس طرح روزان کے مشہور گاؤں قدل پور میں آپ کے نام کا ایک بڑا تالاب ہے،جسے لوگ لشکروزیر کا تالاب کہتے ہیں۔

قاضی دولت ارکان کے دارالحکومت مروہانگ پہنچے تو لشکر وزیر اشرف خان صاحب (جو اس زمانے میں وزیر تھے) کے دربار میں ان کی بڑی دھوم دھام سے پذیرائی ہوئی، انہوں نے اپنی فطری قابلیت اور خداداد صلاحیت کو دارالسلطنت مروہانگ میں جانکھارا،ان کی صلاحیت اور استعداد کو دیکھ کر لشکروزیر اشرف خان صاحب نے ''شتی مینالور چندرانی'' لکھنے کی فرمائش کی۔(۱)

لشکر وزیر اشرف خان صاحب بڑے صاحب علم اور صاحب کردار انسان تھے،عربی، فارسی، گجراتی ،ہندی، پالی اور سنسکرت زبانوں میں بڑی مہارت رکھتے تھے، اور ان ساری زبانوں میں ہونے والے شعروشاعری سے نہ صرف محظوظ ہوتے بلکہ اس پر تنقید وتبصرہ بھی کیا کرتے تھے۔

مرحوم اشرف خان سرزمین ارکان کے ایک عظیم اور نامور بزرگ انسان تھے،جیسا کہ پچھلی سطور میں عرض کی گئی ہے کہ آپ ارکانی بادشاہ سلیم شاہ ثانی (۱۶۲۲ء۔۱۶۳۸ء) کے دور حکومت میں سلطنت ارکان کے سالار جنگ یا سپہ سالار رہ چکے تھے،تاریخ میں ان کے تذکرے اور ان کی خدمات کا منہ بولتا ثبوت ملتا ہے ،قاضی دولت کی کتاب شتی مینالور چند رانی میں آپ کے بلند اخلاق و صفات اور اچھے اچھے

(۱) ڈاکٹر عبدالکریم،عبدالکریم ساھتیہ بیشارد،حیات وکارنامے،ص:۲۴۲۔

کارناموں کی تفصیلات موجود ہیں، قاضی دولت کی تحریر کے مطابق وہ بڑے انسان دوست بزرگ تھے، بڑوں کی تعظیم، چھوٹوں سے پیار، علماء وصلحاء سے محبت اور لگاؤ گویا آپ کی طبیعت ثانیہ تھا،آپ نے سلطنت ارکان کے اس سرے سے لے کر اس سرے تک مدرسے، مساجد، خانقاہیں،تالاب اور مسافر خانے بنوا بنوا کر ملک کے لوگوں کے دل موہ لئے تھے، وہ ۱۶۲۲ء سے لے ۱۶۴۸ء تک اس منصب جلیلہ پر فائز رہ چکے تھے،قاضی دولت آپ کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

''لشکروزیراشرف خان حنفی مذہب اور چشتی مشرب کا ایک عظیم انسان ہیں،آپ علماء اور صلحاء کو بڑی محبت کرتے ہیں، بڑے دلدار اور سخی انسان ہیں،لوگوں کے ساتھ کسی بھی قسم کے مظالم سے کوسوں دور رہتے ہیں، خانقاہیں، مساجد، مدرسے اور تالاب وغیرہ بنوا بنوا کر لوگوں کے دل موہ لیتے ہیں، خاصی شیرین زبان آدمی ہیں، چھوٹوں سے پیار، بڑوں کی تعظیم وتکریم، علماء اور صلحاء سے لگاؤ اور ان کی قدر دانی جیسی صفات آپ کے دل میں چھپی ہوئی ہیں''(۱)

لشکروزیراشرف خان کے متعلق ڈاکٹر احمد شریف لکھتے ہیں کہ:

''لشکروزیراشرف خان صاحب چاٹگامی نژاد ایک زندہ دل مسلمان تھے، بمقام ساریہ (ہاٹہزاری، چاٹگام) میں آپ اور آپ کے خاندان کی پختہ عمارتوں کے کھنڈرات ابھی تک پائے جاتے ہیں، اس گاؤں میں آپ کا بنوایا ہوا ایک بڑا اور پرانا تالاب موجود ہے، علاوہ ازیں موضع قدل پور میں بھی ان کا بنوایا ہوا ایک پرانا تالاب ہے، جو ان کی طرف منسوب ہے''۔(۲)

رکانی مورخ جناب مرحوم وکیل خلیل الرحمن صاحب شتی مینا صفحہ ۲ تا ۵ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

'' اشرف خان راجہ سندسودھمہ (۱۶۵۲ء) کے عہد حکومت میں سپہ سالار تھے،جس کوراجا نے تلوار، ہاتھی، گھوڑے وغیرے عطا کئے تھے،انہوں نے ایک مسجد (خلیل

(۱) عبدالحق چودھری، بحوالۂ دولت قاضی۔

(۲) ڈاکٹر احمد شریف، بنگالی اور بنگلا ساھتیہ دوسری جلد، ص: ۴۴۴۔۴۴۵۔

صاحب کے مطابق) بنوائی تھی، جس کا خطیب سید قاضی عالم شاہ تھے، جن کے فیض روحانی سے عربی، رومی، مغل اور پٹھان قومیں ارکان میں مستفیض ہوئیں"۔(۱)

دراصل شتی مینالور چندرانی یہ ایک ترجمہ ہے، جب کہ اصل کتاب گوہری اور ٹیٹھ زبان میں لکھی گئی ہے، لشکر وزیر اشرف خان نے اسے بنگلا میں منتقل کرنے کی عرض قاضی دولت سے کی تو قاضی صاحب نے اسے لکھنا شروع کیا تھا۔

اس حوالے سے یہاں ایک بات عرض ہے کہ دراصل لشکر وزیر اشرف خان نے قاضی صاحب کو دیسی زبان میں منتقل کرنے کی عرض کی تھی، اب سوال آتا ہے کہ اس وقت ارکان کی دیسی زبان کون سی تھی، بنگلہ یا اور کوئی زبان؟؟ جواب یہ ہے کہ اس وقت چاٹگام بھی ارکان کا ایک عظیم حصہ تھا، تو ظاہر ہے کہ چاٹگامی اور حالیہ ارکانی مسلمانوں کی زبان ایک ہی ہے، ملک میں مسلمانوں کی اکثریت تھی، تو شاعر نے ان مسلمانوں کی زبان بنگلا (دراصل چاٹگامی زبان بھی ایک علاقائی بنگلا زبان ہے) میں تحریر کی تھی۔

پتہ چلا کہ لشکر وزیر اشرف خان باقاعدہ ایک وزیر بننے سے پہلے مشہور ارکانی راجا سری سودھمہ کے سپہ سالار تھے، یہ بات بعض مغربی مصنفین کی کتابوں میں بھی ملتی ہے، باوجودیکہ سارے مغربی مورخین نے نہ لشکر وزیر اشرف خان کا نام لیا اور نہ اس زمانے کے بادشاہ کا اسلامی نام لکھا، تاہم ان مورخین میں سے صرف من ریک نے اس وقت کے ارکانی بادشاہ کا نام سکندر شاہ ثانی لکھا ہے۔(۲)

---

(۱) اڈووکٹ خلیل الرحمن، تاریخ اسلام برماوارکان، ص:۴۸۔

(۲) Travels of fray Sabastien Manrique vol. 1,P.352

سپہ سالار بڑا ٹاکور

سرزمین ارکان کے قرشی، صدیقی النسب اور مایۂ ناز انسان لشکر وزیر بڑے ٹاکور (۱) ایک روایت کے مطابق روہانگ میں جب کہ دوسری روایت کے مطابق پٹیہ (چاٹگام) کے قریبی علاقہ چتر وشالہ میں پیدا ہوئے، ان کا خاندان اول بنگال کے غور میں آیا تھا، اس کے بعد چتر وشالہ میں ٹھہرا، بعدازاں ارکان کے دارالسلطنت مروہانگ (چاٹگام اس زمانے میں ارکان کا حصہ تھا) میں مستقل طور پر سکونت پذیر ہو گیا تھا۔ لیکن جو کچھ بھی ہو کہ بڑے ٹاکور کی تعلیم و تربیت اور نشوونما ارکان کے دارالحکومت مروہانگ میں ہوا تھا۔ لشکر وزیر بڑے ٹاکور ماگن ٹاکور (سپہ سالار اور وزیر اعظم ارکان) کے والد بزرگوار تھے، الاول کی مختلف تصانیف میں ان کا تذکرہ پایا جاتا ہے، الاول کے مطابق وہ ایک بلند اخلاق والے بزرگ تھے، ہمیشہ لوگوں کے دکھ سکھ میں شریک ہوا کرتے تھے، ایک صاحب علم ہونے کے ساتھ علماء، صلحاء سے لگاؤ رکھتے اور ان کا احترام کرتے تھے۔

لشکر وزیر بڑے ٹاکور ارکانی راجا نراپتی جی (۱۶۳۸ء۔۱۶۴۵ء) کے دور حکومت میں سپہ سالار تھے، وہ جس زمانے میں ارکانی افواج کے سپہ سالار تھے، اس زمانے کے پورے ارکانی مسلمانوں کی توجہ ان کی طرف تھی، یوں وہ یہاں کے مسلمانوں کے قومی رہنما بن چکے تھے، سیاست و قیادت سے خاصی دلچسپی رکھنے کے ساتھ بڑے نڈر، بہادر جواں مرد تھے، علاوہ ازیں یہ بھی پتہ چلا کہ وہ بڑے مدبر ہونے کے ساتھ نہایت عابد اور پرہیزگار بھی تھے، ہر ایک امر کو جذباتیات سے دور رہتے ہوئے حقیقت اور واقعیت کی بنیاد پر سوچا کرتے تھے، کہتے ہیں کہ ان کی ذات اعلی صفات میں بردباری اور حقیقت پسندی کے ساتھ امن پسندی اور انسانیت نوازی کوٹ کوٹ بھری ہوئی تھی، جہاں بھی جاتے لوگوں کے دل موہ لینے کی کوشش کیا کرتے تھے۔

---

(۱) میں نے الاول کی چند تصانیف کو کھنگالا، لیکن لشکر وزیر بڑے ٹاکور کا کہیں بھی اسلامی نام نہیں ملا۔

بہر حال لشکر وزیر بڑے ٹاکور نے ایک طویل مدت تک ارکان اور یہاں کے باشندوں کی خدمات انجام دیں، بالآخر اسی مذکورہ منصب میں رہنے کی حالت میں اس جہانِ فانی سے رخصت لی، اور مروہانگ کی زمین کو اپنے سینے سے لگالیا۔

پتہ چلا کہ لشکر وزیر بڑے ٹاکور کی وفات سے قبل ان کا لائق بیٹا لشکر وزیر قرشی ماگن ٹاکور ارکان کی قومی سیاست وقیادت کے افق پر درخشان ستارہ بن کر طلوع ہو چکا تھا، چنانچہ بڑے ٹاکور کی وفات کے فورا بعد ماگن ٹاکور کو ارکان کے سپہ سالار اعظم مقرر کیا گیا، پھر بڑی قلیل مدت میں ان کے ہاتھ پر وزارتِ عظمی کا منصب سونپا گیا، بعد ازاں ارکان کے تین تین بادشاہوں کے ادوار حکومت میں وہ اسی منصب پر جلوہ فرمارہے تھے۔

چتروشالہ (پٹیہ) سے آئے دن میرا گزر رہوتا رہتا ہے، چاٹگام سے کوکس بازار کی راہ پر یہ مقام آج بھی اسی نام پر ہے، یوں بھی تو ایک انسان کے لئے اپنے بزرگوں کی یاد وتذکار ایک سعادت کی بات ہوتی ہے، چنانچہ اورتو اور جبھی میرا اس مقام سے گزر ہوتا ہے، ان دونوں بزرگ ترین باپ بیٹے کی یاد آتی ہے، اللہ تعالی ان کی بال بال مغفرت فرمائے، آمین۔

وزیر اعظم سید موسی

وزیر اعظم سید موسی ارکان کے دار الحکومت مروہانگ میں پیدا ہوئے، پتہ چلا کہ آپ کا خاندان سلہٹ (بنگال) سے ارکان آیا، اور مروہانگ کے آس پاس کے علاقہ میں سکونت پذیر ہو گیا تھا، مورخین کے بیان کے مطابق وزیر اعظم سید موسی فاتح سلہٹ سید ناصر الدین سپہ سالار کے خاندان کا ایک فرزند تھے۔

سید موسی کی تعلیم، تربیت اور نشوونما اپنے پیدائشی علاقے میں ہوا، کہتے ہیں کہ ان کی تعلیم وتربیت ان کے والدین نے بڑی شان سے دلوائی تھی، چونکہ والد صاحب ایک متمول، باثروت و دولت آدمی تھے، چنانچہ انہوں نے اپنے بیٹے کی تعلیم وتربیت کے لئے وقت کے بڑے بڑے علماء و مدرسین کی خدمات حاصل کی تھیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ ماگن ٹاکور کے انتقال کے فورا بعد سید موسی سندسودھمہ کے عہد حکومت میں وزیر اعظم بنے تھے، شاعر الاول نے اپنے مشہور دیوان، سیف الملوک بدیع الجمال کی تکمیل ۱۶۶۹ء میں سید صاحب کی فرمائش اور خواہش پر کی تھی، چنانچہ حضرت الاول کا بیان ہے کہ:

> "سید موسی بہت بڑے انسان ہیں، جسمانی اعتبار سے بڑے ہی خوبصورت ہیں، جس طرح ان کے ظاہر خوبیوں کا ایک حسین پیکر ہے، اسی طرح ان کے باطن بھی رعنائیوں کا مرقع ہے، وہ ہم جیسے سن رسیدہ انسان کو ایک طالب علم کی طرح پیار کرتے ہیں، ایک روز مجھے انہوں نے دربار میں بلایا اور فرمایا کہ آپ کے استاد و مربی ماگن ٹاکور مرحوم میرے گہرے دوست تھے، جو علم وعمل سے متصف ایک بڑے انسان تھے"۔(۱)

---

(۱) ڈاکٹر احمد شریف، بنگالی اور بنگلا ساھتیہ، ص: ۴۸۳۔ بحوالہ الاول۔

سید موسی کے متعلق مرحوم وکیل خلیل الرحمن صاحب رقمطراز ہیں کہ:

''سلیمان، مجلس اور سید موسی بھی ستارھویں صدی عیسوی کے اوائل میں معزز وزرائے دربار ارکان گذرے تھے، اور یہ بھی حفظ شریعت اور ارکانی مسلمانوں کی تعلیم و تربیت اور اصلاح کے خواہاں تھے، چنانچہ انہوں نے (سید موسی) سید صاحب (الاول) موصوف کے ذریعے ''تحفۃ النصائح'' اور ''آنند برما'' اور ''سکندر نامہ'' کے ترجمے یا تصنیف کروائے تھے، مذکورہ بالا ہر ایک کتاب میں تاریخ ارکان کی کچھ جھلک نظر آتی ہے''۔(۱)

سید موسی نے ارکانیوں کی بڑی بڑی خدمات انجام دیں، وہ بڑے نیک اور علم و علماء دوست انسان تھے، انہوں نے اس سرزمین میں طویل مدت تک قومی وملی خدمات انجام دیتے ہوئے مروہانگ میں وفات پائی، اور اس سرزمین کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ اللہ تعالی ان کی مغفرت فرمائے، آمین۔

(۱) اڈووکٹ خلیل الرحمن، تاریخ اسلام برما وارکان، ص ۴۷۔۴۸،

وزیر اعظم مجلس

الاول کے مشہور دیوان سکندر نامہ کے بیان کے مطابق ارکانی راجا سندھ سودھمہ کے عہد حکومت میں مجلس ارکان کے وزیر اعظم تھے، وہ وزیر اعظم سید موسی کے بعد ۱۶۷۳ء میں وزیر اعظم کے منصب پر فائز ہوئے، ایک روایت کے مطابق انہوں نے اس عہدۂ جلیلہ کا ۱۶۷۳ء میں خلف لیا، الاول کے مطابق وہ شیریں سخن و پنڈٹ اور گیانی ہونے کے علاوہ شعر وسخن سے لگاؤ رکھنے والا انسان بھی تھے۔

مجلس ارکان میں پیدا ہوئے، یہیں ان کا نشو ونما ہوا، یہاں ان کا خاندان عرصہ دراز سے صاحب اثر و رسوخ خاندان رہا تھا، اس خاندان کے بہت سارے افراد سلطنت ارکان کے اعیان میں سے تھے، یہ بڑا علم دوست خاندان تھا، مجلس کی تعلیم وتربیت ارکان ہی میں ہوئی تھی، بڑے ہوئے تو سیاست و قیادت سے منسلک ہو گئے تھے، بڑے ذہین اور طباع انسان تھے، فہم و بصیرت کے اعتبار سے یکتائے روزگار تھے۔

الاول کے مطابق مجلس ایک جلیل القدر پنڈٹ اور گیانی ہونے کے ساتھ بڑے عالم دوست بھی تھے، وہ سید موسی کے بعد ارکان کے قومی رہنما بنے، انہوں نے سلطنتِ ارکان کے گوشے گوشے سے علماء، فضلاء، انشاپرداز اور شعراء کو دارالسلطنت میں بلا کر جمع کیا، اور ہر ایک کو علمی، تعلیمی اور ثقافتی خدمات میں لگا دیا تھا، کہتے ہیں کہ ان کا ایک خاص علمی دربار تھا، جس میں وہ بذات خود شریک ہوا کرتے تھے، اور علماء وفضلاء کو اپنی اپنی کاوشوں کے نتیجے میں تمغے اور تحائف سے سرفراز کرتے تھے۔

اس سلسلے میں الاول بھی ان کے خاص کرم سے مستفید ہوئے تھے، چنانچہ الاول نے ان کی گزارش پر خاصی ثقافتی خدمت انجام دی تھی۔ وزیر اعظم مجلس بذات خود ایک بلند پایہ کے شاعر تھے، ویسے شعر وسخن کے بڑے دلدادہ بھی، اور جہاں تک پتہ چلا کہ وہ مالدار ہونے کے ساتھ سخی بھی تھے، ان کی سخاوت کا یہ عالم تھا کہ ان کے دربار میں غریب مسکین سب آتے تھے، اور کسی کو بھی خالی ہاتھ جانے نہیں دیتے تھے۔ انہوں نے ارکان میں وفات پائی، اور مروہانگ میں مدفون ہیں۔

وزیرخزانہ محمد سلیمان

محمد سلیمان کی پیدائش ایک روایت کے مطابق چوکپرو میں ہوئی تھی، ان کا خاندان ایک تاجر خاندان تھا، تجارت ان کو آبائی ورثہ میں ملی تھی، محمد سلیمان کی تعلیم وتربیت ایک روایت کے مطابق ان کے اپنے علاقے میں ہوئی، جب کہ ایک روایت یہ بھی ہے کہ انہوں نے ابتدائی تعلیم علاقے میں پاکر دارالحکومت مروہانگ کا رخ کیا، جہاں ان کی اعلیٰ تعلیم ہوئی تھی، بہرحال تعلیم سے فراغت کے بعد انہوں نے تجارت سے منسلک ہونے کے ساتھ سیاست سے دلچسپی لی، حکومت کے مختلف عہدوں پر کام کرتے کرتے بالآخر سندھ سودھمہ کے عہد حکومت میں مرکزی وزیرخزانہ مقرر ہو گئے تھے، محمد سلیمان الاول کے دیوان ''تحفۃ النصائح'' اور ''تکملۂ شتی بینا'' کے مطابق راجا سندھ سودھمہ کے عہد حکومت میں ارکان کا وزیرخزانہ تھے، اور اس منصب جلیلہ پر ۱۶۵۹ء سے لے کر ۱۶۶۴ء تک مسلسل بحال تھے۔

الاول نے اپنے دیوان ''تحفۃ النصائح'' میں محمد سلیمان کا تذکرہ کیا ہے، اسی طرح ''تکملۂ شتی بینا'' میں بھی ان کی مدح سرائی کی ہے، وہ ایک روایت کے مطابق علم دوست اور علماء پسند انسان تھے، علماء اور صلحاء کا خاص خیال رکھا کرتے تھے، اگرچہ یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ آیا وہ عالم بھی تھے کہ نہیں، لیکن اتنا ضرور پتہ چلا کہ وہ اپنے زمانے کے ایک گیانی اور پنڈٹ ہونے کے ساتھ بڑے صاحب اقتدار انسان تھے۔

محمد سلیمان ایک مالدار انسان ہونے کے ساتھ بڑے فراخ دل اور سخی تھے، کہتے ہیں کہ انہوں نے اپنے اموال علماء، صلحاء اور طالب علموں پر نہایت فراخ دلی کے ساتھ خرچ کئے تھے، چنانچہ انہوں نے اپنی سخاوت کے ذریعے ملک بھر میں کافی نام پیدا کیا تھا، آخر کا انہوں نے ارکان میں وفات پائی، اور ارکان کی سرزمین کو سینے سے لگالیا۔

سپہ سالار سید میر محمد خان

الاول کے دیوان ''ہفت پیکر'' کے مطابق سید میر محمد خان سندھ سودھمہ کے عہد حکومت میں سپہ سالار تھے، شاعر کے بیان کے مطابق ۱۶۶۳ء میں وہ اس عہدۂ جلیلہ پر فائز تھے۔

سید میر محمد خان کا تعلق غالبا قیم (ممبرا) کے سادات خاندان سے تھا، وہ ارکان میں پیدا ہوئے، اور ان کی تعلیم وتربیت بھی ارکان ہی میں ہوتھی، تعلیم وتربیت سے فراغت کے بعد وہ فوج میں بھرتی ہو گئے، وہ بڑے بہادر اور جفاکش انسان تھے، چنانچہ ترقی کے مختلف مدارج طے کرتے ہوئے سندھ سوھمہ کے عہد حکومت میں سپہ سالار کے عہدہ پر فائز ہوئے، الاول کے مطابق انہوں نے اس عہدہ کا خلف ۱۶۶۲ء میں لیا تھا، کہتے ہیں کہ میر سید محمد خان بڑے زیرک اور ہشیار سپہ سالار تھے، انہوں نے سلطنت کے گوشے گوشے سے مسلم نوجوانوں کی ایک خاصی تعداد کو فوج میں بھرتی کر لیا تھا، اور بہادروں کو ان کی بہادری کے صلے میں فوج کے مختلف بلند عہد ہائے جلیلہ پر فائز کر دیا تھا۔

ایک طرف فوجی اعتبار سے سید میر محمد خان ایک نامور جرنیل گزرے ہیں، انہوں نے اس زمانے کے مطابق ایک جدید اور مرتب فوج تشکیل دی تھی، جس کی خاصی شہرت بھی ہو چکی تھی، دوسری طرف وہ زیرک سیاست دان بھی تھے، ساتھ ہی ساتھ مالدار تھے مگر سخی، اور گیانی ہونے کے ساتھ علماء دوست بھی، راجا سندھ سودھمہ ان پر فخر کیا کرتا تھا، اور ان کو ایک وفادار جرنیل مانتا تھا، اور انہوں نے بھی راجا کے ساتھ کبھی بے وفائی نہیں کی تھی۔

سید میر محمد خان نے سلطنت ارکان کے گوشے گوشے میں فوجی چھاونیاں قائم کی تھیں، وہ اتنے جفاکش تھے کہ ارکان کے جنگلوں میں جہاں جہاں فوجی چھاونیاں تھیں معاینہ کے لئے خود جایا کرتے تھے، اور سرحد کی نگہبان فوج پر خاصی نظر رکھتے تھے، ایک روایت کے مطابق بڑھاپے میں بھی وہ اس عہدہ پر مسلسل بحال تھے، بہرحال انہوں نے ایک طویل مدت تک اس عہدہ پر بحال رہتے ہوئے وفات پائی۔

سپہ سالار برہان الدین خان

ارکانی افواج کے سپہ سالار برہان الدین خان کی پیدائش جنوبی چاٹگام کے مشہور علاقہ بانس خالی کی بستی جلدی میں ہوئی، ان کا خاندان ایک مالدار اور زمیندار خاندان تھا، ان کے خاندان کے بہت سارے افراد ارکانی حکومت کے شریک کار تھے۔ برہان الدین خان کی تعلیم وتربیت بانس خالی کے بعد چاٹگام میں ہوئی تھی، دراں حالیکہ چاٹگام سلطنت ارکان کا ایک عظیم حصہ تھا، تعلیم سے فراغت کے بعد انہوں نے تجارت اور سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا، اور مشہور روایت ہے کہ پورے چاٹگام میں اس دور کے وہ نمایاں تاجر تھے۔ بعد میں انہوں نے فوجی خدمات سے دلچسپی لینی شروع کر دی، بالآخر وہ فوج میں بھرتی ہوگئے، اور آہستہ آہستہ اعلی سے اعلی مناصب پر فائز ہوتے رہے تھے، اس کے بعد انہوں نے دارالحکومت مروہانگ میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔

برہان الدین نے دارالسلطنت میں رہ کر ارکانی فوج کو ایک جدید فوج میں تبدیل کرنے کی کوشش شروع کی، جس میں وہ کامیاب ہوگئے، چنانچہ ان کی بعض نمایاں خدمات کے صلے میں ارکانی راجا تھاڈومنترا نے انہیں سپہ سالار عظمی مقرر کر دیا تھا، ارکانی شاعر نصر اللہ خان کے دیوان ''شریعت نامہ'' کے مطابق ان کے آباء میں ایک سپہ سالار تھا، انہوں نے اس قابل قدر سپہ سالار کا نام برہان الدین لکھا ہے، شاعر نصر اللہ کے مطابق برہان الدین نے ایک زبردست فوج تشکیل دی تھی، جناب عبدالحق چودھری کے مطابق تھاڈومنترا کے عہد حکومت میں برہان الدین ہی سپہ سالار تھے۔

برہان الدین ایک فوجی عبقری تھے، فوج کے نظم ونسق کے حوالے سے وہ ایک ذی استعداد سپہ سالار تھے، چنانچہ ایک طویل مدت تک سپہ سالار رہتے ہوئے انہوں نے ارکان میں وفات پائی۔

یاد رہے کہ ہمارے قومی شاعر حضرت الاول تھاڈومنترا کے عہد حکومت میں ارکان پہنچے تھے، برہان الدین خان کا خاندان جنوبی چاٹگام کے علاقہ بانس خالی کی بستی جلدی میں رہائش پذیر تھا(۱)

(۱) نصر اللہ خان، شریعت نامہ، ص: ۹۱، مطبوعہ زیر اشراف عبدالکریم ساھتیہ بیشارد۔

سپہ سالار سید محمد عالم

سید محمد عالم کی پیدائش ۱۶۳۵ء کے لک بھگ بمقام کوالونگ ہوئی، ظاہر ہے کہ وہ سیدزادہ تھے، اوران کے خاندان کے بزرگوں نے عرصۂ دراز تک اس علاقے میں دین ودعوت کا کام انجام دیا تھا، ان کے خاندان میں بہت سارے علماء اور مشائخ گزرے تھے، اور محمد سید عالم بھی ایک گیانی انسان تھے۔

سید محمد عالم کی تعلیم وتربیت خاندان کے بزرگوں کے ہاتھوں ہوئی تھی، تعلیم مکمل کرنے کے بعد ارکانی فوج میں بھرتی ہوگئے، ترقی کے مختلف مراحل طے کرتے ہوئے آخر کار سپہ سالار بن گئے، کہتے ہیں کہ شہزادہ شجاع جس وقت ارکان آیا تھا اس وقت محمد سید عالم ارکانی فوج کے سپہ سالار تھے، شہزادہ کے قتل اور اس کے بعد ارکانی مسلمانوں پر ہونے یا کئے جانے والے مظالم کے خلاف محمد سید عالم نے سخت احتجاج کیا تھا، حتی کہ ان کو بغاوت کی راہ لینی پڑی تھی، چنانچہ کہتے ہیں کہ شہزادہ شجاع کے قتل کے بعد محمد سید عالم نے بشمول اپنے بہت سارے ساتھیوں کے جنگل کا رخ کیا، اور راجا کے خلاف مزاحمتی کاروائیاں بھی شروع کر دی تھیں۔

آخر کار محمد سید عالم نے ایک زبردست فوج کی تشکیل بھی دی تھی، اور ارکانی راجا سے باقاعدہ جہاد کا بھی اعلان کر دیا تھا، لیکن افسوس ہے کہ ان کو ناکامی کا چہرہ دیکھنا پڑا تھا، اس وقت کے علماء ومشائخ نے ان کا بھرپور ساتھ دیا تھا، جس کی پاداش میں ارکان کے بہتوں علماء اور مشائخ گرفتار کر لئے گئے تھے، جن میں سے اکثر کو ارکانی راجا کے حکم سے شہید کر دیا گیا تھا۔

بہر حال محمد سید عالم نے عرصۂ دراز تک ارکانی راجا کے خلاف علم جہاد بلند رکھا تھا، آخر کار پہاڑوں کے ایک ڈھلوان سے دوسرے ڈھلوان کے چکر کاٹتے ہوئے ان کا انتقال ہوگیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

سپہ سالار علی بائنگ

ارکانی فوج کے سپہ سالار جنرل علی بائنگ صاحب کی ولادت بندر کے ایک معزز مسلم گھرانے میں ہوئی ،روایت ہے کہ ان کا والد ایک ارکانی فوجی تھے،ان کی تعلیمی زندگی کے حالات تو معلوم نہ ہوسکے،البتہ بعض روایت کے مطابق علی بائنگ ایک تعلیم یافتہ دانشوران تھے،بڑے ہوئے تو وہ فوج میں بھرتی ہو گئے،فوج میں ترقی کے مختلف مدارج طے کرتے ہوئے سپہ سالار کے عہدے پر فائز ہو گئے تھے،یاد رہے کہ ان کی سپاہیانہ جنگی حکمت عملیوں کی بہت ساری باتیں ہم نے بزرگوں کی زبانی سن رکھی ہیں، جن کے مطابق وہ ایک بہادر، نڈر اور بڑے ہشیار و مدبر مسلم سپہ سالار تھے۔

ہماری نانیہال کی بستی بانگونہ (علی چنگ، بوسیدنگ) کے جنوب مغرب کے پہاڑی سلسلے سے تقریباً کٹا ہوا ایک ٹیلہ موجود ہے، جسے مقامی لوگ اب بھی علی بائنگ کا ٹیلہ کہتے ہیں، ہم نے بزرگوں سے سنا کہ یہ وہ ٹیلہ ہے جس پر جنرل علی بائنگ نے ایک مضبوط فوجی قلعہ بنایا تھا، اور مدت دراز تک انہوں نے وہاں قیام کیا تھا، ہمارا بارہا وہاں جانا ہوا تھا، ہم نے دیکھا کہ اب بھی اس قلعہ کے کھنڈرات موجود ہیں۔

کہتے ہیں کہ جنرل علی بائنگ ایک دین دار اور خدا ترس سپہ سالار تھے،علماء و مشائخ کے ساتھ جوڑے رہتے تھے،ساتھ ہی ساتھ بڑے مالدار تھے لیکن بڑے سخاوت پسند،انہوں نے اپنی آبائی بستی بندر میں ایک پختہ مسجد بھی بنوائی تھی، نہ جانے اس مسجد کا اب کیا حال ہے، علی بائنگ نے اپنی آبائی بستی میں انتقال کیا اور وہیں مدفون ہیں۔

وزیر خزانہ شوے بنیا

ارکان کے وزیر خزانہ شوے بنیا بمقام بندر ایک مسلم گھرانے میں پیدا ہوئے، کہتے ہیں شوے بنیا کا

ایک اسلامی نام بھی تھا، انہوں نے دینی تعلیم کے ساتھ عصری تعلیم بھی حاصل کی تھی، تعلیم مکمل کرنے کے بعد انہوں نے تجارت سے دلچسپی لی حتی کہ اس میدان میں انہوں نے بڑا نام پیدا کیا تھا۔

کہتے ہیں کہ شوے بنیا نے تجارت کے ساتھ ساتھ ارکانی سیاست اور حکومت کے کاموں سے بھی دلچسپی لی تھی، بالآخر وہ باجیڈو کے عہد حکومت کے وزیر خزانہ مقرر ہو گئے تھے۔

شوے بنیا صاحب ایک دیندار، امانت دار اور سخی انسان تھے، قصبۂ بندر میں انہوں نے ایک پختہ مسجد بنوائی تھی، یہاں ان کا انتقال ہوا، اور یہیں کی خاک میں مدفون ہیں۔

سپہ سالار بومن

سپہ سالار بومن صاحب سترھویں صدی میں ارکان کی ہلدی فارہ نامی بستی کے مسلم گھرانے میں پیدا ہوئے، وہ اپنے خاندان کا چشم و چراغ تھے، تعلیمی زندگی سے فراغت کے معا بعد سرکاری نوکری لی، بعد میں وہ ارکانی فوج میں بھرتی ہو گئے، ترقی کے مختلف مدارج طے کرتے ہوئے سپہ سالار بن گئے، کہتے ہیں کہ ان کو مدارس و مساجد کی تعمیر کا بڑا شوق تھا، یوں انہوں نے کئی مدارس و مساجد بھی تعمیر کیں، علاوہ ازیں ان کی دیگر خدمات کا بھی تذکرہ ملتا ہے، آخر کار انہوں نے ارکان اور یہاں کے مسلمانوں کی مختلف خدمات انجام دے کر اس جہان فانی سے رخصت لی، دعا ہے کہ اللہ تعالی ان کی مغفرت فرمائے۔

سپہ سالار ریلھا قیمی

سپہ سالار ریلھا سترھویں صدی عیسوی میں علاقۂ ممبرا (ارکان) کی معروف و مردم خیز بستی قیم کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے، ان کی تعلیم بھی علاقے میں ہوئی، تعلیم سے فراغت کے بعد وہ ارکانی فوج میں بھرتی ہو گئے، چنانچہ ترقی کے مختلف مدارج طے کرتے ہوئے سپہ سالار بنے، ان کے متعلق

ارکانی مورخ اڈووکٹ خلیل الرحمن صاحب نے بس اتنا ہی لکھا کہ ریلھا ستارھویں یا اٹھارھویں صدی عیسوی میں ایک ارکانی مسلم سپہ سالار تھے۔

صوبیدار حاجی علی خان

انیسویں صدی کے اوائل میں حاجی علی خان المعروف بہ بدو بدھیہ ارکان کے ایک مسلم گھرانے میں پیدا ہوئے، انہوں نے ارکان ہی میں تعلیم پائی، تعلیم سے فراغت کے بعد فوج میں بھرتی ہوگئے، ترقی کے مدارج طے کرتے ہوئے صوبیدار بنے تھے۔

فوج سے ریٹائر ہونے کے بعد انہوں نے حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ منورہ کی سعادت حاصل کی، اس کے بعد وطن آکر سیاست سے دلچسپی لی، حکومت کے مختلف مناصب پر فائز رہے تھے، ان کے دیگر کارناموں کا تو پتہ نہ چلا، تاہم ان کی تعمیر کردہ ایک مسجد آج بھی ان کی یادگار ہے۔

ملک التجار اوجی

ارکان کے معروف ومشہور مسلم تاجر اوجی (شاید ان کا ایک مسلم نام بھی تھا اور اوجی ان کا خطاب ہو) قبضہ قیم میں پیدا ہوئے، کہتے ہیں کہ ان کے والد مرحوم بھی ایک دین دار اور پرہیزگار نامور تاجر تھے، اوجی کی تعلیم ارکان کے حالیہ دار الحکومت اکیاب میں ہوئی، انہوں نے اردو فارسی کے علاوہ انگریزی میں بھی خاصی مہارت حاصل کرلی تھی۔

تعلیم سے فراغت کے بعد وہ اپنے والد کے ساتھ تجارت میں لگ گئے تھے، چنانچہ انہیں برمی راجا باجیڈو کے عہد حکومت میں ملک التجار کا خطاب ملا تھا، علاوہ ازیں اوجی ایک منجھے ہوئے سیاست دان بھی تھے، وہ عبد الکریم معروف بہ شجاع قاضی کے مشیر خاص ہونے کے ساتھ تجارت میں ان کے

شریک بھی تھے، مسٹر رابرٹسن نے اپنی کتاب میں عبد الکریم شجاع قاضی کے ساتھ اوجی کے خاندان کا تذکرہ کیا ہے، جس سے پتہ چلا ہے کہ اوجی ایک ذی ثروت تاجر ہونے کے ساتھ ایک زیرک سیاست دان بھی تھے، جن کے تجارتی اموال برما کے علاوہ ہندو بنگال کے مختلف علاقہ جات تک پہنچتے تھے۔

اوجی کو برمی راجا نے ایک زرین تاج بھی عطا کیا تھا، جسے پہن کر بلا روک ٹوک وہ دربار شاہی میں حاضر ہوسکتے تھے، اور ایک روایت کے مطابق برمی شاہی دربار میں ان کی بڑی پذیرائی ہوتی تھی، بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ اوجی کے تجارتی اموال تھائی دار الحکومت بنکاک تک پہنچتے تھے، وہ بری اور بحری دونوں راستوں سے تجارت کرتے تھے۔

باجیڈو کے عہد حکومت میں ارکانی مسلمانوں پر برمی مظالم کی آگ برسنی شروع ہوئی تو اوجی نے شجاع قاضی سے مشورہ کرکے انگریزی حکومت کو ارکان پر قبضہ کرنے کی دعوت دی تھی، کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ برمی ایک وحشی اور غیر متمدن قوم ہے، اس وحشی قوم کی بنسبت انگریز حکومت ارکان اور ارکانیوں کے لئے مفید ثابت ہوگی۔

اس دور میں اوجی کے علاوہ بھی چند بڑے بڑے ارکانی تاجروں کے تذکرے ملتے ہیں، جن میں سے چند تاجروں کے اسمائے گرامیاں درج ذیل ہیں:

(۱) شیر جہازی، ساکن بندر، ارکان۔

(۲) واعظ الدین معروف بہ غم یم۔

(۳) خان آور۔

(۴) محمد موسی معروف بہ چوکھے۔

(۵) محمد اسحاق جوہری قیمی۔

تیسرا باب

ارکان کے چند علماء، صلحاء اور مشائخ عظام

حضرت محمد ابن الحنفیہ رحمۃ اللہ علیہ

حضرت محمد ابن الحنفیہ کی ولادت باسعادت ۲۱ھ میں ہوئی، آپ کو محمد الاکبر بھی کہا جاتا ہے، آپ حضرت سیدنا امیر المومنین علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ الکریم کی دوسری اہلیہ حضرت خولہ بنت جعفر بن قیس بن مسلمہ کے بطن سے ہیں، تاریخ میں آپ ابن الحنفیہ کے نام سے معروف ومشہور ہیں۔

بعض شیعہ فرقوں کی رائے یہ ہے کہ سیدنا امامنا حضرت حسین علیہ السلام کی شہادت حسرت آیات کے بعد حضرت محمد ابن الحنفیہ رحمۃ اللہ علیہ ہی امام تھے، ان شیعہ فرقوں میں بطور خاص ''فرقۂ کیسانیہ'' اس دعوی پر مصر ہے، حضرت محمد ابن الحنفیہ رحمۃ اللہ علیہ نے سیدنا علی ابن ابی طالب کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے بہت سارے جنگی مہمات میں شرکت کی تھی، آپؒ بعض معرکے میں بحیثیت سپہ سالار بھی شریک ہوئے تھے۔(۱)

بعض مورخین کے مطابق حضرت سیدنا حسین علیہ السلام کی شہادت کے بعد حضرت محمد ابن الحنفیہ یزید کے خلاف جنگ لڑنے پر مصر تھے، لیکن بعض حضرات کبار صحابیوں کے مشورے سے آپ نے اپنی رائے پر نظر

(۱) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو محمد رضا کی تصنیف ''الامام علی ابن ابی طالب رابع الخلفاء الراشدین'' ص:۶-۸۔

ثانی کی، اگرچہ آپ یزید کے خلاف جنگ لڑنے سے باز آئے، لیکن آپ نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اب سرزمین اسلام کے احاطے سے باہر نکل جائیں گے، یوں آپ نے اپنے متبعین ومجاہدین کی ایک بڑی جماعت سمیت مشرق بعید کی طرف نکل گئے، چنانچہ بعض روایت کے مطابق بحری راستے سے آپ ارکان آپہنچے تھے۔

بعض مورخین نے (جنھوں نے داستان سرائی کے انداز میں اپنی تصانیف لکھی ہیں) اس حوالے سے طول طویل داستانیں لکھی ہیں، جن میں ارکانی شاعر محمد خان کی داستان ''حنیفہ کی لڑائی'' اور شاہ بارود خان کی داستان ''حنیفہ اور خیرہ پری/کیا پری'' ناقابل فراموش داستانیں ہیں، ان داستان سراؤں کی داستان سرائی اگرچہ اصول فن تاریخ کے نقطۂ نظر سے تنقید سے بالاتر نہیں ہے، لیکن اس بات میں کسی قسم کے شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ ان داستانوں کے تہ میں کچھ حقائق بھی مضمر ہیں، چنانچہ ان داستانوں کے متعلق مورخ محترم مرحوم پروفیسر محمد حبیب اللہ صاحب کا خیال ہے کہ:

> ''ویسے شاہ بارود خان اور محمد خان کی داستانوں میں اگرچہ خیالی پروازیاں بھی ہیں، لیکن کہانی کے روپ میں حقائق بھی مضمر ہیں، شاہ بارود خان کی داستان میں اسلام کے چوتھا خلیفہ حضرت سیدنا علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کے بیٹا حضرت محمد ابن الحنفیہ کا شاہی رام راجا سے جنگ، بالآخر حضرت موصوف کی فتح کے بعد خیرہ پری سے آپ کی شادی، پھر دھرمیک راجا کے اسلام میں داخل ہونے کی طول طویل کہانی موجود ہے، اسی طرح محمد خان کی داستان ''حنیفہ کی لڑائی'' میں جوگن بی بی کا خیرہ پری کو گرفتار کرنا، روہانگ میں محمد ابن الحنفیہ کی لڑائی کے بعد خیرہ پری کی رہائی، اس کے بعد خیرہ پری سے محمد ابن الحنفیہ کی شادی وغیرہ جیسی کہانیاں موجود ہیں، اس سلسلے میں یاد رہے کہ حالیہ بنگلا دیش کے تقریباً آخری مشرقی سرا ٹیکناف کے علاقے میں شاہی فریر دیپ نامی ایک مقام ہے، ادھر حالیہ ارکان کا مشہور سرحدی شہر منگڈو کی مشرقی جانب ایک دوڑتا ہوا پہاڑی سلسلہ موجود ہے، اس پہاڑی سلسلے میں دو چوٹیاں ہیں، جن میں ایک چوٹی کا نام ''حنیفا رٹونگی'' جب کہ دوسری چوٹی کا نام ''خیرہ پریرٹونگی'' ہے،

طویل عرصے تک یہ دونوں چوٹیاں زیارت گہِ خاص و عام تھیں، اب بھی انہیں ناموں سے یہ چوٹیاں معروف ہیں، چنانچہ ان تمام شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ ان مذکورہ دونوں شاعروں کی داستانوں میں کچھ حقائق بھی موجود ہیں، اور مذکورہ بالا چیزیں ان دونوں شاعروں کی داستانوں کی حقیقت کا بین ثبوت بھی ہیں''۔(۱)

ان دونوں مذکورہ داستان سراؤں کے علاوہ مقامی لوگوں میں یہ روایت بھی عام ہے کہ حضرت محمد الاکبر معروف بہ محمد ابن الحنفیہ رحمۃ اللہ علیہ واقعۂ کربلا کے بعد مشرق کی جانب نکل آئے تھے، اور دعوت و جہاد کے سلسلے میں اول شاہی پریر دیپ میں قدم رکھے، یہاں ایک مہاراجا کی حکومت تھی، آپ کی تشریف آوری کے دوران یہاں ایک واقعہ یہ پیش آیا کہ مہاراجا کی ایک بیٹی ''خیرہ پری'' کو ارکانی راجا نے ہڑپ کر لے گیا تھا، اب شاہی فریر دیپ کے مہاراجا نے محمد ابن الحنفیہ سے گزارش کی کہ : آپ ایک عظیم مجاہد ہیں، آپ چاہیں تو اس ظالم سے میری بیٹی کو نجات دلا سکتے ہیں، تو ظاہر ہے کہ محمد ابن الحنفیہ ایک داعی اور مرد مجاہد تھے، اور مہاراجا بھی آپ کا ساتھ تھا، چنانچہ ایک طرف دعوت و جہاد کا شوق وولولہ تو دوسری طرف آپ کی آنکھوں کے سامنے اس ارکانی (حالیہ) راجا کے مظالم، مزید برآں آپ سے شاہی فریر دیپ والے مہاراجا کی گزارش، یوں آپ نے ارکانی ظالم سے جنگ لڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا، چنانچہ مجاہدین کی ایک بھاری جماعت سمیت ارکانی ظالم راجا پر حملہ کر دیا تھا۔

کہتے ہیں کہ جن ارکانیوں نے راہِ فرار اختیار کی تھی ان کے متعلق حضرت محمد ابن الحنفیہ سے پوچھا گیا تھا کہ ''انہیں کیا کیا جائے؟ تو آپ نے فرمایا کہ ''تھم''، یعنی انہیں پھر دیکھا جائے گا، چنانچہ کہتے ہیں کہ آج کل ارکان اور بنگلا دیش کی سرحدی پہاڑیوں میں جو چکمہ نامی لوگ پائے جاتے ہیں، یہ وہی ہیں جن کے متعلق حضرت محمد ابن الحنفیہ نے ''تھم'' کہا تھا۔

محمد ابن الحنفیہؒ نے ارکانی ظالم راجا کے خلاف سخت جنگ لڑی تھی، بالآخر فتح و کامرانی نے آپ کا قدم چوما تھا، چنانچہ اس جنگ میں ارکانی ظالم کی بہت ساری افواج مارے گئے اور بہتوں نے راہ فرار اختیار

(۱) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: پروفیسر محمد حبیب اللہ، روہنگیا ذاتر ایتی ہاش۔

کی، اور ارکانی ظالم راجا سمیت بہت ساری افواج گرفتار ہوئی تھیں، اس جنگ کے نتیجے میں خیرہ پری کی بازیابی ہوئی تو وہ اور اس کے والد مہاراجۂ شاہی پریر دیپ نے اسلام قبول کر لیا تھا، بعد ازاں روایت یہ بھی مشہور ہے کہ خیرہ پری کے اسلام قبول کرنے کے بعد اس سے محمد ابن الحنفیہؒ کا نکاح ہوا، جس کے بعد یہ دونوں میاں بیوی ''خیرہ پریر ٹونکی'' نامی پہاڑی چوٹی میں عبادت الٰہی میں یکسو ہو گئے تھے۔

مقامی روایت کے مطابق حضرت محمد ابن الحنفیہؒ اپنی اہلیہ سمیت ایک طویل عرصہ تک اس مذکورہ پہاڑی چوٹی پر عبادت الیہ میں غرق تھے، اس کے بعد آپ اپنی اہلیہ سمیت حجازِ مقدس پہنچے، اور اپنی آخری عمر وہیں گزار کر بالآخر ۸۱ھ میں مدینہ منورہ میں انتقال فرمایا۔

مورخین کا ماننا ہے کہ اس اسلامی جہاد کے نتیجے میں یہاں ارکان میں ایک اسلامی حکومت قائم ہو چکی تھی، ویسے بعض مورخین کا یہ بھی خیال ہے کہ دراصل ارکان میں سب سے پہلی یہی اسلامی حکومت قائم ہوئی تھی، جو محمد ابن الحنفیہ کے جہاد اسلامی کا منطقی نتیجہ تھی، چنانچہ ان تاریخی روایات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ سرزمین ارکان میں اسلامی حکومت کا آغاز محمد ابن الحنفیہؒ کی دعوت اور آپ کے جہاد اسلامی کے نتیجے میں ہوا تھا، اسی لئے کہتے ہیں کہ یہاں کے مسلمانوں کے مزاج میں دعوت اسلامی کے ساتھ جہادی اسپرٹ بھی موجود ہے، اسی لئے یہاں کے مسلمان بڑے بہادر، نڈر اور جہاد اسلامی کے جذبے سے سرشار ہوتے ہیں، ظاہر ہے کہ یہاں کے مسلمانوں پر تاریخ کے مختلف ادوار میں مظالم ڈھائے گئے، جن کا سلسلہ اب تک جاری ہے، لیکن یہاں کے مسلمانوں نے کبھی اور کسی بھی حال میں ظالموں سے سمجھوتہ نہیں کیا، ہر حال میں ظالموں کے سامنے جھکنے کے بجائے حق کا علم بلند کرتا رہا تھا، الحمد للہ اس کا سلسلہ اب بھی جوں کا توں جاری ہے۔

قاضی القضاۃ حضرت شیخ شاہ مسعودؒ

سرزمین ارکان کے قاضی القضاۃ حضرت شاہ مسعودؒ کی پیدائش دارالحکومت مروہانگ کے قصبہ بندر میں ہوئی، آپ کا خاندان ایک علمی اور روحانی خاندان تھا، رشد وہدایت تعلیم وتدریس اور تبلیغ دین کے حوالے سے ارکان بھر میں آپ کے خاندان کے نمایاں کارنامے تھے، الاول کے بیان سے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ آپ کا خاندان ارکان میں دین ودعوت کے اعتبار سے نہایت مشہور تھا۔

شیخ مسعود کی ابتدائی تعلیم خاندان کے بزرگوں کے پاس ہوئی، اعلی دینی تعلیم کے سلسلے میں آپ نے بنگال اور ہندوستان کا سفر کیا، اور علم وعمل کے ایک جہاں سمیٹے ارکان واپس آئے تھے۔ آپ کی علمی صلاحیت وقابلیت کا اندازہ حضرت الاول کی تصانیف سے نہیں ہوسکا، کیوں کہ انہوں نے حضرت شیخ کی مدح سرائی عالمانہ کرنے کے بجائے کچھ شاعرانہ طریقے پر کی ہے، بعض راویوں کے مطابق حضرت شیخ ایک مصنف بھی تھے، آپ نے کئی تصانیف تو کی ہیں، لیکن آپ کی ساری تصانیف ضائع یا گم ہوچکی ہیں، اگر آپ کی تصانیف مل جاتیں تو آپ کی صلاحیت ولیاقت کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں ہوتا، ممکن ہے کہ برمی غاصب راجابدھوپھیہ نے جو چیزیں جلادی تھیں ان میں آپ کی تصانیف بھی رہی ہوں۔

بہرحال حضرت شیخ ہمارے قومی شاعر الاول کے مرشد تھے، الاول کی تصانیف میں سلوک وتصوف کے حوالے سے جو چیزیں ملتی ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت شیخ ایک مرشد کامل اور شیخ طریقت تھے، الاول نے اپنی تصانیف کے مختلف مقامات میں حضرت شیخ کی بڑے بلند الفاظ میں تعریفیں کی ہیں، ساتھ ہی ساتھ آپ وقت کے عظیم شیخ ہونے کی گواہی بھی دی ہے، چنانچہ الاول ہی کے تذکرے کی وجہ سے حضرت شیخ ہماری قومی تاریخ میں انمٹ ہوچکے ہیں۔

ارکانی حکومت نے حضرت شاہ مسعود کو قاضی القضاۃ بنایا تھا، یعنی آپ اس زمانے میں ارکان کے چیف جسٹس تھے، اس حوالے سے بھی حضرت شاہ صاحب کی نمایاں خدمات کا تذکرہ ملتا ہے۔

یادرہے کہ سرزمین ارکان میں حضرت شیخ کے پہلے اور بعد میں بھی بہت سارے قاضی القضاۃ تھے،

جن کے اسمائے گرامی تاریخ کی کتابوں میں ملتے ہیں، جن میں شجاع قاضی، قاضی غاوا، قاضی نالہ، قاضی عبدالکریم، قاضی محمد حسین، قاضی عبدالجبار، قاضی عبدالغفور، قاضی محمد یوسف، قاضی نور محمد اور قاضی روشن علی فرموک ناقابل فراموش ہیں، جو اپنے اپنے دور میں سلطنت ارکان کے قاضی القضاۃ رہ چکے تھے۔(۱)

حضرت شیخ شاہ مسعود کے الاول کے علاوہ بھی چند نامور خلفاء تھے، لیکن ان کے حالات زندگی سے ہم واقف نہیں ہوسکے، شک نہیں ہے کہ حضرت شیخ ایک بلند پایہ کے عالم دین، داعی الی اللہ اور مصلح قوم ہونے کے ساتھ عالی مقام کے شیخ طریقت تھے، کہتے ہیں کہ جبھی الاول نے آپ کے مبارک ہاتھ پر بیعت کی تو پورے ارکان کے علماء کا ایک ریلا حضرت کی طرف امنڈ آیا تھا، اور ہر ایک نے مستفید ہوکے اپنے اپنے علاقے میں جاکر دین ودعوت کی روشنی پھیلائی تھی، علاوہ ازیں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حضرت شیخ نے پوری سرزمین میں درسگاہوں اور خانقاہوں کا ایک جال پھیلا رکھا تھا۔

مروکو دور حکومت میں ارکان میں ایک مرکزی یا وفاقی قاضی القضاۃ سمیت دیگر قضاۃ ہوا کرتے تھے، ان مناصب پر بڑے بڑے فقہائے شریعت مقرر کئے جاتے تھے، لیکن یہ ہم ارکانی مسلمانوں کی بدقسمتی ہے کہ ان فقہائے ملت کے تذکرے آج نایاب ہیں، مگر چند حضرات کے صرف نام گرامی پائے جاتے ہیں۔

ادھر سوانح اور تذکرہ نگاروں کی ناعاقبت اندیشی پر اس ملک کے مسلمانوں کی ہمیشہ شکایت رہی ہے، تاہم میرے ناقص خیال میں ان کی یہ شکایت جزوی طور پر تو بجا ہوسکتی ہے مگر کلی طور بجا نہیں ہوسکتی، کیوں کہ تاریخ بتاتی ہے کہ برمی غاصب راجابدھوپھیہ کے حملے کے دوران ارکانی مسلمانوں کی قومی اور تاریخی دستاویزات جو نذر آتش کی گئی تھیں، اور بہت ساری دستاویزات برما لے جائی گئی تھیں، ان میں بہت سای مطبوعہ اور مخطوطہ تصانیف بھی موجود تھیں، برمی ظالموں نے ارکان کو روندا، اس کی گردن پر غلامی کی زنجیریں ڈال دیں، کتب خانے ویران کئے گئے، ارکانی مسلمانوں کی قومی دستاویزات چرائی گئیں اور بہت ساری دستاویزات کو نذر آتش کردیا گیا تھا، چنانچہ باوثوق ذرائع سے یہ

(۱) عبدالحق چودھری، پروچین ارکان، ص: ۱۰۶۔

بات پایۂ ثبوت تک پہنچ گئی ہے کہ بدھوپھیہ کی فوج کے ہاتھوں کتب خانے ویران اور دستاویرات نذر آتش کر دینے کے باوجود ہماری اتنی دستاویزات بچ گئی تھیں کہ انہیں سات ہاتھیوں کی پیٹ پر لدھا کر مروہانگ سے برمالے جانا پڑا تھا۔

اس حوالے سے یہ بات بھی یاد رہے کہ اس زمانے میں ارکان میں علم و ہنر سے ناطے اور رشتے صرف اور صرف مسلمانوں کو تھے، ان کے برعکس یہاں کی دیگر نسلی گروہ اور اقوام کو علم و ہنر سے کوئی رشتہ نہیں تھا، اگر وہ ساری دستاویزات آج ہمارے سامنے ہوتیں تو ان کی مدد سے یہاں والوں کی سوانح عمریاں اور ہمارے بزرگوں کے تذکرے مرتب کرنے میں آسانی ہو جاتی، جو ارکانی مسلمانوں کے لئے سامان فخر و ناز اور رہنمائے حیات بن سکتے تھے۔

بایں ہمہ ہمارے قومی شاعر الاول سمیت چند دیگر شعراء اور چند مصنفین کی تصانیف ان حوادث سے بچ گئیں، اس کی وجہ یہ تھی کہ یہاں ویرانی آنے سے قبل یہ کتابیں اور تصانیف بنگال کے گوشے گوشے تک پہنچ گئی تھیں، ویسے بعض مورخین اور تذکرہ نگاروں نے ان دواوین کی مدد سے بعض نامور ارکانی اہل کمال کے اسمائے گرامی کی حد تک تذکرے محفوظ کر لئے ہیں، آج مجھے بھی ان دواوین یا ان تذکرہ نگاروں کے تذکروں سے مستعار لے کر کچھ خامہ فرسائی کی توفیق ہو رہی ہے، اللہ تعالی ان تمام مرحومین کی بال بال مغفرت فرمائے۔

حضرت شاہ شیخ مسعود رحمۃ اللہ علیہ الاول کے مرشد تھے، چنانچہ انہوں نے اپنے دواوین میں جابجا حضرت کے تذکرے کئے ہیں، یوں ان کی وجہ سے حضرت شاہ صاحب کے تذکرے انمٹ ہو گئے ہیں، بہر حال ارکانی قضاۃ میں سے ارکان میں حضرت شاہ مسعود علیہ الرحمہ کی خدمات اور کارنامے نمایاں ہیں۔

پھر ارکانی افواج کی تاریخ سے پتہ چلا ہے کہ یہاں کی فوج میں مسلمان ہمیشہ اعلی اور برتر پوزیشن میں رہا کرتے تھے، علاوہ ازین برمی راجا باجیڈو کے عہد حکومت (۱۸۱۹ء۔ ۱۸۳۷ء) میں ارکان کے وزیر برائے امور مالیات وٹکسال بھی ایک مسلمان تھے، قصبہ بندر میں ان کی بنائی ہوئی مسجد کے قریب ان کا مقبرہ اب بھی موجود ہے، اسی طرح بدھوپھیہ کے عہد حکومت (۱۷۸۲ء۔ ۱۸۱۹ء) میں مسٹر او جی

(مسلمان دولت مند، جن کا تذکرہ پچھلی سطور میں گزر چکا ہے) اور ان کے شریک کار شجاع قاضی دونوں ارکان کے امراء، برمی راجا کے مشیر خاص اور ملک کے سب سے بڑے تاجر تھے، ڈھاکہ، کلکتہ، چاٹگام، پیگو، مانڈلے، آوا اور بنکاک جیسے تجارتی مراکز میں انہوں نے اپنا الگ مقام بنا رکھا تھا، او جی صاحب کا بنوایا ہوا پل اب بھی سادہ فارہ/ سادات فارہ میں پایا جاتا ہے۔(۱)

(۱) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: اڈووکٹ خلیل الرحمن، تاریخ اسلام برما و ارکان۔

حضرت گل مل شاہ صاحب

کہتے ہیں کہ یہ حضرت گل مل شاہ صاحب معروف بہ بدر اولیاء وہی ہیں کہ جن کے نام پر ارکان سمیت چاٹگام کے مختلف ساحلی مقامات پر ''بدر مقام'' کے نام پر پختہ مکانات/ خانقاہیں بنی ہوئی ہیں، گل مل شاہ صاحب جو بھی ہوں، بہر کیف باوثوق ذرائع سے یہی پتہ چلا ہے کہ آپ کی پیدائش ارکان میں نہیں ہوئی، بتایا جاتا ہے کہ آپ نے اپنی زندگی کے طویل ایام یہاں گزارتے ہوئے اس سرزمین کو اپنے سینے سے لگالیا (یاد رہے کہ محترم مورخ شیخ محمد اکرم صاحب نے بدرمقام والے معروف بدر اولیاء کا مزار بہار میں ہونا لکھا ہے)، بہر حال ہماری تاریخ میں گل مل شاہ صاحب کا تذکرہ ملتا ہے، جس کے مطابق آپ بارھویں صدی عیسوی میں ایران سے ارکان تشریف لائے تھے۔

کہتے ہیں کہ حضرت گل مل شاہ ایک بڑے ولی اللہ تھے، آپ کا رشتہ ایران کے کسی شاہی خاندان سے تھا، زندگی کے ابتدائی ایام سے آپ پر تصوف کا غلبہ ہوا، اور یاد الٰہی میں مشغول ہو گئے، جوانی کے عالم میں آپ نے تارک الدنیا ہو کر بالآخر اپنے وطن کو چھوڑا، اور افغانستان سے ہندوستان ہو کر ارکان پہنچے، اور ممبرا میں اقامت گزین ہو گئے تھے، چنانچہ ممبرا والے بدر مقام آپ کی طرف منسوب ہے، کہتے ہیں کہ آپ اس جگہ قیام کرتے ہوئے یاد الٰہی میں ہمہ تن مشغول ہو گئے تھے۔

بعض راویوں کی روایت کے مطابق آپ ایک زندہ دل اور صاحب کشف وکرامات بزرگ تھے، آپ کی بہت ساری کرامات کی باتیں لوگوں کی زبانی سننے میں آئیں، علاوہ ازیں یہ بھی کہتے ہیں کہ آپ ایک مرشد کامل بھی تھے اور داعی بھی، آپ کی ارشاد وتلقین اور دعوت وتبلیغ سے ہزاروں ہندو مگھ باشندے مسلمان ہو گئے تھے، تاہم آپ کے کسی خلیفہ کا تذکرہ نہیں ملتا ہے۔

لیکن بعض مورخین کا کہنا ہے کہ حضرت گل مل شاہ صاحب ایک مجذوب قسم کے صاحب کشف و کرامات ولی اللہ تو تھے لیکن مرشد نہیں تھے، یعنی ان مورخین کے مطابق آپ سے بیعت وتلقین اور رشد وہدایت ثابت نہیں ہے، اس لئے آپ سے لوگ مستفید نہیں ہو پائے تھے، واللہ اعلم۔

سید صلاح الدین

سرزمین ارکان کے عظیم عالم دین وشیخ طریقت اور شاعر وسیاست دان سید صلاح الدین کی پیدائش ارکان کے قدیم دار الحکومت کے معروف قصبہ بندر میں ہوئی تھی، آپ سیدزادے تھے، یوں آپ نے اپنے نام کے ساتھ لفظ سید چسپاں کر رکھا تھا۔

سید صلاح الدین کی ابتدائی ومتوسطہ کی تعلیم اپنے خاندان کے بزرگوں کے ہاتھوں ہوئی، بعد میں اعلیٰ تعلیم کے لئے وقت کے عظماء، علماء اور دانشوروں کے یہاں جاتے رہے، اور ملک کے طول وعرض میں پھیلی ہوئی بعض درس گاہوں سے مستفید ہوتے رہے تھے، یعنی کہ سید صلاح الدین نے حصول علم دین کے لئے ملک کے طول وعرض کی بہت ساری درسگاہوں کے علماء ومشائخ کے دربار میں حاضری دی تھی۔

تعلیم سے فراغت کے بعد سید صلاح الدین نے تجارت کے ساتھ سیاست میں دلچسپی لینی شروع کی، یوں آپ پر ملک کے بڑے بڑے علماء وفضلاء کے علاوہ اعیان سیاست وحکومت کی نظریں پڑ گئی تھیں، چنانچہ آپ علماء وفضلاء کے ساتھ خاصے لگاؤ رکھنے کے تہ بتہ اس وقت کے ارکانی وزیر اعظم مجلس کے دربار سے منسلک ہو گئے، ویسے آپ کو وزیر اعظم مجلس نے اپنا خاص سکریٹری بنایا تھا، چوں کہ سید صلاح الدین بڑے سیاست دان تھے، ویسے آپ کی صلاحیت سے نہ صرف وزیر اعظم مجلس کو بلکہ پوری قوم کو بہت فائدہ پہنچا تھا۔

چوں کہ اسی زمانے میں حضرت الاول علیہ الرحمہ کا وزیر اعظم مجلس کے دربار میں آنا جانا رہتا تھا، چنانچہ سید صلاح الدین ان سے متاثر ہو کر ان کے مبارک ہاتھ پر بیعت ہو گئے، اور ایک طویل مدت تک ریاضت ومجاہدہ کے بعد آپ کو خلعتِ اجازت وبیعت سے نوازا گیا، آپ حضرت الاول کے چہیتے مرید اور خلیفۂ خاص تھے، چنانچہ آپ کے متعلق الاول نے اپنے ایک دیوان میں لکھا ہے کہ:

> ''سید صلاح الدین ایک اچھے سالک طریقت ہیں، جنہوں نے فقیر سے طریقہ عالیہ قادریہ کی نسبت لی اور علم وعرفان کی راہ میں چلنے کی تربیت پائی، ایک طرف وہ مجلس خان کی نسبت سے، پھر دوسری طرف ایک نیک صفات کے حامل اور پاکیزہ اخلاق کے مالک انسان ہونے کی وجہ سے میرے بہت ہی عزیز ہیں، شک نہیں

ہے کہ وہ ایک صاف دل اور صاف ضمیر والا انسان ہیں، وہ میرے صاحب نظر
خلیفہ ہیں، وہ ہر وقت کاغذ قلم ہاتھ لئے میرے سامنے حاضر رہتے ہیں، وہ شعر
شاعری کے دلدادہ اور خود بھی ایک اچھے شاعر ہیں''۔

حضرت الاول رحمۃ اللہ علیہ ظاہر ہے کہ سید صلاح الدین کے شیخ ومرشد تھے، جن کی شہادت اس بات کی دلیل ہے کہ سید صاحب کون تھے، کیسے تھے اور کس مسلک ومشرب کے حامل ایک انسان کامل تھے۔

بہر حال سید صلاح الدینؒ ایک فہم وفراست کے مالک بڑے عالم وفاضل اور شاعر ہونے کے ساتھ ایک زیرک سیاست دان اور دل درمند اور فکر ارجمند کے مالک ایک انسان کامل تھے، جنہوں نے اس ملک میں اور تو اور علم وعرفان کے حوالے سے نمایاں خدمات انجام دی تھیں، الاول کے زمانے اور ان کے بعد بھی طریقۂ عالیہ قادریہ کے سلسلہ کو بخوبی جاری رکھا، آپ کے بہت مرید اور خلفاء تھے، جنہوں نے بھی اس ملک کے طول وعرض میں علم وعرفان کی روشنی پھیلائی تھی۔

سید صلاح الدین نے عرصۂ دراز تک ارکان اور یہاں کے مسلمانوں کی علمی، عملی، دینی، فکری اور روحانی خدمات انجام دیتے ہوئے دارالحکومت مروہانگ میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔

سید بہادر شاہ صاحب

تاریخ ارکان میں سید محمد بہادر شاہ کا تذکرہ ملتا ہے، تذکرہ کے مطابق وہ سید الاول اور پر اول کے خاندان کے ایک مرد کامل شیخ طریقت گزرے ہیں، جنھوں نے سرزمین ارکان کو علم وعرفان سے منور و تاباں رکھا، اور جن کے بہت سارے متعلقین اور خلفاء ارکان میں پھیلے ہوئے تھے۔

یک روایت کے مطابق سید بہادر شاہ صاحب کیوکتو میں پیدا ہوئے اور زندگی کے ابتدائی حصے بھی انہوں نے وہیں گزاری، جب کہ دوسری روایت یہ بھی ہے کہ برمی غاصب راجا بدھوپھیہ کے حملہ کے بعد سید الاول کے خاندان کے بیشتر افراد ارکان کے طول وعرض میں منتشر ہو گئے تو سید بہادر شاہ کے والد گرامی اپنے اہل خانہ سمیت ارکان کے حالیہ دار الحکومت میں سکونت پذیر ہو گئے تھے، یہاں مولانا کی تعلیم وتربیت ہوئی، بعد میں یہاں سید بہادر شاہ صاحب نے ایک مسجد تعمیر کی، جس سے ملحق ان کی خانقاہ ایک طویل مدت تک ضوء فشاں تھی۔ حافظ محمد نعمان صاحب جن کا تذکرہ اس کاوش کی زینت ہے، وہ سید بہادر شاہ کی نسل سے ہیں، جن کی زندگی شہر اکیاب میں گزری تھی۔

مجذوب حسن شاہ اکیابی

سرزمین ارکان میں اٹھارھویں صدی عیسوی میں ایک بزرگ گزرے، جن کا نام حسن شاہ تھا، ان کی ولادت ارکان میں ہوئی، انہوں نے زندگی کی طویل مدت اکیاب میں گزاری، ان پر ہمیشہ جذب ومستی کی حالت طاری رہتی تھی، کہتے ہیں کہ ان کی عملی زندگی کی شروعات دعوت وارشاد سے ہوئی تھیں، لیکن ان کی زندگی کے آخری ادوار جذب ومستی کی حالت میں گزرے تھے، بالآخر وہ تارک الدنیا ہو کر کہیں روپوش ہو گئے، بعض مقامی لوگوں کے مطابق ان کا مزار شہر اکیاب میں واقع ہے۔

حیدرعلی شاہ صاحب

حیدرعلی شاہ صاحب سولہویں صدی عیسوی کی آخری دہائی میں ارکان کے حالیہ دارالحکومت اکیاب میں پیدا ہوئے، وہ ایک عرب یا فارسی خاندان کے چشم و چراغ تھے، اور کہا جاتا ہے کہ آپ کے خاندان کا تعلق فارس یعنی ایران سے تھا، وہاں سے ان کا خاندان ہندو بنگال سے ہوکر دین ودعوت کے لئے ارکان آیا، اور یہاں کی سرزمین کو اپنا بنالیا تھا۔

باوثوق ذرائع سے پتہ چلا کہ حیدرعلی شاہ صاحب کی تعلیم وتربیت اکیاب ہی میں ہوئی، وہ ایک جلیل القدر عالم دین ہونے کے علاوہ مالدار سخی تھے، پھر ایک اہل دل شیخ طریقت بھی، چنانچہ ہزاروں بندگان خدا آپ کے انفاس عالیہ سے مستفید ہوئے تھے، انہوں نے اپنے زمانے میں اپنے مال سے، بہت سارے مدارس، خانقاہیں اور مساجد تعمیر کی تھیں، اور خود تدریسی خدمات بھی انجام دیئے تھے۔

کہتے ہیں کہ حیدرعلی شاہ صاحب نے اپنے مریدوں کو جہاد اسلامی کی ترغیب بھی دی تھی، نہ صرف مریدوں کو جہاد فی سبیل اللہ کی طرف توجہ دلائی تھی بلکہ بذات خود جہاد فی سبیل اللہ کے میدان میں اتر بھی چکے تھے، لیکن آخری عمر میں آپ پر جذب ومستی کی حالت طاری ہوگئی تھی، وہ عشق خدا ورسول میں ڈوب چکے تھے، آپ کو بطور خاص نعت سیدالاولین صلی اللہ علیہ وسلم سے دلچسپی تھی، نعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز کان پڑتی تو جذب ومستی کی حالت میں سہی ان میں سنجیدگی آجاتی تھی، معلوم ہوتا ہے کہ ان پر فنا فی الرسول کا غلبہ ہوگیا تھا، انہوں نے زندگی کے آخری ایام جذب شوق میں گزارے، اوراس حالت میں جان جان آفرین کا حوالہ کیا، اورا کیاب کی سرزمین میں مدفون ہیں۔

حیدرعلی شاہ صاحب ایک شیخ طریقت تھے، چنانچہ کہتے ہیں کہ ان کے بہت سارے مریدوں کے علاوہ بہت سارے خلفاء ارکان کے طول وعرض میں پھیل گئے تھے، جنہوں نے اس سرزمین میں دین وایمان کی ضیاپاشی کی تھی، اللہ تعالی حیدرعلی شاہ سمیت ان کے تمام مریدان ومتعلقین اور خلفائے کرام کے درجات بلند فرمائے۔

حیدرعلی خواندکارقیمی

حیدرعلی خواندکار ممبرا کے معروف علاقہ قیم میں پیدا ہوئے، ان کا خاندان ایک علمی اور ثقافتی خاندان تھا، ان کے خاندان میں خود ان کے زمانے میں بھی بڑے بڑے علماء اور مدرسین تھے، جنہوں نے اس علاقے میں دین وایمان اور علوم دینیہ کی روشنی پھیلائی تھی۔

حیدرعلی خواندکار کی ابتدائی تعلیم اپنے آبائی گاؤں کے مکتب میں ہوئی، اس کے بعد انہوں نے مزید تعلیم کے سلسلے میں اکیاب وغیرہ کا سفر کیا، اور وہاں کے بڑے بڑے علمائے کرام سے مستفید ہوکر سندفراغت حاصل کی۔ یادرہے کہ ارکان میں دینی علماء کو اس زمانے میں خواندکار، میاں جی، اور ملاجی کے خطاب سے پکارا جاتا تھا، ویسے ان کو بھی خواندکار کے لقب سے پکارا گیا تھا۔

خواندکار صاحب ہمارے نامور ارکانی مورخ وکیل خلیل الرحمن مرحوم مصنف ''تاریخ اسلام برما وارکان'' اور ''کربلائے ارکان'' کے حقیقی نانا تھے، چنانچہ وکیل صاحب کی بعض تحریر سے اتنا پتہ چلا کہ خواندکار صاحب ایک عالم دین ہونے کے ساتھ ایک بلند پائے کے بزرگ انسان تھے، انہوں نے اپنے علم وعمل کے ذریعے ہزاروں بندگان خدا کو مستفید کیا تھا، پھر یہ بھی پتہ چلا کہ خواندکار صاحب ارکانی تاریخ پر خاصی نظر رکھتے تھے، چنانچہ بڑے پیمانے میں قومی روایات اور خاندانی دستیاویزات ان کے یہاں محفوظ تھیں، وہ ایک زندہ دل، پارسا اور عالی صفت کے انسان تھے، سخاوت ان کی گویا فطرت ثانیہ بن چکی تھی، خصوصا وہ طلبائے علوم نبوت کو بڑی دریادلی کے ساتھ علم دین کے حصول کے لئے مالی مدد کیا کرتے تھے، ساتھ ہی ساتھ لوگوں کو اس کارخیر کے لئے تلقین بھی کیا کرتے تھے۔

خواندکار صاحب نے اپنی زندگی میں کئی مساجد کی امامت کے علاوہ کئی مدرسوں میں تعلیم دی تھی، آخر کار انہوں نے اکیاب میں جان جان آفرین کو حوالہ کیا، اور وہیں دفن ہوئے، اللہ تعالی ان کی بال بال مغفرت کے ساتھ ان کا درجہ بلند فرمائے، آمین۔

شیخ منشی عبدالغنی صاحبؒ

شیخ منشی عبدالغنی صاحب کی پیدائش تیرھویں صدی عیسوی کی آخری دہائی میں ارکان کے مشہور و معروف شہر چوکپر و میں ہوئی، منشی صاحب کے خاندان میں بڑے بڑے علماء، صلحاء اور دعاۃ پیدا ہوئے تھے، ان کے والد گرامی بھی ایک جلیل القدر عالم دین تھے، چنانچہ ان کے خاندان کے بزرگوں نے اس علاقے کو دعوت وتبلیغ کے ذریعے آراستہ کر رکھا تھا، شرافت ونجابت کے حوالے سے بھی ان کا خاندان اس علاقے میں بلند مقام اور شہرت کا حامل تھا۔

منشی صاحب کی تعلیم وتربیت والد صاحب کے علاوہ خاندان کے دیگر بزرگوں کے ہاتھوں ہوئی تھی، تعلیم وتربیت سے فراغت کے بعد انہوں نے انشاء پردازی کے مشغلہ کے ساتھ اپنی زندگی کو دعوت دین کے لئے وقف کر دیا تھا، منشی صاحب ایک عالم دین اور شیخ طریقت ہونے کے ساتھ ایک بلند پائے کے واعظ وخطیب تھے، وہ مقامی زبان میں بڑی سلیقہ مندی اور خوش اسلوبی سے پند ونصیحت اور وعظ وخطاب کرتے تھے، اس حوالے سے بات یہاں تک مشہور ہے کہ ان کی تقریر سے وہاں کے بدھ بھکشو بھی دھنگ رہ جاتے تھے، اور مسلمانوں کے علاوہ ہندو اور مگھ باشندے بھی ان کی تقریر کے سامع وشائق ہو گئے تھے، چنانچہ ان کی تقریر سے متاثر ہو کر سینکڑوں ہندو اور مقامی بدھ مشرکین اسلام کے حلقے میں داخل ہو گئے تھے۔

یہاں کے مسلم معاشرہ وسماج میں اس زمانے میں بدعات وخرافات عام تھیں، چنانچہ منشی صاحب نے اپنی دعوت وتبلیغ اور علم وعرفان کے ذریعے ان خرافات وبدعات کا قلع قمع کیا، اور دین وایمان کے نام سے یہاں کے مسلمانوں میں جو بدعات وخرافات پھیل چکی تھیں انہیں ایک ایک کر کے ختم کیا تھا، اس حوالے سے ایک کہانی مشہور ہے کہ:

> ''پتھری قلعہ (مروہانگ) کے قریب مہاٹھی کے مقام پر ''مہاجانی ماں'' نامی انسانی شکل کا ایک مجسمہ نصب تھا، ہندو اور مگھ بدھوں کے علاوہ بڑے پیمانے پر مسلمان بھی

> وہاں جا کر اس مجسمہ کے سامنے نذر ونیاز پیش کرتے اور اپنی حاجت روائی اور مشکل کشائی کے لئے موم بتیاں جلاتے اور دعائیں کرتے تھے، چنانچہ یہ دیکھ کر ایک روز منشی عبدالغنی صاحب وہاں گئے اور اس مجسمے کو اپنے ہاتھوں سے توڑ ڈالا، یہاں کے لوگ سمجھ رہے تھے کہ منشی صاحب کا کچھ نہ کچھ ہو جائے گا، مگر ہوا کچھ نہیں، اس طرح یہاں کے ہندو اور بدھ مشرکین کے علاوہ مسلمان بھی حیرت زدہ رہ گئے تھے، چنانچہ آپ کی اس سرگرمی نے یہاں کے مسلمانوں کو ایک خطرناک شرک سے بچا لیا تھا''۔

غرض منشی عبدالغنی صاحب ایک بلند مقام کے عالم دین اور عالی صفات کے شیخ طریقت اور صاحب طرز خطیب تھے، اس علاقے میں ان کے بہت سارے مریدین اور خلفاء تھے، لیکن افسوس ہے کہ خود ان کے شیخ اور ان کے طریقہ ومشرب کا پتہ نہیں چل سکا۔

غرض منشی صاحب نے اپنی زندگی کو دین ودعوت کے تئیں مسلمانوں کو شرک، بدعات اور خرافات سے بچانے کے لئے وقف کر رکھا تھا، آخر کار آپ نے چوکپر و میں انتقال کیا، آپ کے مزار پاک یہاں اب بھی زیارت گہ عام وخاص ہے۔

حضرت نوراللہ شاہ صاحبؒ

چودھویں صدی عیسوی کی ابتدا میں حضرت نوراللہ شاہ صاحب کی پیدائش ارکان کے حالیہ دارالحکومت اکیاب میں ہوئی، آپ کی تعلیم وتربیت بھی وہیں ہوئی، کچھ بڑے ہوئے تو آپ کی طبعی میلان تصوف کی طرف ہوگیا تو آپ نے اس علاقے کے ایک شیخ طریقت کے ہاتھ پر بیعت کی، آپ نے اپنے مرشد کے حکم سے کبھی صحراء وبیابانوں اور کبھی پہاڑی کی چوٹیوں اورڈھلوانوں میں عرصۂ دراز تک بڑی ریاضت کی، جس کے بعد آپ خرقۂ خلافت سے نوازے گئے تھے۔

آپ نے حج بھی کیا، چنانچہ کہتے ہیں کہ آپ حج بیت اللہ وزیارت مدینہ منورہ کی نیت سے بنگال اور ہندوستان کی راہ حجاز مقدس پہنچے، حج وزیارت سے فراغت کے بعد ایران گئے، وہاں آپ وقت کے بڑے بڑے اولیائے کرام سے مستفیض ہوکر براہِ ہندو بنگال واپس وطن لوٹے، اور وطن پہنچ کر اپنی علمی، دعوتی،تبلیغی اورروحانی سرگرمیوں سے یہاں والوں کومستفیض کیا تھا، کہتے ہیں کہ اس علاقے میں آپ کے ہزاروں متعلقین کے ساتھ درجنوں کی تعداد میں خلفائے کرام تھے، جنہوں نے بھی اپنے شیخ ومرشد کی طرح دین کا کام بڑی خوبی سے کیا تھا۔

زندگی کے آخری حصے میں اکثر حضرت نوراللہ شاہ صاحب پر جذب ومستی کی حالت طاری رہتی تھی، آپ کی ایسی حالت میں لوگ آپ کے پاس تک نہیں جاسکتے تھے، ایسی حالت میں آپ پہاڑوں اور بیابانوں کی طرف نکل جاتے تھے، اور جبھی وہ عام حالت میں لوٹ آتے تو رہائش گاہ تشریف لاکر دینی وروحانی سرگرمیاں شروع کردیتے تھے۔

کہتے ہیں کہ حضرت نوراللہ شاہ صاحب ایک زندہ دل اور عاشق رسول بزرگ تھے، جبھی کوئی نعتِ رسول آپ کے سامنے پڑھی جاتی تو آپ کی آنکھیں اشکبار ہوجاتی تھیں، آپ لوگوں کے دکھ درد میں بھی شریک ہوا کرتے، اور سماجی اور معاشرتی کاموں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے، آپ نے اکیاب میں انتقال کیا، وہیں مدفون ہیں۔

حضرت شاہ عزل الدین خان

حضرت شاہ عزل الدین صاحب کی پیدائش پندرھویں صدی عیسوی کے اوائل میں ارکان کے دارالحکومت اکیاب میں ہوئی، افسوس ہے کہ ہم ان کی تعلیم وتربیت کے حالات سے واقف نہ ہوسکے ،تاہم پتہ چلا کی ان کے خاندان اس علاقے میں علم وعمل کے حوالے سے معروف تھا، کہتے ہیں کہ ان کے والد بزرگوں کے ہاتھوں ان کی تعلیم وتربیت ہوئی تھی۔

حضرت شاہ عزل الدین صاحب ایک صاحب کشف وکرامات بزرگ تھے، ہمیشہ یادالٰہی میں مستغرق رہتے تھے، علاوہ ازیں لوگوں کو بیعت اور تلقین کے ساتھ بھولے بھٹکوں کوراہِ راست پر لانے کی بھی کوشش کیا کرتے تھے، ان کے زمانے میں اس علاقے میں بدعات وخرافات عام تھیں، چنانچہ ان کی کوشش سے یہاں کے مسلم سماج میں بدعات وخرافات کی بڑی کمی ہوگئی تھی۔

پتہ چلا ہے کہ حضرت عزل الدین شاہ صاحب لوگوں کے دکھ سکھ میں تشریک بھی ہوتے تھے، لیکن شادی بیاہ جیسی تقریبات میں جوغیر اسلامی رسم ورواج اورخرافات پائے جاتے تھے، ان کے خلاف شدید احتجاج کرتے ہوئے آپ اس میں شریک نہیں ہوتے تھے، مصیبت وآزمائش کے حالات میں یہاں کے لوگ ان کے پاس آتے اور دعا کراتے تھے، کہتے ہیں کہ ان کی دعاؤں کی برکت سے بہت سارے لوگوں کی مصیبتیں ختم اور حاجتیں پوری ہوگئی تھیں، ویسے لوگوں میں یہ بات مشہور تھی کہ وہ ایک مستجاب الدعوات بزرگ ترین ہستی ہیں۔

شاہ عزل الدین صاحب علمائے دین کونہایت محبت کرتے اور طلبائے علوم دین کو بہت پیار کرتے تھے اور موقع ہوتا تو طلبائے علم دین کوتعاون بھی کیا کرتے تھے، لوگ ان کے سامنے جونذرانے پیش کرتے تھے وہ ان نذرانوں کوطلباء میں تقسیم کردیتے تھے، علاوہ ازیں مدارس ومساجد کی مرمت کے لئے وہ دور دور تک چلے جاتے، اور لوگوں کومسجد ومدارس کی مرمت کی طرف توجہ دلاتے تھے، ویسے ان کی کوشش سے یہاں اس زمانے میں بہت سارے مدارس ومساجد مٹ جانے سے بچ گئی تھیں۔

حضرت شاہ عزل الدین صاحب پر زندگی کے آخری حصے میں کبھی کبھار جذب ومستی کی حالت طاری ہوجاتی تھی،لیکن ایسی حالت میں بھی وہ پہاڑوں ویرانوں میں بھٹکنے کے بجائے لوگوں کے مابین رہا کرتے تھے،ان کے خرق عادات کے متعلق کوئی ٹھوس بات ہمارے سامنے نہیں آئی،لیکن ان کے مستجاب الدعوات ہونے کی مختلف بیانات سامنے ضرور آئے ہیں۔

شاہ صاحب نے ایک طویل مدت تک علم وعلمائے دین اور طلبائے علوم نبوت کے علاوہ یہاں کے لوگوں کی خدمات کرتے ہوئے اکیاب میں وفات پائی،آپ کا مزار پاک انجمن اسلامیہ اکیاب کی قبرستان میں زیارت گہِ عام ہے۔

سید محمد پراول شاہ صاحبؒ

سرزمین ارکان کے عظیم شاعر وشیخ طریقت حضرت شاہ الاول رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان میں آپ کے گزرجانے کے بعد تا حال بڑے بڑے علماء اور مشائخ پیدا ہوئے،جنھوں نے اس سرزمین میں دین ودعوت اور علم وعرفان کے حوالے سے نمایاں خدمات انجام دیں،جن میں ایک انسان کامل تھے،جن کا نام حضرت سید محمد پراول شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھا۔

سید محمد پراول شاہ صاحبؒ سترھویں صدی عیسوی میں سرزمین ارکان کے قدیمی دارالحکومت مروہانگ (پتھری قلعہ) میں پیدا ہوئے،آپ اپنے زمانے میں سید الاولؒ کے خاندان کے چشم وچراغ تھے، چنانچہ سید الاولؒ کے خاندان کے دیگر مشائخ میں آپ کا مقام ورتبہ بہت بلند نظر آتا ہے۔

سید پراول شاہ صاحب نے ابتدائی تعلیم ارکان کے علماء ومشائخ سے حاصل کی،بعد میں تعلیم کے سلسلے میں آپ نے ارکان کے دارالحکومت اکیاب کے علاوہ بنگال اور ہندوستان کا سفر کیا تھا،چنانچہ بنگال اور ہندوستان سے مستفید ہوکر وطن واپس آئے تھے۔

کہتے ہیں کہ ہندوستان میں تعلیم سے فراغت کے بعد یا تعلیم کے دوران آپ نے وہاں کے ایک مرشد کامل کے ہاتھ پر طریقۂ عالیہ نقشبندیہ مجددیہ میں بیعت کی اور ایک طویل عرصہ تک ریاضت و مجاہدہ کے بعد آخر کار آپ خلعت اجازت سے نوازے گئے تھے۔

ظاہر ہے کہ حضرت الاول کا خاندان ایک علم وعرفان کا خاندان تھا،لیکن گردش ایام کی وجہ سے اس خاندان کے افراد ارکان کے طول وعرض میں منتشر ہوگئے تھے،لیکن سید پراول شاہ صاحب نے اس خاندان کے اکثر افراد کو یک جا کرنا شروع کیا تھا،ویسے آپ اپنے زمانے میں اس خاندان عز وشرف کا مربی کہلائے جانے لگے تھے۔

وطن میں سید پراول شاہ صاحب نے بہت ساری مساجد تعمیر کروائیں اور بہت سارے مدارس قائم کئے تھے،علاوہ ازیں مروہانگ میں ایک خانقاہ کی بنیاد رکھی تھی،جس میں بیٹھ کر آپ نے علم وعرفان کا

ایک دریا بہادیا تھا، آپ کے بہت سے خلفاء گزرے ہیں، لیکن ایک دو خلفائے کرام کے علاوہ ان ساروں کے تذکرے محفوظ نہیں ہیں۔

سید پراول شاہ صاحب نے ایک بہت بڑا کام یہ کیا کہ سید الاول کی تصانیف جو گم یا ضائع ہونے جا رہی تھیں، آپ نے انہیں طبع کروانے کا بیڑا اٹھایا، کہتے ہیں کہ اس سلسلے میں آپ نے بنگال کا سفر کیا، چنانچہ آپ اپنی کوشش میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہوگئے، اور بنگال کی سرزمین نے الاول کے مخطوطات کو طبع کر کے شائع کر دیا تھا، یوں الاول کے بہت ساری گرانمایہ کاوشیں ضائع ہونے سے بچ گئیں، میرے نزدیک وہاں کے حالات کے پیش نظر حضرت کا یہی کارنامہ کبھی بھی بھولے سے بھلائے جانے کے قابل نہیں، اللہ تعالی آپ کو جزائے خیر دے، اور آپ کے درجات بلند فرمائیں۔

الحاصل حضرت شاہ پراول نے ارکان میں ایک طویل مدت تک علم وعرفان کے سلسے میں کارنامے انجام دیتے ہوئے مروہانگ میں انتقال کیا، اور وہیں مدفون ہوئے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

سید محمد شاہ صاحب

سید محمد شاہ صاحب ارکان کے معروف شہر کیوکتو میں پیدا ہوئے، آپ کی تعلیم وتربیت بھی وہیں ہوئی، آپ رحمۃ اللہ علیہ اپنے زمانے میں خاندان الاول کے چشم وچراغ تھے، جو حضرت محمد پراول رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ اجل ہونے کے ساتھ حضرت پراول کی قائم کردہ خانقاہ کے سجادہ نشین بھی تھے، سید محمد پراول کی خانقاہ میں آپ کے گزر جانے کے طویل مدت بعد سید جلال الدین صاحب نامی ایک بزرگ سجادہ نشین تھے،، جنہوں نے بھی اس خانقاہ میں بیٹھ کر ایک طویل مدت تک اپنے روحانی فیوضات سے اس علاقے کو روشن ومنور رکھا تھا۔

سید محمد شاہ بدھوپھیہ کے عہد حکومت میں اس خانقاہ کے سجادہ نشین تھے، پھر اس بات سے کون واقف نہیں ہے کہ بدھوپھیہ نے ارکان پر حملے کے دوران دارالحکومت پتھری قلعہ کو تاراج کر دیا تھا، شاہی کتب خانے سمیت یہاں کے تمام کتب خانے جلا دیئے گئے تھے، بہتوں علمائے اسلام کو تہ تیغ کر دیا گیا، اور بہتوں کو گرفتار کر کے برما لے جایا گیا تھا، چنانچہ اس ظالم کی نظر بد اس خانقاہ پر بھی پڑی تھی، یوں اس نے اس کو بھی جلا کر راکھ کا ڈھیر کر دیا تھا۔

کہتے ہیں کہ بدھوپھیہ کے حملے کے دوران سید محمد شاہ صاحب اپنے اہل خانہ، خداموں اور مریدوں سمیت کہیں روپوش ہو گئے تھے، اس کے بعد آپ نے اپنی زندگی میں اس خانقاہ کو دوبارہ آباد نہیں کر سکا، لیکن بعد میں الاول کے خاندان کے کسی صاحب دل وصاحب نظر نے ایک طویل مدت گزر جانے کے بعد اسے آباد کیا تھا، بدھوپھیہ کے حملے کے بعد سید محمد شاہ صاحب کہاں گئے، کس حالت میں رہے، آپ کی وفات کہاں ہوئی، اور کہاں وہ مدفون ہیں ان تمام حالات کی کوشش کے باوجود دریافت نہیں ہوسکی۔

بہر حال سید محمد شاہ صاحب ایک عالم دین ہونے کے ساتھ ایک مرشد کامل تھے، جن کے روحانی فیوض وبرکات سے یہاں والے مستفید ہوئے، دعا ہے کہ اللہ تعالی آپ بشمول آپ کے تمام مریدان وخلفاء کے درجات بلند فرمائیں، آمین۔

سید محمد جلال الدین شاہ صاحب

ارکان پر بدھو پھیہ کے حملے کے بعد سید محمد پراول شاہ صاحب کی قائم کردہ خانقاہ ویران ہوگئی تھی، جس طرح پچھلی سطور میں عرض کی گئی ہے کہ اس حملے کے دوران اس خانقاہ کے سجادہ نشین سید محمد شاہ صاحب مع اہل خانہ، متعلقین اور بیشتر منتسبین سمیت کہیں روپوش ہو گئے تھے، اس وقعہ کے عرصۂ دراز بعد سید محمد جلال الدین شاہ صاحب اٹھے، جنہوں نے دوبارہ اس خانقاہ کو آباد کیا تھا۔

سید محمد جلال الدین شاہ صاحب سترھویں صدی عیسوی کے چوتھے عشرے میں مروہانگ میں پیدا ہوئے، آپ سید الاول کے خاندان کے اپنے زمانے میں مربی اور چشم و چراغ تھے، آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے علاقے میں پائی، اس کے بعد ایک روایت کے مطابق سید محمد پراول شاہ صاحب کے مرید ہوئے، جب کہ دوسری روایت یہ بھی ہے کہ آپ سید پراول شاہ صاحب کے نہیں بلکہ سید محمد شاہ صاحب کے مرید پھر خلیفہ تھے، لیکن یہ بات یقین کی حد تک پہنچی ہوئی ہے کہ آپ سید محمد شاہ کی روپوشی کے بعد سید پراول شاہ صاحب کی قائم کردہ خانقاہ کے گدی نشین ضرور بنے تھے۔

سید جلال الدین شاہ صاحب نے مذکورہ اس خانقاہ میں بیٹھ کر رشد و ہدایت اور تعلیم و تلقین کے حوالے سے بڑی خوبی سے کام کیا، آپ کی ان تھک کوشش سے یہاں کے مسلمانوں کو علمی، روحانی اور اصلاحی اعتبار سے بہت ہی فائدہ پہنچا تھا، علاقے بھر میں آپ کے متعلقین و منتسبین تو بہت تھے، لیکن یقینی طور پر معلوم نہیں ہوسکا کہ آپ کے خلفاء کون کون تھے اور ان کے حالات کیا تھے۔

سید محمد جلال الدین شاہ صاحب ایک اعلی پایہ کے عالم دین، فقیہ النفس اور صاحب نظر مرشد کامل تھے، آپ نے مذکورہ خانقاہ میں بیٹھ کر دین و ایمان کی بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ خدمات انجام دیں، آپ خدمت خلق کے حوالے سے بھی مشہور ہیں، کہتے ہیں کہ آپ کے دربار سے کوئی بھی خالی ہاتھ نہیں جاتے، آخر ایک طویل عرصے تک خدمات انجام دیتے ہوئے آپ نے یہاں انتقال کیا۔

سید محمد ہدی صاحب

سید محمد ہدی سولہویں صدی عیسوی کی آخری دہائی میں قصبۂ قیم میں پیدا ہوئے، ظاہر ہے کہ وہ سادات میں سے تھے، ان کے آباء و اجداد زمانۂ قدیم میں ارکان آئے اور یہاں کی سرزمین کو دینی و روحانی اعتبار سے روشن و تاباں کیا، چونکہ ان کا خاندان سید تھا تو ارکان میں اس خاندان کا ایک علیحدہ مقام و احترام تھا، یوں لوگوں کی نگاہ میں سید محمد ہدی ایک طرف سادات میں سے ہونے تو دوسری طرف ایک اہل کمال خادم ملت ہونے کی وجہ سے بڑے محترم انسان تھے۔

سید محمد ہدی نے تعلیم اپنے خاندان کے بزرگوں سے پانے کے بعد علاقے کے دیگر جید علمائے کرام سے حاصل کی، تعلیم سے فراغت کے بعد انہوں نے تجارت کے ساتھ سیاست سے دل چسپی لی، چنانچہ انہوں نے بڑی کم مدت میں ان دونوں میدانوں میں بڑا نام پیدا کیا تھا، لیکن بعد میں تجارت کے ساتھ رفاہی، سماجی اور فلاحی کاموں میں مشغول ہو گئے، وہ لوگوں کو کھلاتے پلاتے اور کمزوروں، معذوروں اور مصیبت کے مارے ہوؤں کے کام آنے لگے تھے، آپ بڑے فراخ دل اور سخی انسان تھے، علاقے بھر کے ہر کوئی مصیبت زدہ ان کے پاس آتے تو وہ مصیبت میں کام آتے ہوئے ان کو مصیبت سے چھڑا لیتے تھے، کہتے ہیں کہ سید محمد ہدی صاحب یہاں کے خانماں بربادوں اور مصیبت زدوں کا ملجا و ماوی تھے، کوئی بھی ان کے یہاں سے خالی ہاتھ نہیں جاتے تھے۔

سید محمد ہدی کا ایک بھائی تھا، جس کا نام سید محمد مدح تھا، انہوں نے بھی اپنی پوری عملی زندگی کو اپنے عظیم بھائی سید محمد ہدی کی طرح خدمت خلق میں گزار دیا تھا، سادات فارہ کی بستی جو ان کے آباء کی طرف منسوب ہے، اس میں سید محمد مدح نے ایک بڑا تالات کھدوایا تھا، جو اب بھی ان کی طرف منسوب ہے، ان دونوں بھائیوں نے اسی قصبہ میں ایک پختہ مسجد بھی تعمیر کی تھی، جس کے کھنڈرات اب بھی پائے جاتے ہیں، بہر حال سید محمد ہدی نے سادات فارہ میں انتقال کیا، اور وہیں آسودۂ خاک ہوئے۔

سید محمد موسی صاحب

سید محمد موسی صاحب ستارھویں صدی عیسوی کے ابتدائی عشرے میں قیم کے سادات خاندن میں پیدا ہوئے، ان کی تعلیم اور نشوونما خاندان کے بزرگوں کے سامنے ہوا، یہ بات بار ہالکھی جا چکی ہے کہ ان کے آباء واجداد کسی زمانے میں دین ودعوت کی نسبت سے ارکان آ بسے، اور قیم کے علاقے میں سکونت پذیر ہو گئے تھے، تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلا ہے کہ اس خاندان سادات میں بہت بڑی بڑی شخصیتیں پیدا ہوئیں، جن میں سید محمد ہدی اور سید محمد مدح قابل ذکر ہیں، جن کے تذکرے پچھلی سطور میں اجمالی طور پر کئے جا چکے ہیں۔

سید محمد موسی کی تعلیم وتربیت علاقے میں ہوئی تھی، انہوں نے ایک شیخ طریقت کے مبارک ہاتھ پر بیعت کی اور ریاضت ومجاہدہ کے بعد خلافت بھی حاصل کی تھی، جہاں تک پتہ چلا کہ سید محمد موسی ایک جلیل القدر عالم دین اور شیخ طریقت تھے، سیدزادے ہونے کے ساتھ ایک بزگ ترین شیخ طریقت ہونے کی وجہ سے لوگ آپ کو بڑے احترام کرتے تھے۔

یاد رہے کہ اس سادات خاندان میں سید محمد ہدی، محمد مدح اور سید محمد موسی کے علاوہ اور ایک بڑے انسان کا تذکرہ بھی ملتا ہے، جن کا اسلامی نام تو محفوظ نہیں، تاہم انہوں نے بھی اس علاقے میں بہت ساری ملی وقومی خدمات انجام دی تھیں، کہتے ہیں کہ انہوں نے اپنے جیب خاص سے یہاں کی جالیہ فارہ بستی کو بسایا، اور ساتھ ہی ساتھ وہاں ایک پختہ مسجد بھی بنائی تھی، ان کی طرف منسوب اس مسجد کے کھنڈرات اب بھی وہاں پائے جاتے ہیں، ان کے علاوہ اس سادات خاندان کے اور دو بزرگوں کے تذکرے بھی ملتے ہیں، جن میں سے ایک کا نام محمد اسحاق جب کہ دوسرے کا نام محمد اسماعیل ہے، یہاں ان دونوں کی بھی قابل قدر خدمات تھیں۔

اسی طرح حضرت سید محمد موسی صاحب نے بھی ایک بستی اپنے مصارف سے بسائی تھی، جس کا نام سانخری فارہ ہے، ساتھ ہی انہوں نے اس بستی کی طرف آنے جانے کے لئے ایک راستہ بھی بنایا تھا،

جواب بھی سید صاحب کی طرف منسوب ہے۔

شیخ طریقت حضرت سید محمد موسی صاحب کے ہزاروں مریدان ومتعلقین ارکان میں پھیلے ہوئے تھے، ان کے خلفاء نے ان سے مستفیض ہو کر ارکان میں تبلیغ ودعوت کے ذریعے دین کی روشنیاں پھیلائیں، اور ہزاروں بندگان خدا کی رہنمائی کی تھی۔

غرض سید محمد موسی ایک جلیل القدر عالم دین، داعی الی اللہ، خادم خلق ہونے کے ساتھ ایک زندہ دل بزرگ تھے، مسلمانوں کی فلاح وبہبود کے لئے انہوں نے اپنی مستعار زندگی کو وقف کر رکھا تھا، اس بزرگ خاندان کی نسل اب بھی اس علاقے میں موجود ہے، لیکن معلوم نہیں ہے کہ اسے اپنے آباد و اجداد کے کارنامے اور ان کی عظمت رفتہ کہاں تک معلوم ہے۔

شیخ محمد روشن صاحب

برمی غاصب بدھو پھیہ کے ارکان پر حملے کے دوران وہاں ایک بڑے عالم دین وشیخ طریقت تھے، جن کا نام شیخ محمد روشن تھا، جن کی تعلیم وتربیت اور نشوونما ارکان میں ہوئی اپنے زمانے کے ایک شیخ طریقت کے ہاتھ پر بیعت ہوکر اپنی اصلاح کے بعد عظیم داعی الی اللہ اور شیخ طریقت بنے تھے۔

شیخ محمد روشن ارکان میں ایک مالدار، زمیندار، سخاوت پسند اور علم دوست خاندان میں پیدا ہوئے، انہوں نے تعلیم کی تکمیل ارکان ہی میں کی، اور ایک طویل زمانے تک علمائے ارکان کے سرتاج بنے رہے، اس علاقے کے چند مدارس اسلامیہ ان کی طرف منسوب ہیں۔

برمی راجا بدھو پھیہ کے دیگر مظالم میں ایک بڑا ظلم یہ تھا کہ اس ظالم نے یہاں کے مسلمانوں کی مذہبی آزادی بالکل ختم کردی تھی، اس نے اپنے قلم رو میں ایک قانون ایسا لاگو کردیا تھا کہ جس کی رو سے مسلمانوں کو سور کا گوشت کھانا ضروری تھا، ۱۷۹۸ء میں اس نے مانڈلے اور آمرہ پورہ کے بڑے بڑے علمائے اسلام کو اپنے دربار میں جمع کرکے ان کے سامنے سور کے گوشت ڈال دئے، اور حکم دیا کہ وہ سور کے گوشت کھائیں، ساتھ دھمکی دی کہ جو سور کے گوشت نہیں کھائے گا، اسے قتل کردیا جائے گا، مسٹر ہاروے کے مطابق ان میں سے بہت سارے علماء نے جان بچانے کی خاطر سور کے گوشت کھائے، لیکن جنہوں نے کھانے سے انکار کیا انہیں شہید کردیا گیا تھا۔

اس سلسلے میں اس اوباش نے علمائے اسلام ارکان کو بھی اپنے دربار میں بلایا تھا، ان کے سامنے وہی مذکورہ حرکت کو دھرایا گیا، چنانچہ بہت سے علمائے ارکان نے موت کے ڈر سے سور کے گوشت کھائے، لیکن بہت سے علماء (جن کے سرخیل شیخ محمد روشن صاحب تھے) نے اسے کھانے سے انکار کردیا تو ان ساروں کو شہید کردیا گیا۔ کہتے ہیں کہ اس عزیمت میں شیخ محمد روشن صاحب سمیت کم سے کم چالیس علماء نے جام شہادت نوش فرمایا تھا، دعا ہے کہ اللہ تعالی ان کے درجات بلند فرمائیں۔

شیخ محب اللہ صاحب

شیخ محب اللہ صاحب کی پیدائش بدھو پھیہ کے ارکان پر حملے سے تقریبا تیس سال پہلے ارکان کے مشہور شہر ممبرا میں ہوئی، ان کے والد مرحوم ایک عالم دین اور سخی منش تھے، اور ان کا خاندان ایک مالدار، سخی اور عالم دوست خاندان تھا، کہتے ہیں کہ اس خاندان کے لوگوں نے اس علاقے میں دین اسلام کی بڑی بڑی خدمات کی تھیں، جن کی وجہ سے اس خاندان کے لوگوں کو علاقے میں احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

شیخ محب اللہ صاحب نے اپنے علاقے میں ابتدائی اور متوسطہ کی تعلیم پاکر مروہانگ کی ایک درسگاہ میں داخلہ لیا، جہاں سے انہوں نے اپنی تعلیم مکمل کرلی تھی، کہتے ہیں کہ انہوں نے فراغت تعلیم کے بعد مروہانگ کے ایک شیخ طریقت کے ہاتھ پر بیعت کرکے خرقۂ خلافت حاصل کیا تھا۔

اس بات میں کوئی شک کی گنجائش نہیں ہے کہ شیخ محب اللہ صاحب ایک عالم دین ہونے کے ساتھ ایک زندہ دل فقیہ اور شیخ طریقت تھے، ان کے ہزاروں مریدان اور دسیوں خلفاء ارکان میں پھیلے ہوئے تھے، جنہوں نے بھی اپنی اپنی زندگی کو اپنے شیخ کی طرح درس وتدریس، دعوت دین اور ارشاد وتلقین کے لئے وقف کررکھا تھا۔

شیخ محب اللہ صاحب ایک سماجی آدمی بھی تھے، اور دولت مند ہونے کے ساتھ سخی بھی، ان کے دربار میں دکھی اور پریشان حال آتے تو وہ ان کی مدد کرکے ان کی پریشانیوں کو دور کرنے کی کوشش کرتے تھے، پھر جہاں تک پتہ چلا کہ شیخ محب اللہ صاحب نے اپنے علاقہ سمیت ارکان کے دیگر علاقوں میں مدارس قائم کئے تھے، اور اپنے خلفاء کے ذریعے خانقاہوں کا جال بھی پھیلا رکھا تھا۔

بدھو پھیہ کے عہد حکومت میں ارکان کے مسلمانوں پر مظالم کی آگ برسائی گئی تو شیخ محب اللہ صاحب بھی اس آگ کی لپیٹ میں آگئے تھے، برمی غاصب حکومت نے وہ اور ان کے متبعین پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے تھے، بالآخر سور کے گوشت نہ کھانے کی پاداش میں ان کو شہید کردیا گیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مجاہد اسلام منعم شاہ صاحب شہید

شیخ طریقت، داعی الی اللہ ومجاہد فی سبیل اللہ بابا جی حضرت منعم شاہ صاحب اکیابی کی پیدائش کے متعلق دو باہم متضاد روایات ملتی ہیں، ایک کے مطابق آپ ۱۷۱۵ء عیسوی کے لگ بھگ ارکان کے حالیہ دار الحکومت اکیاب میں پیدا ہوئے، اور آپ کی تعلیم وتربیت اور نشوونما بھی وہیں ہوا، جب کہ ایک اور روایت کے مطابق آپ کی پیدائش ارکان میں نہیں بلکہ سرزمین فارس میں ہوئی، آپ نے اپنی زندگی کی شروع میں دین ودعوت کی خاطر ترک وطن کر کے ارکان میں سکونت اختیار کی تھی۔

روایت ہے کہ بابا جی حضرت شاہ منعم ایک عالم ربانی اور مجاہد فی سبیل اللہ تھے، آپ نے شہر اکیاب اور اس کی اطراف کے مسلمانوں کی دینی، ایمانی اور ایک حد تک سیاسی رہنمائی کی تھی، بدھوپھیہ کی حکومت نے مسلمانوں پر طرح طرح کے مظالم ڈھانا شروع کیا تو آپ نے اس ظالم اور اس کی حکومت کے خلاف آواز اٹھاتے ہوئے جہاد اسلامی کا اعلان کر دیا تھا، بالآخر آپ نے جہاد شروع بھی کر دیا، لیکن تھوڑے عرصہ بعد آپ اور آپ کے سینکڑوں متعین پکڑے گئے، اور آپ کو بھی شہید کر دیا گیا تھا، شہر اکیاب میں بابا جی کا مزار اب بھی زیارت گہ خاص وعام ہے، ہر سال وہاں عرس ہوتا ہے، جس میں نہ صرف اکیاب بلکہ اطراف واکناف کے مسلمان شریک ہوتے ہیں۔

حضرت منعم شاہ صاحب کی ذات وشخصیت اور آپ کی شہادت کے متعلق بہت سارے باتیں مشہور ہیں، جن سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آپ ایک جلیل القدر عالم دین، داعی الی اللہ، صاحب نظر شیخ طریقت اور مجاہد فی سبیل اللہ تھے، جنہوں نے اپنی زندگی میں رخصت کے بجائے عزیمت پر عمل کیا تھا۔

ارکان کے معروف شاعر، سیاسی وتاجر شخصیت عبد الکریم معروف بہ شجاع قاضی صاحب کے دیوان ''روشنگ پنچالی'' میں حضرت شاہ منعم کی ذات عالی صفات اور آپ کے جہاد اسلامی کے متعلق کچھ تفصیلات پائی جاتی ہیں، ان ساری تفصیلات کی گنجائش تو یہاں نہیں، تاہم اس دیوان کی تصریحات کے مطابق اس زمانے کے ایک ارکانی جنرل جس کا نام ڈمنائنگ (شاید مسلمان ہو) تھا، وہ حضرت منعم شاہ صاحب کا معتقد تھا، اس نے حضرت منعم شاہ صاحب کے خلیفہ فقیر حسین کے جہادی قافلہ میں شامل ہو کے برمیوں کے خلاف جہاد کیا تھا، جس میں فقیر حسین صاحب سمیت جنرل ڈمنائنگ بھی شہید ہو گئے تھے۔

شیخ محمد عثمان صاحب

بدھوپھیہ کے دور حکومت میں سرزمین ارکان میں ایک مرد مجاہد، عالم ربانی اور شیخ طریقت تھے، جن کا نام شیخ محمد عثمان تھا، جنہوں نے اپنی علمی، دعوتی اور اصلاحی کوششوں کے ذریعے یہاں کی سرزمین کو روشن ومنور رکھا تھا، چنانچہ ان کی ذات وشخصیت سے یہاں کے مسلمانوں کو بہت ہی فائدہ پہنچا تھا۔

شیخ محمد عثمان صاحب کی پیدائش ممبرا میں ہوئی تھی، ان کے والد ایک بزرگ صفت تاجر تھا، اور دینداری اور پرہیزگاری کے حوالے سے بھی علاقے بھر میں مشہور ومعروف تھا، شیخ محمد عثمان کی ابتدائی اور متوسطہ کی تعلیم خاندانی بزرگوں کے ساتھ علاقے کے علمائے کرام کے ہاتھوں ہوئی، اس کے بعد انہوں نے مزید تعلیم کے حصول کے لئے کیا کتو، مروہانگ اور حالیہ ارکان کے دار الحکومت اکیاب کا سفر کیا، چنانچہ وہاں کے علمائے کرام سے مستفید ہو کر اپنی تعلیم مکمل کر لی تھی۔

شیخ محمد عثمان صاحب فراغت تعلیم کے بعد تدریسی خدمات سے منسلک ہو گئے تھے، وہ بڑے پائے کے استاد و مدرس تھے، افہام وتفہیم کے حوالے سے بھی نہایت مشہور تھے، ان کے نحو وصرف، ادب و بلاغت، منطق وفلسفہ، فقہ اسلامی اور تفسیر وحدیث کا درس کافی مشہور تھا، چنانچہ ان سے استفادہ کر کے سینکڑوں علماء ارکان میں پھیل گئے، اور جہاں بھی گئے انہوں نے بھی علم دین کے ذریعے اسلام کی شمعیں جلائی تھیں، علاوہ ازیں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شیخ محمد عثمان صاحب ایک مرد مجاہد تھے، انہوں نے اپنے تلامذہ کو بدھوپھیا اور اس کی ظالم حکومت کے خلاف لڑنے کے لئے جہاد کی طرف بھی توجہ دلائی تھی، ایک حد تک اس کا نتیجہ بھی مثبت نکلا تھا۔

لیکن آخر کار بدھوپھیہ ظالم حکمران کے دور حکومت میں وہ اور ان کے متبعین پر ایسے ایسے مظالم ڈھائے گئے کہ جن کی لپیٹ میں آ کر وہ اور ان کے متبعین سمیت ہزاروں مسلمان شہید ہو گئے تھے، خود شیخ کو سور کے گوشت نہ کھانے کی پاداش میں شہید کر دیا گیا تھا، ان کی شہادت کے بعد ان کے متبعین اور یہاں کے مسلمانوں نے اعلان جہاد کیا، لیکن جنہوں نے اعلان جہاد کیا ان کو بھی شہید کر دیا گیا تھا۔

مولانا عبدالرحمن مصری صاحب

مولانا عبدالرحمن مصری صاحب سنڈوے کے ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے، آپ کے والد ایک زمیندار اور سخی انسان تھے، زمینداری کے علاوہ تجارت میں بھی ان کا بڑا حصہ رہا تھا، مولانا عبد الرحمن کی ابتدائی اور متوسطہ کی دینی تعلیم ارکان میں اور اعلی دینی تعلیم ہندوستان میں ہوئی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد انہوں نے تجارت سے دلچسپی لی، ساتھ ساتھ ارکانی مسلمانوں کے سماجی اور فلاحی کاموں کی طرف توجہ دی تھی، چنانچہ انہوں نے اپنے علاقے میں بہت سارے مکاتب اور مدرسے قائم کئے تھے، علاوہ ازیں مسلم طلباء کو بنگال اور ہندوستان بھیجنے میں انہوں نے بڑی مدد کی تھی، چنانچہ ان کے مالی تعاون سے بہتوں ارکانی مسلم طلباء بنگال اور ہندوستان جاکر دینی تعلیم حاصل کر کے وطن آئے اور یہاں آکر دین اور علم دین کی خدمت میں مصروف عمل ہوئے تھے۔
مولانا عبد الرحمن صاحب نے سماجی کاموں کے سلسلے میں اپنے علاقے میں بہت ساری بستیاں بنوائیں، جن میں بے گھروں کو بسایا گیا تھا، چنانچہ کہتے ہیں کہ سانڈوے کی مشہور مسلم بستی ''زادی پرانگ'' بھی ان کی بنوائی ہوئی بستی ہے۔
بعض روایات کے مطابق مولانا عبدالرحمن صاحب سیاست سے بھی کافی دلچسپی رکھتے تھے، لیکن اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی سیاست سے زیادہ سماجی کاموں کی طرف توجہ زیادہ تھی، مولانا صاحب اپنے باپ کی طرح ایک سخاوت پسند انسان تھے، کسی بھی حاجت مند کو وہ خالی ہاتھ واپس نہیں کرتے تھے، جتنا بھی ممکن ہوتا تھا وہ ان کی خدمت کیا کرتے تھے، علاوہ ازیں وہ دینداری اور پرہیز گاری کے حوالے سے بھی یکتائے روزگار تھے، کہتے ہیں کہ وہ دعوت دین کے حوالے سے گاؤں گاؤں پھرا کرتے تھے، بہر حال انہوں نے اپنی زندگی کو مسلمانوں کی بہبودی کے لئے وقف کر دیا تھا، انہوں نے ایک طویل مدت تک مسلمانوں کی خدمت کرتے ہوئے سنڈوے میں انتقال کیا، اور وہیں مدفون ہیں۔

شیخ محمد حسن شاہ غوری

شیخ محمد حسن شاہ کی پیدائش اٹھارھویں صدی کی ابتداء میں مروہانگ (پتھری قلعہ) میں ہوئی، وہ نسلا غوری تھے، ان کا خاندان ایک دولت مند خاندان ہونے کے ساتھ دین پسند خاندان تھا، وہ اپنے زمانے میں ان کے خاندان کے چشم و چراغ تھے۔
محمد حسن شاہ کی ابتدائی تعلیم مروہانگ میں ہوئی، اس کے بعد وہ تعلیم کے سلسلے میں اکیاب وغیرہ کا سفر کیا، اور وقت کے بڑے بڑے علماء فضلاء سے مستفید ہو کے گھر لوٹے تھے، فراغت کے بعد انہوں نے خاندان الاول کے ایک مرشد برحق (ایک روایت کے مطابق حضرت حسن شاہ صاحبؒ) کے مبارک ہاتھ پر ہاتھ دے کر بیعت کی اور ایک طویل مدت ریاضت کے بعد خلعت اجازت سے سرفراز ہوئے تھے۔
تعلیم و تربیت سے فراغت کے بعد حضرت غوری صاحب نے اپنی آبائی بستی سے دعوت و ارشاد کا سلسلہ شروع کیا، دیکھتے ہی دیکھتے علاقے بھر کے عوام آپ کی طرف رجوع کرنے لگے، چنانچہ اس علاقے میں ان کے ہزاروں مریدان و متعلقین اور خلفاء سامنے آگئے تھے۔
لیکن زندگی کے آخری حصے میں شیخ حسن صاحب پر جذب و مستی کی حالت طاری ہوجاتی تو وہ کبھی کبھار جنگلوں اور ویرانوں کی طرف نکل جاتے تھے، لیکن جبھی وہ عام حالت میں لوٹ آتے تو واپس گھر چلے آتے اور معمول کے مطابق رشد و ہدایت کے کاموں میں مشغول ہوجاتے تھے۔
شیخ محمد حسن صاحب ایک صاحب کشف و کرامات بزرگ تھے، ان کی طرف منسوب کرامات کی چند کہانیاں لوگوں کی زبانی بطور روایت سننے میں آئیں، لیکن اس عجالے میں ان کہانیوں کی طرف جانا مناسب نہیں، اس لئے ان سے پہلوتہی کی جارہی ہے۔
بہر حال شیخ محمد حسن صاحبؒ ارکان کے ان اہل کمال میں سے ایک تھے کہ جن کی کوشش سے یہاں دعوت و ارشاد اور تعلیم و تعلم کا کام بڑی خوبی سے انجام پایا تھا، انہوں نے بھر پور عمر گزار کر ارکان کے معروف قصبہ ''بندر'' میں وفات پائی، وہیں آسودۂ خاک ہیں۔

حکیم عبدالشکور صاحب ممبراوی

حکیم عبدالشکور صاحب ممبرا کی معروف مسلم بستی قیم میں تقریبا ۱۸۳۰ء میں پیدا ہوئے، ان کے خاندان کا شمار یہاں کے دولت مند خاندانوں میں ہوتا تھا، کہتے ہیں کہ ان کے والد صاحب ایک دولت مند ہونے کے ساتھ ایک معروف سخی منش تھے، جنہوں نے اپنی ثروت و دولت کے ذریعے لوگوں کی بڑی خدمت کی تھی۔

عبدالشکور صاحب نے ابتدائی دینی تعلیم اپنے علاقے کے ایک بزرگ خوندکار یعنی مولوی صاحب سے حاصل کی، بعد میں انہوں نے تعلیم کے سلسلے میں کیوکتو، اکیاب کے علاوہ دیگر شہروں کا سفر کیا، جہاں بھی گئے وہاں کے علمائے کرام سے بھر پور استفادہ کرکے علم کی دولت سے مالا مال ہوگئے تھے۔

دینی تعلیم سے فراغت کے بعد عبدالشکور صاحب کی طبیعت علم طب کی طرف مائل ہوگئ، اگر چہ انہوں نے اپنے علاقے کے ایک طبیب سے یہ فن سیکھا تھا، لیکن اس حوالے سے انہوں نے بقراط وسقراط، افلاطون وارسطو وغیرہ کے ساتھ فارابی اور ابن سینا کو مطالعہ کے علی الرغم زمانے کے جدید طب وحکمت کا بھی مطالعہ کیا تھا، اس حوالے سے ایک روایت یہ بھی ہے انہوں نے طب وحکمت سیکھنے کے لئے بنگال اور ہندوستان کا بھی سفر کیا تھا، جس کے بعد وہ وطن آکے یہاں والوں کی بڑی خدمت کی تھی، ویسے وہ حکیم صاحب کے خطاب سے پہنچانے جانے لگے تھے۔

ظاہر ہے کہ حکیم عبدالشکور صاحب ایک دولت مند باپ کے صاحب زادہ تھے، جب کہ انہوں نے خود بھی خاصی دولت کمائی تھی، چنانچہ انہوں نے اپنے والد صاحب کی طرح اپنی دولت وثروت سے یہاں کے لوگوں کی بڑی خدمت کی تھی، سینکڑوں مصیبت کے مارے ہوؤں کو ان کی مصیبت سے رہائی دلائی، اور سینکڑوں حاجت مندوں کی حاجات پوری کی تھیں، بالآخر اللہ کے اس مخلص بندہ نے ممبرا میں داعی اجل کو لبیک کہا، اور وہیں مدفون ہیں۔

مولانا عبدالرحمن صاحب

مولانا عبدالرحمن صاحب سنڈوے میں انیسویں صدی کے آغاز میں ایک عالم دین گزرے ہیں، ان کے متعلق پتہ نہیں چل سکا کہ آیا ان کی پیدائش ارکان میں ہوئی یا ارکان کے باہر سے آکر یہاں انہوں نے خدمات انجام دی تھیں، تاہم اتنا ضرور پتہ چلا کہ آپ ایک جلیل القدر عالم اور داعی الی اللہ تھے، جنہوں نے اس علاقے کے لاکھوں مسلمانوں کو شرک بدعات کی اندھیاری سے بچا لیا تھا، کہتے ہیں کہ ان کے یہاں آنے سے قبل یہاں کی ایک مسلم بستی کے لوگ مرتد ہوگئے تھے، اس ارتداد کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ:

> ”مواڈو بستی والے میڈو اور زیر بادی مسلمانوں کے اندر رواداری کا جذبہ حد سے بڑھ گیا تھا، ان کے ایسے حالات میں وہاں کے بعض ناعاقبت اندیش مولویوں نے ان کے مابین دعوت دین کو عام کرنے کے بجائے ان پر مشرک ہونے کا الزام لگانا شروع کر دیا تھا، بالآخر وہ لوگ ان مولویوں سے ناراض ہوکر حلقۂ اسلام سے نکل کر بت پرست بن گئے تھے، اعوذ باللہ من ذالک“۔

ایسے حالات میں مولانا عبدالرحمن صاحب اٹھے، جنہوں نے یہاں کے ان مرتدین کو دعوت دین کے ذریعے اسلام سے آشنا کراتے ہوئے انہیں دوبارہ اسلام کے حلقے میں داخل کر لیا تھا، تو ظاہر ہے کہ مولانا کی یہ عظیم خدمت بھولے سے بھی بھلائے جانے کی قابل نہیں ہے۔

مولانا عبدالرحمن صاحب ایک مایۂ ناز عالم دین اور داعی الی اللہ تھے، کہتے ہیں کہ ان کے پند ونصیحت اور وعظ وتلقین میں زبردست تاثیر تھی، جنہوں نے اپنی مبصرانہ وعالمانہ، مبلغانہ اور داعیانہ کوشش سے یہاں کے پورے علاقے کو اسلام کی روشنی سے تاباں ومنور کیا تھا۔

علاوہ ازیں مولانا عبدالرحمن صاحب نے یہاں ایک درسگاہ کی بنیاد بھی رکھی، جہاں سے اس زمانے اور بعد میں بھی بڑے بڑے علماء پیدا ہوئے، جنہوں نے بھی اپنے مرشد کی طرح جہاں بھی رہے یا گئے دین کی شمعیں جلائیں، اور ایک عالم کو روشن کر دیا تھا۔ مولانا سنڈوے میں مدفون ہیں۔

مولانا عبداللہ صاحب

مولانا عبداللہ المعروف بہ لائی فقیر کی پیدائش بالائی برما کے مشہور شہر مانڈلے میں ہوئی، ان کا خاندان ایک مالدار اور سخی خاندان تھا، ان کی تعلیم مانڈلے میں ہوئی، فراغت تعلیم کے بعد انہوں نے تجارت سے دلچسپی لی، اور پیسے بھی بہت کمائے تھے۔

اس کے بعد مولانا عبد اللہ صاحب ایک ارکانی داعی اور مرشد برحق کے مرید ہو گئے، اور خلعت اجازت و بیعت سے بھی سرفراز ہو گئے تھے، بعد ازاں ایک طویل مدت تک دعوت وتبلیغ اور رشد و ہدایت کے کاموں میں ہمہ تن مصروف رہے، چنانچہ دعوت وتبلیغ کی نسبت سے ان کی شہرت چار دانگ عالم میں عام ہوگئی تھی، ایسی حالت میں سرزمین ارکان کے معروف شاعر، تاجر اور سیاست دان مولانا عبدالکریم معروف بہ شجاع قاضی سے ان کی ملاقات ہوگئی تھی، کریم صاحب نے ان کو ارکان آنے کی دعوت دی تو انہوں نے اس دعوت کو قبول کرتے ہوئے ارکان آنا مناسب سمجھا تھا۔

مولانا عبداللہ صاحب ارکان تشریف لائے تو قاضی عبدالکریم صاحب نے اپنی لاڈلی بیٹی کا نکاح ان سے کرا دیا، چنانچہ دونوں میاں بیوی یاد الٰہی کے تہ بتہ رشد و ہدایت کے کاموں میں مصروف عمل ہو گئے، کہتے ہیں کہ ان کے یہاں منتسبین ومریدین کا ہمیشہ ہجوم رہتا تھا، ویسے ان سے ہزاروں بندگان خدا مستفید ہوئے تھے۔

کہتے ہیں کہ مولانا عبداللہ صاحب کی توجہ صرف مسلمانوں کی اصلاح کی طرف نہیں تھا، بلکہ انہوں نے اپنی توجہ غیر مسلموں کی طرف بھی دے رکھی تھی، چنانچہ ان کی داعیانہ ومبلغانہ کوششوں کی وجہ سے سینکڑوں غیر مسلموں کو اسلام کے حلقے میں داخل ہونے کی توفیق ہوگئی تھی، چوں کہ مولانا ایک مال دار آدمی تھے، چنانچہ انہوں نے اپنے اموال کو دین کی خدمت میں لگایا تھا۔

مولانا عبداللہ صاحب پر عمر کے آخری حصے میں جذب طاری ہوگئی تھی، ایسی حالت میں وہ جنگلوں اور ویرانوں میں پھرا کرتے تھے، آخر کار انہوں نے یہاں وفات پائی، قیم کے بدر مقام کے قریب ان کا مقبرہ زیارت گہِ خاص و عام ہے۔

الحاج مولانا عبدالجبار شہید انڈ انگی

الحاج مولانا عبد الجبار صاحب ۱۲۸۵ھ بمطابق ۱۸۶۷ء بمقام انڈانگ (راسیدنگ) میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم بستی کے مکتب میں مولوی کالو صاحب کے یہاں پائی، چونکہ مولانا کے والد ماجد میانجی واعظ الدین صاحب تعلیم وتربیت کا غیر معمولی جذبہ رکھتے تھے، اس لئے مولانا کی ابتدائی تعلیم بڑی خوبی سے ہوئی تھی۔

مولانا عبد الجبار صاحب ۱۸۸۵ء میں جنوبی منگڈو کی معروف بستی باغگونہ گئے اور مولانا علی اکبر صاحب کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے تھے، باغگونہ گذشتہ صدیوں میں ارباب علم وفن کا مرکز رہ چکا تھا، چنانچہ مولانا علی اکبر صاحب کا مدرسہ یہاں تشنگان علوم وفنون کا گویا چشمۂ حیات بنا ہوا تھا، چنانچہ مولانا عبدالجبار صاحب نے یہاں نہایت محنت ومشقت سے استفادہ کیا، استاد نے بھی اپنی خاص توجہ اور لطف وعنایت سے اپنی اولاد کی طرح انہیں تعلیم دینے میں کوئی کوتاہی نہیں کی، ویسے آپ نے یہیں سے متوسطہ کی تعلیم مکمل کی، اس کے بعد ۱۸۹۰ء میں اعلی دینی تعلیم کے لئے کلکتہ گئے، اور وہاں کی مشہور ومعروف درسگاہ مدرسہ عالیہ میں داخل ہو گئے تھے، یہاں سے ۱۸۹۵ء میں سند فراغت حاصل کر کے وطن آئے اور درس وتدریس اور دعوت وارشاد کے کاموں میں ہمہ تن مصروف ہو گئے تھے۔

۱۸۹۶ء کی ابتدا میں مولانا نے حاجی عظیم الدین (برادر خورد مولانا الحاج احمد علی) علی تانجوی کی لڑکی مسماۃ بالابی سے شادی کی، موصوفہ نہایت ادب شناس، سلیقہ منداور مزاج دان خاتون تھی، اس کے بطن سے مولانا کے پانچ بیٹے اور دو بیٹیاں پیدا ہوئیں، قدرت کو منظور تھا کہ بالابی سن ۱۹۱۹ء کی مشہور کھانسی بیماری کی شکار ہوکر انتقال کرگئی، اس کے انتقال کے بعد مولانا عبدالجبار صاحب نے دوسری شادی حاجی عظیم الدین صاحب کی لڑکی مقیمہ خاتون سے کی، جس کے بطن سے حضرت مولانا جلال الدین صاحب پیدا ہوئے، جو صدیق محترم پروفیسر ڈاکٹر محب الدین عبدالسبحان واعظ صاحب کے والد گرامی ہیں۔

مولانا عبدالجبار صاحب نے ۱۹۲۴ء میں اپنے بھائی حاجی عبدالستار کی ہمراہ حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ منورہ کی سعادت حاصل کی، اس کے بعد وطن واپس آ گئے تھے۔

ظاہر ہے کہ مولانا عبدالجبار صاحب کے چھ صاحب زادے اور دو صاحب زادیاں تھیں، جن کے نام بالترتیب یہ ہیں:

۱۔حاجی سعید احمد۔

۲۔حاجی احمد اللہ۔

۳۔حاجی عبدالمالک۔

۴۔الحاج مولانا بشیر اللہ۔

۵۔حاجی نذیر احمد۔

الحاج مولانا جلال الدین عبدالسبحان واعظ۔

۷۔راحت النساء۔

۸۔آسیہ خاتون۔

مولانا عبدالجبار صاحب نہایت سیدھے سادھے وضع قطع کے عالم باعمل ایک درویش صفت انسان تھے، آپ کے علمی کمالات کی فہرست بڑی طوالانی ہے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے حوالے سے آپ کا مرتبہ بہت بلند تھا، اتباع سنت اور پابندی شریعت میں یکتائے روزگار تھے، درس وتدریس اور اصلاح وارشاد گویا آپ کا شعار بن چکا تھا، آپ نے اپنے علاقے میں ایک مدرسہ کی تاسیس کی تھی، جس میں آپ عرصۂ دراز تک تعلیم دیتے رہے تھے، مولانا سعید کریم کلومی، الحاج مولانا افلاطون اور الحاج مولانا شفیق الرحمن آپ کے نامور تلامذہ ہیں۔

علمی فضیلت کے ساتھ مولانا عبدالجبار صاحب کو نظم پروئی اور قصیدہ گوئی کا بھی اعلی ذوق تھا، چنانچہ آپ کا ۱۸۹۷ء کے دوران نظم کیا ہوا قصیدہ ''قصیدۂ بے نمازی ومناجات دلسوزی'' اب بھی زبان زد خاص وعام ہے، یہ قصیدہ آپ نے اپنی مادری زبان ''روہنگیا'' میں لکھا ہے، جو عربی رسم الخط میں ہے، یہ قصیدہ طبع ہو کر منظر عام پر آیا، اور جو میری نظر سے بھی گزرا ہے۔

مولانا عبدالجبار صاحب کسب حلال پر نہایت زور دیا کرتے تھے، چنانچہ آپ کا مقولہ ہے کہ ''کسب حلال کے بغیر روحانی کمالات کے دروازے نہیں کھلتے''۔

مولانا عبدالجبار صاحب نے سلوک وطریقت کے مقامات حضرت مولانا شاہ عبید اللہ صاحب سندی فرانگی بوسیدنگی کے مبارک ہاتھ میں بیعت ہو کر سبقا سبقا طے کئے، اور تکمیل کے بعد آپ کو خرقۂ خلافت عطا کیا گیا تھا، ظاہر ہے کہ آپ نقشبندی مجددی تھے، لیکن آپ کو طریقۂ عالیہ چشتیہ میں بھی اجازت حاصل تھی، چنانچہ اطراف واکناف کے بہت سارے لوگوں نے آپ کے مبارک ہاتھ پر بیعت ہو کے اپنی اپنی زندگیاں سنواریں، مولانا پر عمر کے آخری حصے میں تصوف وسلوک کا رنگ غالب آ گیا تھا۔

مولانا عبدالجبار صاحب ایک بلند پایہ کے عالم باعمل اور کامل شیخ طریقت تھے، ان کا قصیدہ ''قصیدۂ بے نمازی ومناجاتِ دلسوزی'' روہنگیا زبان میں نظم کیا ہوا ایک مقبول وموثر قصیدہ ہے، آپ اپریل/ ۱۹۴۲ء مطابق ۱۴/ ربیع الاول/ ۱۳۶۱ھ میں جاپان برطانیہ کی جنگ کے زمانے، مگھ اور مسلمانوں کے مابین ہونے والے خونی فسادات کے دوران ظالم وحشی مگھوں کے ہاتھوں شہید ہوئے، اللہ تعالی آپ کے درجات بلند فرمائے، آمین۔

مولانا قاضی فضل احمد مروہانگی

مولانا فضل احمد صاحب کی پیدائش ارکان کے قدیم دار الحکومت مروہانگ میں انیسویں صدی کی ابتداء میں ہوئی ،ان کا خاندان علماء اور فضلاء کا خاندان تھا، پھرایک روایت یہ بھی ہے کہ ان کے خاندان قدیم زمانے سے ارکان کا حکمران خاندان تھا۔

مولانا فضل احمد کی تعلیم ان کی آبائی بستی کے مکتب سے شروع ہوئی ،اس کے بعد اکیاب کے علاوہ دیگر ارکان کی درس گاہوں سے مستفید ہوکر ہندوستان پہنچے ، اور دہلی کی ایک درسگاہ میں عرصۂ دراز تک تعلیم پاتے رہے، بعد میں کلکتہ آئے ،اور مدرسہ عالیہ کلکتہ میں ان کی تعلیم مکمل ہوئی۔

تعلیم سے فراغت کے بعد سیدھے وطن واپس آئے ،اور خاندان کے بعض افراد سے ان کی کشمکش ہوئی تو وہ بنگال چلے گئے، جہاں تک پتہ چلا کہ ان کی یہ کشمکش دراصل ایک سیاسی کشمکش تھی، چنانچہ اس حوالے سے معلوم ہوا کہ ان کے خاندان کے ایک عالم دین سے منصب قضاء کے سوال پر کشمکش ہوئی تھی۔

مولانا نے کلکتہ اور ڈھاکہ میں ایک طویل مدت گزار دی، اس دوران انہوں نے ایک شیخ کامل کی تلاش میں بنگال کے طول وعرض کا سفر کیا، اس سلسلے میں وہ کھلنا پہنچے، اور وہاں کے معروف شیخ طریقت حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز کے مبارک ہاتھ پر ہاتھ دے کر بیعت ہوئے، شیخ کی خدمت میں انہوں نے ایک طویل مدت گزاری، اس کے بعد شیخ کی ایماء پر وہ مشرقی بنگال چلے آئے، اور ایک دینی مدرسہ میں تعلیم دیتے رہے، بعد میں وہ خلعتِ اجازت وبیعت سے سرفراز ہو کے وطن واپس آئے تھے۔

مولانا فضل احمد صاحب وطن واپس آئے تو ان کا بھرپور استقبال ہوا، چوں کہ یہاں وطن میں ان کے پیر بھائیوں کا غلبہ تھا، یوں کسی کو ہمت بھی نہیں ہوئی کہ ان کی راہ روکی جائے، حکومت کی طرف سے بھی ان کو قاضی مقرر کیا گیا تھا، ساتھ ہی ساتھ وہ سلسلۂ طریقت میں بھی کام کرتے رہے تھے، چنانچہ یہاں کے مسلمان بڑی تعداد میں ان کے مرید ہو گئے، ان کے چند خلفاء بھی اس علاقے میں موجود تھے، بالآخر دین کی خدمات انجام دیتے ہوئے وہ اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔

مولانا فضل الکریم مروہانگی

مولانا فضل الکریم صاحب کی پیدائش بیسویں صدی کے آغاز میں ارکان کے قدیم دارالحکومت مروہانگ میں ہوئی، ان کا خاندان بزرگوں اور مشائخ کا خاندان تھا، تقوی و پرہیزگاری اور علم وعمل کے حوالے سے یہ خاندان اس علاقے کا مایۂ ناز خاندان تھا، علاوہ ازیں اس خاندان کے بہت سارے علماء اور فضلاء قومی وملی خدمات بھی انجام دیتے رہے تھے۔

مولانا کی تعلیم کا آغاز خاندان کے بزرگوں کے ہاتھ میں ہوا، اس کے بعد اعلی تعلیم کے لئے ہندوستان کا کا سفر کیا، لکھنو اور دہلی کے مدارس سے استفادہ کرنے کے بعد تعلیم کی تکمیل کے لئے مدرسہ عالیہ کلکتے میں داخلہ لیا، جہاں سے انہوں نے تعلیم مکمل کر لی۔

کہتے ہیں کہ مولانا فضل الکریم صاحب نے کلکتے کے دوران تعلیم حضرت مولانا عبد العزیز صاحب کھلنویؒ سے نسبت قائم کر لی تھی، تعلیم مکمل کرنے کے بعد مولانا کھلنا پہنچے اور شیخ کی خدمت میں رہ کر ریاضت ومجاہدہ کیا، دراں حالیکہ وہاں شیخ کی خدمت میں چند ارکانی علمائے کرام بھی تھے، آخر ان کی حاضری میں مولانا کو خلعت اجازت سے نوازا گیا، بعد میں یہ سارے علماء حضرات ارکان چلے آئے اور یہاں کی سرزمین کو طریقۂ عالیہ مجددیہ نقشبندیہ کے انوار وبرکات سے روشن اور تاباں کیا تھا۔

مولانا فضل الکریم صاحب نے اپنے علاقے میں عرصۂ دراز تک علم دین کی خدمات کے تہ بتہ پند و نصیحت اور ارشاد وتلقین کے ذریعے یہاں کے عوام کو راہِ راست پر لانے کی جدوجہد کی، اور ارکان کے قدیم دارالحکومت میں رہتے ہوئے دین کی خدمات بہت ہی اعلی حکمت عملی کے ساتھ انجام دیں، اور یہاں علم وعرفان کا ایک دریا بہا دیا تھا۔

آپ شمالی ارکان کی طرف کبھی تشریف نہیں لائے تھے، لیکن یہاں کے ایک بھاری تعداد مسلمانوں نے ان کے یہاں جا کر فیض حاصل کیا تھا، چنانچہ عرصۂ دراز تک دین کی خدمات انجام دیتے ہوئی انہوں نے اس جہاںِ فانی سے رخصت لی، اور مروہانگ میں اسودۂ خاک ہوئے۔

مولانا محمد حسن شاہ ممبراویؒ

مولانا محمد حسن شاہ صاحب کی پیدائش انیسویں صدی کے وسطی دہائی میں قصبۂ قیم میں ایک دیندار اور زمیندار خاندان میں ہوئی، آپ کے والد صاحب ایک زمیندار اور سخی انسان تھے، انہوں نے علاقے کے بہتوں مسلم بچوں کو علم کی دولت سے مالا مال کرنے کے لئے امداد و تعاون کیا تھا۔

حسن شاہ صاحب کی تعلیم و تربیت مرو ہانگ، کیوکتو اور اکیاب میں ہوئی تھی، تعلیم سے فراغت کے بعد انہوں نے خاندان الاول کے ایک بزرگ ترین ہستی کے ہاتھ پر بیعت کی اور عرصۂ دراز کی ریاضت و مجاہدہ کے نتیجے ان کو اجازت سے نوازا گیا۔

بعض لوگوں کی روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مولانا محمد حسن شاہ صاحب تعلیم سے فراغت کے بعد گھر کے کام کاج میں مشغول ہو گئے تھے، اس کے بعد آپ نے بیعت کی، جس کے بعد آپ پر جذب کی حالت طاری ہو گئی تھی، چنانچہ آپ جذب کی حالت میں بستی سے نکل کر جنگلوں، ویرانوں اور صحراؤں میں گھما پھرا کرتے تھے، لیکن جبھی جذب کی حالت ختم ہو جاتی تو آپ اپنی بستی میں کبھی پیدل اور کبھی کسی شیر پر سوار ہو کر واپس آتے اور تعلیم و تلقین اور رشد و ہدایت کے کاموں میں مشغول ہو جاتے تھے۔

مولانا محمد حسن شاہ کی متعدد کرامات اور خرق عادات کی کہانیاں سننے میں آئیں، جن سے معلوم ہوا ہے کہ آپ ایک صاحب کشف و کرامات بزرگ تھے، ایک رویت سے یہ معلوم بھی ہوا ہے کہ آپ لوگوں کو آئندہ آنے والی مصیبتوں اور آزمائشوں سے باخبر کیا کرتے تھے۔

مولانا محمد حسن شاہ نے اپنی مستعار زندگی کے آخری حصے میں ایک پہاڑی پر جا کر چلہ کشی شروع کی، لوگ وہاں بھی جاتے تو عام حالت میں آپ کے روحانی فیوض سے مستفید ہو سکتے تھے، لیکن جبھی آپ پر جذب کی حالت طاری ہو جاتی تو آپ لوگوں سے متنفر ہوتے اور انہیں وہاں سے بھگانے کوشش کرتے تھے۔ غرض آپ نے اپنی زندگی کے آخری ایام کو چلہ کشی میں گزارتے ہوئے داعی اجل کو لبیک کہا، آج بھی آپ کا یہ چلہ خانہ زیارت گہ عام ہے، جس کے بغل میں آپ کا مزار پاک موجود ہے۔

مولانا مخلص الرحمن چاند ماہیؒ

مولانا مخلص الرحمن صاحب انیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں موضع چاند ماہ (اکیاب کا قریبی علاقہ) میں پیدا ہوئے۔ آپ کے خاندان کے حالات کا سراغ نہ مل سکا، اور آپ کی طرف منسوب کسی بزرگ سے میری ملاقات بھی نہ ہو سکی، مگر جہاں تک ذرائع سے معلوم ہوا کہ آپ ایک جلیل القدر عالم دین، فقیہ النفس اور شیخ طریقت تھے، مطالعہ کی وسعت کے ساتھ سیاسیات پر بھی آپ کی گہری نظر تھی۔

ایک روایت کے مطابق آپ نے اعلیٰ تعلیم ہندوستان کی درسگاہوں میں پائی، دوران تعلیم آپ نے حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب کھلناوی ؒ سے نسبت قائم کر لی، اور فراغت کے بعد ارکان کے دیگر بزرگوں کی طرح مرشد برحق کے پاس رہتے ہوئے طویل مدت تک ریاضت و مجاہدہ کیا، اس کے بعد خلعت اجازت سے سرفراز ہو کے وطن واپس آئے تھے۔

یاد رہے کہ مولانا عبدالعزیز کھلناویؒ کے خلفائے کرام بنگال، آسام، الہ آباد، لکھنؤ، بہار اور اڑیسہ میں پھیلے ہوئے تھے، مگر ان کے خلیفۂ اعظم کا تعلق سرزمین ارکان سے ہے، وہ ہیں حضرت مولانا عبدالشکور میورکلی، پھر جہاں تک پتہ چلا کہ حضرت مولانا مخلص الرحمن کا مقام بھی مولانا کھلنویؒ کے خلفائے کرام میں نہایت بلند تھا، تقویٰ شعاری، پرہیزگاری کے ساتھ خدمت خلق کے حوالے سے آپ کی خدمات اپنے زمانے میں پورے ارکان میں پھیلی ہوئی تھیں، کہتے ہیں کہ آپ قامع بدعات و خرافات تھے، لیکن سمع بغیر مزامیر کے دالدادہ بھی تھے، بہرحال آپ نے اپنے زمانے میں علم و عرفان سے پوری سرزمین ارکان کو روشن اور تاباں کر رکھا تھا، اور ہزاروں لوگ آپ سے مستفید ہو چکے تھے۔

مولانا کے بہت سارے مریدان ارکان میں پھیلے ہوئے تھے، تاہم کسی خلفاء کا پتہ نہ چل سکا، چوں کہ آپ قامع بدعت و خرافات تھے، چنانچہ ایک زمانے تک وہاں کے بدعتی لوگ آپ کے دشمن بن چکے تھے، لیکن بعد میں آپ کی پرہیزگاری اور تقویٰ شعاری سے متاثر ہو کر ان کی اکثریت نے توبہ کر لی تھی، آپ نے عرصۂ دراز تک دین و ایمان کے کاموں میں مشغول رہتے ہوئے جان کو جان آفرین کا حوالہ کر دیا، اپنے آبائی بستی میں مدفون ہیں۔

مولانا محمد عمر صاحب

مولانا محمد عمر صاحب انیسویں صدی کی ابتداء میں کیوکتو کی مشہور بستی خنڈل میں پیدا ہوئے، ان کا نسبی تعلق ارکان کے عظیم شاعر و شیخ طریقت حضرت سید الاول سے ہے، وہ اپنے زمانے میں خاندان الاول کے مربی بلکہ رکھوالا تھے، کم سے کم اس خاندان میں ان کی بات کو حرف آخر سمجھا جاتا تھا۔

مولانا کی ابتدائی تعلیم کیوکتو کے علماء ومشائخ کے پاس ہوئی، اس کے بعد حصول علم دین کی خاطر انہوں نے بنگال اور ہندوستان کا سفر کیا، روایت ہے کہ دہلی کے ایک مدرسہ میں پڑھ انہوں نے کر سند فراغت حاصل کی، ساتھ ہی ساتھ وہاں کے ایک شیخ طریقت کے مبارک ہاتھ پر ہاتھ دے کر بیعت کی اور ایک مدت تک ریاضت ومجاہدہ کرتے ہوئے خلعت اجازت سے سرفراز ہوئے تھے۔

تعلیم وتربیت کے بعد مولانا محمد عمر صاحب وطن واپس آئے، اور کیوکتو کے ایک مدرسہ میں تدریسی خدمات میں مشغول ہو گئے، ساتھ ہی ساتھ ارشاد وتلقین کے ذریعے یہاں والوں کو مستفید کرتے رہے تھے، چنانچہ اس علاقے میں ان کے ہزاروں متعلقین کے ساتھ بہتوں خلفاء کا تذکرہ ملتا ہے۔

ظاہر ہے کہ حضرت الاول کی وفات ارکان میں ہوئی، لیکن مرور زمانے کے ساتھ آپ کی قبر کا پتہ تک نہیں رہا تھا، اس حوالے سے ایک بات مشہور ہے کہ:

> ''اس زمانے میں ہندوستان سے ایک مرشد کامل ارکان آئے تھے، جنہوں نے مولانا محمد عمر صاحب سے فرمایا کہ سید الاول نے مجھے خواب میں بتایا کہ فلاں جگہ میں میری قبر کا نشان موجود ہے، اسے جا کر سیدھا کر دیجئے! چنانچہ اس ولی کامل نے مولانا محمد عمر کے ذریعے الاول کی قبر کے لوح حجری کا سراغ لگایا، اور اسے سیدھا کر دیا تھا، یوں مولانا محمد عمر صاحب نے ایک مرشد کامل کے تعاون سے الاول کی قبر کا پتہ لگالیا، اسی روز سے الاول کی قبر زیارت گہِ عام وخاص ہے''۔

مولانا محمد عمر نے ارکان میں وفات پائی، اور خاک کیوکتو میں مدفون ہیں۔

حکیم مولانا حافظ محمد لقمان صاحب

سید الاول کے خاندان کے نامور بزرگ مولانا حافظ حکیم محمد نعمان صاحب ۱۸۳۱ء میں ارکان کے حالیہ دارالحکومت اکیاب میں پیدا ہوئے، ان کے خاندان ایک علم دوست اور رفاہی کاموں کے حوالے سے کافی مشہور خاندان تھا، ان کے والد ایک دین دار اور خدا ترس عابد انسان تھے۔

حکیم نعمان صاحب نے ابتدائی اور متوسطہ کی تعلیم اکیاب میں پا کر اعلی تعلیم کے حصول کے لئے بنگال کا سفر کیا، اور کلکتے کے دینی وعلمی درسگاہوں سے مستفید ہو کے لکھنؤ پہنچے، جہاں انہوں نے طب اور حکمت میں تعلیم حاصل کی، اس کے بعد حکیم صاحب دہلی گئے، جہاں سے انہوں نے انگریزی زبان میں کافی عبور حاصل کے وطن کی راہ لی تھی۔

حکیم صاحب وطن پہنچتے ہی درس وتدریس سے منسلک ہو گئے تھے، انہوں نے اپنے علاقے کے ایک سے زیادہ مدارس وحفظ خانے میں خدمات انجام دیں، چنانچہ ان کے علم وعمل سے یہاں کے ہزاروں مسلم طلباء کو حد درجہ فائدہ پہنچا تھا، علاوہ ازیں آپ ایک مالدار مگر سخی عالم دین تھے، کہتے ہیں کہ انہوں نے سماجی اور رفاہی کاموں میں بھی کافی حصہ لیا تھا۔

حکیم صاحب اپنے تدریسی زمانے میں طبابت کے پیشے سے بھی وابستہ رہے، زندگی کے تقریبا آخری حصے میں وہ درس وتدریس کو قسما چھوڑے پیشۂ طباعت کے لئے یکسو ہو گئے تھے، چنانچہ ان کی خدمات نے یہاں کے لوگوں کو کافی فائدہ پہنچایا تھا، یہاں وہ اپنے زمانے میں ایک حاذق طبیعت کی حیثیت سے مشہور تھے۔

مولانا حافظ حکیم محمد لقمان صاحب نامور ارکانی مورخ اڈووکٹ خلیل الرحمن صاحب کے سسر تھے، وکیل صاحب کے مطابق حکیم صاحب قومی روایات اور خاندانی کہانیوں کے گویا ایک رکھوالا تھے، ان کے یہاں قومی دستاویزات بھی وافر مقدار میں محفوظ تھیں، جن سے خود مورخ صاحب نے بھی کافی استفادہ کیا تھا، آخر کار حکیم صاحب نے اکیاب میں انتقال کیا، اور وہیں کی قبرستان میں مدفون ہیں، اللہ تعالی ان کی جملہ سعی کو قبول کرے اور ان کی بال بال مغفرت فرمائے، آمین۔

حکیم مرتضی صاحب

مولانا حکیم مرتضی صاحب ۱۸۳۱ء کے لگ بھگ ممبرا کے معروف قصبہ قیم کے ایک شریف اور دیندار گھرانے میں پیدا ہوئے،ان کے خاندان کا شمار اس علاقے کے شریف ونجیب خاندانوں میں ہوتا تھا،خود ان کے والد صاحب بھی ایک جہاندیدہ عالم دین اور درویش صفت انسان تھے۔

حکیم صاحب نے ابتدائی تعلیم قیم میں اور متوسطہ کی تعلیم کو کتو اوراکیاب میں پائی،کچھ بڑے ہوئے تو ان کے والد صاحب نے ان کو ہندوستان بھیجنے کا فیصلہ کیا،فیصلہ کے بعد وہ کلکتہ پہنچے،وہاں کی ایک دینی درسگاہ سے دینی تعلیم مکمل کر کے دہلی گئے،جہاں سے انہوں نے طب کی کچھ تعلیم حاصل کرنے کے بعد لکھنؤ گئے،جہاں کی ایک طبی کالج سے طب میں ڈگری حاصل کرنے کے بعد وطن واپس آ گئے تھے۔

وطن واپس آنے کے بعد حکیم صاحب قیم کی ایک دینی درسگاہ سے منسلک ہو گئے،عرصۂ دراز تک انہوں نے اپنے علم وعمل سے یہاں کے مسلمانوں کو مستفید کیا،دین اور علم دین کے حوالے سے یہاں کی نئی نسل نے ان سے کافی فائدہ اٹھایا تھا۔

زندگی کے آخری حصے میں حکیم صاحب طبابت کے ساتھ پوری طور پر یکسو ہو گئے تھے،علاقے بھر میں وہ ایک حاذق طبیعت کی حیثیت سے مشہور تھے،نہ صرف ممبرا بلکہ ارکان کے دور دراز علاقہ جات سے بھی مریض ان کے یہاں آتے،اور فائدہ پا کر واپس چلے جاتے تھے۔

حکیم صاحب ایک عالم دین اور حاذق طبیب ہونے کے ساتھ ایک دور اندیش اور مفکر سیاست دان اور عالی ظرف وحوصلہ مند سماجی آدمی تھے،مالدار ہونے کے ساتھ سخی بھی،کہتے ہیں کہ ان کو علم تاریخ سے خاصی دلچسپی تھی،زندگی کے آخری عشرے میں حکیم صاحب کا میلان روحانیت کی طرف ہو گیا تھا،چنانچہ انہوں نے ارکان کے ایک شیخ طریقت کے مبارک ہاتھ پر بیعت کی،جس کے بعد آپ نے محفلوں میں جا جا کر لوگوں کو اصلاح کرنے کی کوشش کی تھی،آخر کار مولانا حکیم محمد مرتضی صاحب نے قیم میں انتقال کیا،وہیں مدفون ہیں،اللہ تعالی ان کی جمیع خدمات کو قبول فرمائے۔

حضرت مولانا نور محمد صاحب خنڈ لیؒ

خاندان سید الاول اور خاندان مولوی عبد الکریم شجاع قاضی کے چشم وچراغ حضرت مولانا شاہ نور محمد صاحب خنڈ لی کا سلسلۂ نسب باپ کی جانب سے سرزمین ارکان کے عظیم قومی وتاریخی شاعر حضرت شاہ صوفی الاول رحمۃ اللہ سے ملتا ہے،جب کہ ماں کی جانب سے آپ کا سلسلۂ نسب ارکان کے اور ایک نامور شاعر،تاجر اور سیاست دان مولوی عبد الکریم معروف بہ شجاع قاضی مرحوم سے جا ملتا ہے۔

شیخ طریقت مولانا نور محمد صاحب کی پیدائش کیوکتو کے معروف ومردم خیز قصبہ خنڈل میں ہوئی،باپ کی جانب سے سلسلۂ نسب یہ ہے:

حضرت مولانا نور محمد صاحب خنڈ لی بن حضرت علامہ جناب مولانا محمد بدیع الرحمن بن مولانا عبد الباری الخطیب بن مولانا عبد اللہ الامام بن مولانا محمد نا ہیک امام بن حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق بن قطب زمان شاعر ارکان حضرت سید الاول رحمۃ اللہ علیہ۔

ماں کی جانب سے خنڈ لی صاحب کا سلسلۂ نسب یہ ہے:

حضرت مولانا نور محمد صاحب خنڈ لی بن بی بی نور عین (زوجۂ حضرت علامہ مولانا بدیع الرحمن صاحب) بنت عظیم الدین کیونگ بن اعلی حضرت نواب مولوی عبد الکریم معروف بہ شجاع قاضی مرحوم۔

مولانا خنڈ لی صاحب کی تعلیم وتربیت اپنے علاقے کے بعد ارکان کی دیگر دینی درسگاہوں میں ہوئی،تعلیم سے فراغت کے معا بعد (ایک روایت کے مطابق دوران تعلیم) آپ نے حضرت مولانا عبد السلام صاحب ارکانی گودام فاروی (خلیفۂ اجل حضرت مولانا حافظ شاہ حامد حسین علوی اعظم گڑھیؒ) کے ہاتھ پر ہاتھ دے کر بیعت کی اور طویل مجاہدہ وریاضت کے بعد آپ کو خرقۂ خلافت واجازت سے نوازا گیا تھا۔

مولانا نور محمد خنڈ لی صاحب خاندانی طور پر صاحب ثروت بزرگ تھے،اللہ تعالی نے آپ کو باطنی نعمت کے ساتھ ظاہری دولت سے بھی نوازا،آپ بڑے سخی وشریف اور خادم ملت وقوم انسان ہونے کے

ساتھ اپنے وقت کے ایک جلیل القدر عالم دین اور شیخ طریقت تھے۔

یوں تو حضرت مولانا شاہ عبد السلام صاحب ارکانی کے بہتوں خلفاء تھے، جنہوں نے بھی اپنے مرشد کامل کی طرح دین کی بڑی بڑی خدمات انجام دی تھیں، جن میں سے چند نامور خلفاء یہ ہیں:

(۱) حضرت مولانا شفیق احمد صاحب چنوتوی۔
(۲) حضرت مولانا الٰہی بخش صاحب بانسکھالوی۔
(۳) حضرت مولانا محمد طاہر صاحب قطب دیاوی۔
(۴) حضرت مولانا بدیع الرحمن صاحب ارکانی/نہلوی۔
(۵) حضرت مولانا سیف الدین صاحب صدیقی چنوتوی۔
(۶) حضرت مولانا محمد خضر صاحب پکوی، چکریا۔
(۷) حضرت مولانا حبیب احمد صاحب چنوتوی۔
(۸) حضرت مولانا نور محمد صاحب خنڈ لی ارکانی۔
(۹) حضرت مولانا رشید احمد صاحب، ساک فورا، بوال خالوی۔
(۱۰) حضرت مولانا مفضل الرحمن صاحب چاندگاؤں، چاٹگامی۔
(۱۱) حضرت مولانا عبدالقدوس صاحب چنوتوی۔
(۱۲) حضرت مولانا عبدالغنی صاحب نائکان چری۔
(۱۳) صوفی صدیق احمد صاحب، سانکانوی۔
(۱۴) حضرت مولانا محمد سلیمان صاحب، تیز گاؤں، ڈھاکہ۔

لیکن جہاں تک میرے علم کا تعلق ہے کہ حضرت مولانا عبد السلام صاحب ارکانی کے ان متذکرہ اور غیر متذکرہ تمام خلفائے کرام میں دو خلفاء زیادہ نامور تھے، جن میں ایک مولانا حبیب احمد صاحب چنوتویؒ جب کہ دوسرا حضرت مولانا نور محمد صاحب خنڈ لی رحمۃ اللہ علیہ۔

مولانا ارکانی صاحب کے پوتے صدیق مکرم حافظ جعفر الاسلام صاحب (مرحوم) کا بیان ہے کہ حضرت مولانا ارکانی صاحبؒ مولانا نور محمد صاحب کے گھر خنڈل میں چند مرتبہ تشریف لے گئے تھے، جہاں بہت سارے لوگ حضرت کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے، مولانا ارکانی کے

زمانے سے مولانا نور محمد صاحب کی فتوحات شروع ہو چکی تھیں، بعد میں ان میں بڑی وسعت ہوئی، ارکان اور برما خصوصًا رنگون کے علاقوں میں آپ کی بڑی شہرت رہی تھی، جہاں آپ کے ہزروں متعلقین ومنتسبین کے علاوہ درجنوں خلفائے کرام تھے اور ہیں۔

شمالی منگڈو میں حضرت مولانا خنڈ لی صاحبؒ کے نامور خلفاء میں حضرت شیخ جمال حسین نائن چنگی رحمۃ اللہ علیہ تھے، جو گذشتہ صدی کی نویں دہائی میں انتقال کر کے اپنی آبائی بستی کی خاندانی قبرستان میں مدفون ہیں۔(۱)

مولانا خنڈ لی صاحب شمالی ارکان کے علاقہ جات میں گاہِ گاہِ تشریف لاتے تھے، چنانچہ بستی نائن چنگ، قاضی آباد اور بلی بازار وغیرہ علاقہ جات میں آپ کے انگنت متعلقین تھے، اور اب بھی ہیں، جن میں میری نظر میں حضرت مولانا محمد انور ندوی مرحوم ناقابل فراموش ہیں۔

حضرت مولانا خنڈ لی صاحب حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ کے شرف سے مشرف ہوئے تھے۔ اور آخری حج کے دوران آپ کا انتقال مدینۃ الرسولؐ میں ہو کر بقیع میں مدفون ہوئے۔

---

(۱) حضرت شیخ جمال حسین صاحب نائن چنگی کی ولادت تقریبًا ۱۹۱۵ء میں شمالی منگڈو کی معروف بستی نائچونگ میں ہوئی، قاضی آباد والے اردو اسکول سے ساتویں جماعت تک اردو کی تعلیم پائی، آپ مولانا ارکانی رحمۃ اللہ کے مرید خاص تھے، لیکن آپ کو خلافت مولانا نور محمد خنڈ لی کیوکتوی سے ملی تھی، بڑے لائق وفائق اور عاشق رسولؐ انسان تھے، جہاں تک میں نے دیکھا اور میرا ذاتی مطالعہ ہے کہ عاشق صادق ایسے لوگوں کو کہا جاتا ہے، شرافت ونجابت کے پیکر بڑے عابد وزاہد انسان تھے، راقم سطور کو حضرت سے بڑا لگاؤ تھا، ان سے علمی، فکری، روحانی استفادہ بھی کیا تھا، شاعروں میں اقبال اور غالب کے شیدائی تھے، جہاں تک دیکھا کہ آپ ایک بڑے پائے کے صاحب دل انسان تھے، صاحب کشف تو تھے ہی ان سے خرق عادات وکرامات بھی ظاہر ہوئیں، حضرت کے ساتھ بچپن اور تعلیمی زندگی کے دوران مختلف سفر کئے گئے، سفر وحضر میں حضرت یاد الٰہی میں محو ومگن رہتے تھے، ہر حال میں آپ کی زبان ذکر الٰہی سے لبریز رہتی تھی، بڑے نرم دل، نرم مزاج بزرگ تھے، لوگوں کے ساتھ حسن برتاؤ ان کی زندگی کا گویا شیوہ تھا، اخلاق کے پیکر تھے۔ حضرت نے ۱۹۹۰ء میں انتقال فرمایا اور اپنے گاؤں نائچونگ میں مدفون ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا بدیع الرحمن صاحب کو بہت ساری اولاد سے نوازا، بالترتیب ان کے اسمائے گرامیاں یہ ہیں:

۱۔محمد احمد۔

۲۔مولانا عبدالرحمن۔

۳۔مولانا محمد مصطفی۔

۴۔محمود احمد۔

۵۔رابعہ۔

۶۔مریضہ۔

۷۔خدیجہ۔

۸۔بدرالدجی۔

۹۔مریم۔

۱۰۔مولانا نور محمد۔

۱۱۔رابعہ۔

۱۲۔اسحاق۔

۱۳۔خیرالنساء۔

۱۴۔مولانا شمس الضحی۔

حضرت مولانا نور محمد خنڈ لی بھی صاحب اولاد بزرگ تھے، آپ کی اولاد بالترتیب یہ ہیں:

۔فاطمہ۔رشید احمد۔شیخ احمد۔صفیہ۔ظفر احمد۔نور حسین۔نور عین۔زینب۔شبیر احمد۔حسین احمد۔آمنہ خاتون۔

مصادر

ار بی سمارٹ، برما گزیٹر اکیاب دسٹرکٹ۔

اردو دائرۃ المعارف الاسلامیہ جلد چہارم۔

امرتو لال بالا، الاول کے کلام میں ہندو مسلم ثقافت۔

بحر العلوم علام عبدالعلی انصاری لکھنوی، رسالۂ وحدۃ الوجود۔

بنگلا اکیڈیمی پتریکا، بیساکھ، آساڑھ، ۱۳٦۷ بنگلا۔

بنگلا ایشیاٹیک پتریکا حصہ چہارم، دیسمبر ۱۹۸٦ء

پروفیسر محمد حبیب اللہ، روہنگیا ذا تیرایتی ہاش۔

پیٹر ہارڈے، سورس آف انڈین ٹریڈیشن۔

جرجی زیدان، تاریخ اللغۃ العربیۃ۔

حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی، عبقات (حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ)

دکتور محمد علی النمر، سورۃ الاسراء والاھداف التی ترمی الیھا۔

ڈاکٹر احمد شریف، بنگالی اور بنگلا ساھتیہ۔

ڈاکٹر احمد شریف، مقدمۂ تحفۃ النصائح۔

ڈاکٹر انعام الحق، مسلم بنگلا ساھتیہ۔

ڈاکٹر انعام الحق اور ساھتیہ بیشارد، ارکان کے راج دربار میں بنگلا ساھتیہ۔

ڈاکٹر اوجیت کمار بندوفردائی، پاٹ ٹیکا۔

ڈاکٹر شوکمارشن، آپراد، پہلا شمارہ۔

ڈاکٹر شہید اللہ، مقدمۂ پداپتی۔

ڈاکٹر عبدالکریم، عبدالکریم ساھتیہ بیشارد، حیات وکارنامے۔

ڈاکٹر نجم الدین احمد، اسلامک ہری ٹیج ان بنگلادیش۔

ڈی جی اے ہال، ہسٹری آف ساؤتھ ایسٹ ایشیا۔

روبرٹسن، فرسٹ برمیز وار۔

سرجادوناتھ سرکار، ہسٹری آف اورنگ زیب۔

سیدالاول مرحوم، سیف الملوک بدیع الجمال۔

سیدالاول مرحوم۔سکندر نامہ۔

سیدالاول مرحوم، پدا پتی۔

سیدالاول مرحوم، راگ تال سنگیت۔

سیدالاول مرحوم تحفۃ النصائح۔

سیدعبدالحی رحمہ اللہ تعالی، نزہۃ الخواطر۔

سیدعلی احسن، الاول اور جوشی۔

سیدکاظم، عالمگیر نامہ۔

عبدالحق چودھری، قدیم ارکان میں روہنگیا، بدھوا ور ہندو باشندے۔

فوتی کا تعارف، ڈھاکہ یونیورسیٹی۔

کمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد چہارم۔

ماہ نامہ محمدی، نویں شمارہ۔

محمدالیاس انصاری، ارکانی مسلمانوں کی جدو جہد آزادی۔

محمدرضاء، الامام علی ابن ابی طالب رابع الخلفاء الراشدین۔

محمدصدیق خان، شجاع کی زندگی کی شام، ساھتیہ پتریکا۔

مفکر اسلام سیدابوالحسن علی ندوی، تزکیۃ واحسان یا تصوف وسلوک۔

مین ریک، لورڈ اینڈ ہسٹرین۔

نصراللہ خان، شریعت نامہ۔

نورالاسلام مانیک، عظیم شاعر الاول۔

وکیل خلیل الرحمن مرحوم، تاریخ اسلام برماوارکان۔